بارش کا آخری قطرہ

بارش کا آخری قطرہ

(افسانے)

رضیہ فصیح احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

ضابطہ

بار دوم ـــــ ۱۹۸۹ء
تعداد ـــــ ایک ہزار
پبلشر ـــــ نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
پرنٹر ـــــ منظور پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت ـــــ ۹۰/۰۰ روپے

فہرست

ایمسٹرڈیم کے ڈیم اسکوائر میں ربیعہ کے انتظار میں ٹہلتے ہوئے میں ماضی میں بہت دور نکل گیا۔
ہم دونوں پاک امریکن کلچر سینٹر میں انگریزی کا گریجوایٹ کورس کر رہے تھے۔ میں تقریباً ہر سال
یہ کورس کیا کرتا تھا اس لئے کہ میری انگریزی ذرا درست رہے اور اس لئے بھی کہ میں ریلوے کے
اس بوسیدہ دفتر میں پڑے پڑے یہاں کی مسلوں کی طرح گل سڑ کر ختم نہ ہو جاؤں —— اور اس لئے
بھی کہ ہماری انگریزی کی اُستاد بے حد شریف خاتون تھیں اور انہوں نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کہ میاں
تم جو ہر سال منہ اُٹھا کے میری کلاس میں چلے آتے ہو تو تم ٹرم کے فیس کے پیسے بھی بھرتے ہو یا نہیں۔
ریلوے میں بے جگری سے کام کرنے کی کوئی ایسی روایت نہیں ہے اور دوپہر کے کھانے کے
بعد ٹھیک تین بجے کون کم بخت کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے وقت جب میرے ساتھی کرسیوں پر
ٹیڑھے بانکے لیٹ کر قیلولہ کرتے، میں پاک امریکن کلچرل سینٹر میں پنکھے کے نیچے دس پندرہ لڑکے لڑکیوں
کے ساتھ بیٹھ کر اپنی انگریزی کو ہوا دیا کرتا تھا اور مجھے یہ احساس رہتا تھا کہ میں ناک کی پھنگوں
پر چشمے ٹکائے بابوؤں کے قبیلے سے نہیں ہوں، طالب علم برادری سے ہوں اور مجھے جلد یا بدیر
وہاں کا اونگھتا ہوا ماحول چھوڑ کر زندہ انسانوں میں لوٹ کر آنا ہے۔ یہاں میں نے پہلی مرتبہ ربیعہ
کو دیکھا جو انگریزی کے اس کورس کو نہایت سنجیدگی سے لے رہی تھی۔ جسے لوگ محض تفریحاً
کرتے تھے۔ وہ نہ صرف کلاس کا کام باقاعدگی سے کرتی۔ بلکہ گھر میں خود سے کام کر کے ٹیچر کو
دکھاتی اور نہایت باقاعدگی سے برٹش کونسل لائبریری جاتی اور وہاں سے ایسی کتابیں لاتی
جو زبان کے سیکھنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔

ربیعہ مجھے شروع سے ہی اچھی لگی تھی۔ اس میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ اور بانکپن تھا۔

باتیں بھی بڑی دلچسپ اور مچھے دار کرتی تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ مگر خوش شکل تھی اور ایک خاص طرح کی نفاست اُس میں تھی۔ جو مجھے اپنے خاندان کی لڑکیوں میں کبھی نظر نہ آتی تھی۔ اس کے بزرگوں پر تھوڑی سی ریسرچ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کون کون سے دن برٹش کونسل لائبریری جاتی ہے اور میں نے اپنے پروگرام کا ڈول یوں ڈالا کہ جب بھی ربیعہ وہاں جائے اتفاقاً ہماری ملاقات ہو جایا کرے۔ اس زمانے میں لڑکے لڑکیوں کا ملنا عام نہیں تھا۔ مگر سر راہے۔ اتفاقاً مل جانے پر گفتگو کر لینے میں کوئی ایسی برائی بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہم اکثر اپنی اپنی کتابیں تھامے کھڑے باتیں کیا کرتے تھے۔ پھر یوں بھی ہوا کہ جہاں بیٹھ کر وہ کتابوں کی ورق گردانی کر رہی ہے۔ مجھے بھی وہیں جگہ مل گئی۔ ایک ایسے ہی موقع پر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ انگریزی ادب کے مقابلے میں انگریزی زبان و قواعد کو کیوں اتنی اہمیت دے رہی ہے اور اس نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ اسے لندن میں ایک اسکالرشپ ملنے کی امید ہے اور وہ چاہتی ہے کہ وہاں جا کر اسے زبان کے سلسلے میں زیادہ دقت نہ ہو۔ ربیعہ کی اس بات نے مجھے اپنے مستقبل کی ایک نئی راہ سجھائی۔ ان دنوں ہمارے ملک پر برطانیہ کی خاص نظر عنایت تھی اور مختلف مضامین میں ڈھیروں وظیفے ملا کرتے تھے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی اسکالرشپ پر لندن چلا جاؤں۔ اب تو ربیعہ سے رابطہ رکھنا اور بھی ضروری ہوگیا۔ چنانچہ اگلی ملاقات پر میں نے کچھ اور تفصیلات جاننے کی کوشش کی اور پتہ چلا کہ ربیعہ کے چچا حکومت میں ایسے عہدے پر فائز ہیں کہ اپنے رشتے داروں کو آسانی سے وظیفوں پر باہر بھجوا سکتے ہیں۔ اب میرے تو سرے سے کوئی سگے چچا ہی نہیں تھے۔ رشتے کے جو تھے ان میں سے کوئی ایسے عہدے پر فائز نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو لمبی قطار میں میرا نمبر کہیں بہت پیچھے ہوتا۔ رشتے داری کا چکر چھوڑ کر میں نے محض اپنی قابلیت کی بنا پر باہر جانے کی کوشش شروع کر دی۔ محض قابلیت تو کام نہ آئی۔ مگر ڈھیر سی ڈگریوں اور سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک دوست کے چچا کی سفارش کام آگئی۔ ربیعہ اور میں آگے پیچھے ہی لندن کے لئے روانہ ہوئے۔

شروع شروع میں مجھے انگلستان کی زندگی یوں لگی جیسے کسی قید خانے سے نکلا ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ گھر سے نکلو تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ کوئی چھوٹا بہن بھائی ہر وقت ساتھ لگنے کو تیار نہ رہتا تھا کوئی بزرگ ہر ملاقات پر یہ نہ پوچھتے تھے کہ میاں صاحبزادے تمہارے امتحان کا نتیجہ کیا رہا۔ خواہ امتحان کو ایک سال باقی ہو خواہ ایک مہینہ کوئی کسی کے معاملات میں دخل نہ دیتا تھا۔ ایسے میں ربیعہ سے ملاقات کرنا اور ملتے رہنا بھی مشکل نہ تھا۔ تقریباً ہر ویک اینڈ پر ہم کسی نہ کسی چوک پر ملاقات کی جگہ اور وقت مقرر کرتے، کبھی ٹرافلگر سکوائر، کبھی پکاڈلی سرکس، کبھی کوئی اور جگہ، پھر وہاں سے اکٹھے سیر کرتے، چائے پیتے، کھانا کھاتے رات کو ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے۔ لندن میں ربیعہ کو بھی آزادی کی فضا میں سانس لینے کا عجیب سکھ بھرا احساس تھا۔ حالانکہ وہ ایک کھاتے پیتے اور ماڈرن خاندان کی لڑکی تھی۔ لیکن ان کے ہاں زیادہ تعلیم اور تعلیم کے لئے دوسرے ملکوں میں مارے مارے پھرنے کا تصور خاصا بھیانک تھا۔ خاندان کی زیادہ تر لڑکیاں نہایت کم عمری میں گھر بار بسا کر بیٹھ جاتی تھیں اور غیر ملکوں میں جانے کے بجائے وہاں کی ڈشز پکا کر کھانے اور کھلانے پر اکتفا کرتی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو خاندان کے ہر فرد سے اتنا متعارف کروا دیا تھا کہ بغیر دیکھے بھی یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں ربیعہ کے اور ربیعہ میرے گھر والوں سے مل چکی ہے۔ ربیعہ اس ساری بات سے خوب واقف تھی کہ میرا گھرانہ اتنا متمول نہیں ہے۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہت سے بہن بھائی ہیں جن کا بوجھ بڑے بھائی سنبھال رہے ہیں، جو خود بھی بیوی بچوں والے ہیں میں ریلوے کی نوکری سے ان کا بوجھ بٹا رہا تھا مگر اب وہ ہی سب کی کفالت کر رہے ہیں یا چھوٹی بہنوں نے چھوٹی موٹی نوکریاں کر لی ہیں اور وہ سب میرے اچھے مستقبل سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔

ہم دونوں کے گھر والے لمبے چوڑے خطوط لکھتے اور کیسٹوں میں نہایت جذباتی قسم کے پیغامات بھر کر بھیجتے جن کو ہم اکٹھے بیٹھ کر یوں سنتے جیسے ریڈیو پر کوئی مزاحیہ پروگرام سن رہے

ہوں اور پھر وہ سارے خطوط اور کیسٹ میزوں کی درازوں میں ڈال کر بھول جاتے۔ عدم الفرصتی، موسم، پیسے کی کمی وغیرہ کئی بہانے خط نہ لکھنے کے ہمارے پاس تھے۔ گو ان میں سے کوئی بھی معقول نہیں تھا۔ یوں انگلستان کی آزاد سرزمین میں ہفتے اور اتوار کا دن اکٹھے گزارتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ نزدیک آتے جا رہے تھے اور اپنے دوستوں کے حلقے میں ہماری دوستی مستند ہوتی جا رہی تھی۔

جس دن میں نے ربیعہ سے شادی کی درخواست کی۔ اس دن ہم نے ٹرافلگر سکوائر پہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی اور میں سنگِ موسیٰ سے بنے ہوئے کالے شیروں، ایڈمرل کی ٹیڑھی ٹوپی اور غٹرغوں کرتے کبوتروں کو دیکھتے دیکھتے اکتا چکا تھا۔ اس دن روز سے کچھ زیادہ گرمی تھی۔ بچے فواروں کے نیچے اچھل کود رہے تھے اور جوان لڑکیاں لڑکے انگوری پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح ٹورسٹوں کا ہجوم تھا۔ مگر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا اور ربیعہ کے انتظار کی لذت اب کرب کی شدت میں بدلتی جا رہی تھی۔ ایسے میں جب وہ نظر آئی تو میرے دل کی ایک دھڑکن میں کمی یا بیشی ضرور ہوئی۔ آج وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگی۔ لندن آن کر اس کا رنگ نکھر گیا تھا اور جسم کے خطوط زیادہ دلآویز ہو گئے تھے۔ آج وہ ایسی ساڑھی پہنے ہوئے تھی جیسے کسی نے کپڑے پر رنگ کے چھینٹے مار دیئے ہوں۔ وہ سراپا بہار سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ہم ایڈمرلٹی آرچ سے گزرتے ہوئے سینٹ جانس پارک میں چلے گئے۔ فلورنس نائٹ انگیل کے مجسمے اور انجانے سپاہی کی قبر کے پاس سے تازہ کٹی ہوئی بجری کی سرخ سڑک پہ چلتے ہوئے، ہم جھیل کے کنارے بیٹھ گئے وہاں خنکی تھی۔ جھیل میں کنول کی شکل کے فوارے سے پانی اچھل اچھل کر دوبارہ جھیل میں گر رہا تھا۔ سیاہ بطخیں پانی میں بے آواز تیرتی پھر رہی تھیں۔ جیسے درخت سے گر کر پتے پانی میں چپ چاپ بہتے چلے جاتے ہیں۔ جھیل کے درمیان ولوز کے گھنے جھنڈ تھے۔ جن کے سہرے کی لڑیوں کی طرح گرتی شاخیں زمین کو چھو رہی تھی اور ان میں

پچھی ہزاروں لاکھوں چڑیوں کی چہکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسے میں کینوس کی کرسیوں میں دراز ہم ماحول کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک بغیر کسی تیاری کے میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا

"اب ہمیں شادی کر لینی چاہیئے کہ یقیناً اب ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے"

اس نے میری طرف ادا سے دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائی اور کہا

"یہ تم میری طرف سے اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟"

"اس لئے کہ میں جانتا ہوں....."

"اگر میں کہوں کہ تم نہیں جانتے....."

"تو میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں....."

"ہٹ دھرمی کی بات اور ہے.... اس کے علاوہ جس طرح تم نے پروپوز کیا ہے۔ یہ مشرقی آداب ہیں نہ مغربی۔ طریقہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مرد شادی کی پیش کش کرتا ہے اور لڑکی یا اس کے والدین سے لڑکی کے ہاتھ کا طالب ہوتا ہے۔"

"اچھا تو لو۔ میں فوراً کرسی سے اٹھا اور جھیل کے بھیگے کنارے پر ربیعہ کے سامنے دو زانو ہو گیا۔ اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر ڈرامائی انداز میں کہا۔"

کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی؟

ربیعہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ ایک دم گلنار ہو گئی۔ کیونکہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ یکایک ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک اخبار پڑھتا بوڑھا ہنسا اور اس نے اخبار پر سے نظر ہٹا کر اپنی جھریوں بھرے چہرے مسکراتی آنکھوں اور ہلتی گردن کے ساتھ ہمیں مبارک باد دی۔ ربیعہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ جیسے یہ سب مذاق ہو اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بال مال کی طرف لے چلا اور بکنگھم پیلس پہنچنے سے پہلے پہلے ربیعہ شادی کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ میں نے جب اسے باہوں میں لے کر پیار کرنا چاہا

تو وہ بری طرح بدکی۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔

"ڈرو نہیں، یہ کراچی کا پاکستان چوک نہیں ہے۔ یہاں کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔"

"نہیں۔ نہیں کوئی دیکھے نہ دیکھے ہم اپنی روایتوں کو نہیں بھول سکتے۔ ہم نہیں بدل سکتے۔"

"کیوں نہیں۔ ہم چاہیں تو بدل سکتے ہیں اور بدلے بھی ہیں۔ کیا کراچی میں ہم اس طرح ہاتھ میں ہم ڈال کر پھر سکتے تھے؟"

"ہاں کسی حد تک۔ مگر انسان اندر سے نہیں بدل سکتا۔"

"ارے بھئی انسان تو ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے، کم از کم فلسفی تو یہی کہتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ مجھ سے بدلنے کی توقع نہ کرنا۔ میں ایسی ہی رہوں گی — جیسی ہوں۔ بولو منظور؟"

"منظور۔ مگر میں ہر لحظہ بدلتا رہوں گا۔ مجھے یوں ہی دیکھنے کی تمنا نہ کرنا۔"

"اسی کا مطلب ہے تمہاری وفائیں بھی بدلتی رہیں گی۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ تم تو ویسی ہی رہو گی۔ کیونکہ تمہارا نظریہ ہے کہ انسان بدل ہی نہیں سکتا۔"

"جی نہیں اس خیال میں نہ رہنا ......" وہ کچھ اور کہتی مگر میں نے اسے زیادہ نہ بولنے نہ دیا۔ پہلے پہلے پیار کے لمحے بحث وتمحیص میں گنوانا سراسر زیادتی تھی۔

شادی کے باوجود ہماری رہائش الگ الگ رہی۔ یہ بڑی عجیب اور دلچسپ صورتحال تھی کہ ہم میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہ رہ سکتے تھے۔ میں اس صورت حال سے بے حد غیر مطمئن تھا۔ مگر ربیعہ مطمئن تھی۔ کبھی کبھار یہاں وہاں کا ملاپ اس کی رومانی طبیعت کے عین مطابق تھا۔ جب بھی میں زور دیتا کہ ہم ایک الگ گھر لے کر اکٹھے رہیں تو اسے سنجیدگی سے نہ سنتی "اس میں کتنا بکھیڑا ہوگا اور کتنا خرچ سوچو تو" مگر میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں قریب چاہتا تھا۔ جب کسی رو سے بھی ہم میں فاصلہ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ بلا وجہ کا یہ فاصلہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جب کچھ فیصلہ نہ ہو سکا تو ہم نے طے کیا کہ کم از کم

گرمیوں کی چھٹیاں تو لندن سے باہر اکٹھی گزاری جائیں اور اس ہیر کے لئے ہم نے ہر طرح پلیں انداز کرنا شروع کر دیا۔

عجیب اتفاق تھا کہ ہم چھٹیوں کے لئے روانہ ہو رہے تھے مجھے ایک دن لندن میں رکنا پڑ گیا اور دوسرے دن ہماری ملاقات پیرس کے ایک چوک پر ہوئی۔ لندن ایئرپورٹ پر ربیعہ کو رخصت کرتے ہوئے میں نے کہا۔

" جاؤ، ایک دن کے لئے تم آزاد ہو، پھر تم میری قید میں ہو گی۔"

" تم قید اور گرفتاری کی بات نہ کرو۔ میں کسی کی قید میں رہ ہی نہیں سکتی۔" ربیعہ نے جواب دیا تھا۔

" مانو یا نہ مانو تم ایک جن کی قید میں ہو۔"

" جن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا... میرے پاس اسم اعظم ہے۔ میں جب چاہوں جن کے چنگل سے نکل سکتی ہوں۔"

" اچھا دیکھیں گے تم اس جن کے چنگل سے کیسے نکلتی ہو۔"

" یوں چٹکی بجاتے" اُس نے چٹکی بجائی اور میرے ہاتھوں کے حلقے سے نکل گئی۔

" وہ جن دوبارہ تمہیں گرفتار کرے گا" میں نے اسے پھر اپنے حلقے میں لے لیا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

اور پیرس میں وہ دن جیسے خواب میں گزرے۔ میں نے لندن میں ربیعہ کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پیرس شہر بسایا ہی اس لئے گیا ہے کہ نئے شادی شدہ جوڑے ایک دوسرے میں گم ہو سکیں، ایک دوسرے کو پا سکیں۔ ان دنوں پیرس میں جیسے ہم ہی ہم تھے اور کچھ نہ تھا۔ ہم کچھ بھی دیکھتے ایک دوسرے کی رفاقت کے حوالے سے جیسے ہم دونوں شفاف شیشے کے ہوں اور دوسرے کے آر پار پیرس کو دیکھ رہے ہوں۔ سین کے پانی پر بڑے سے بجرے میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہم اس پر بنے ہوئے وضع وضع کے پلوں اور

کناروں کی گزرتی عمارتوں کو حیرت اور مسرت سے دیکھتے رہتے اور ہمارے اندر دمکتی خوشی
کی لو تیز ہوتی رہتی۔ ایفل ٹاور پہ چڑھتے ہوئے جب یوں محسوس ہوتا کہ کسی نے کھڑے
کھڑے ہمارے سر پر رسّی باندھ کر اوپر کھینچ لیا ہے تو ربیعہ مارے خوف کے مجھ سے
چمٹ جاتی۔ مگر اس مسرت بھرے خوف سے اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت
ہو جاتا۔ پیرس میں شانزے لیزے کا شور و شر بھی بھلا لگتا تھا۔ روشنیوں کی قطاریں اور
لپاک جھپاک بھاگتے لوگ اور زون زون کرتی کاریں اور شانزے لیزے سے ذرا ہٹ
کر سیزے اور ولوز میں چھپی ہوئی بنچیں جہاں ربیعہ تھوڑی دیر میری گود میں سر رکھ سستا لیتی
اور آنکھیں بند کر کے ہم نزدیکی ریستورانوں سے آنے والی موسیقی کا لطف اٹھاتے اور میرے
دل سے دعا نکلتی اے کاش ہماری زندگی پیرس کی طرح حسین، رواں دواں اور آسان
ہو جائے۔

پیرا تھون کی چھبیس سال میں بنی ہوئی قوی الجثہ عمارت اور اس کے لمبے لمبے منقش
ستونوں کو دیکھتے ہوئے بھی اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی خوشی
سے دمک رہا تھا اور جب ہم اس عمارت کے بے حد مضبوط تہہ خانے میں روسو، والٹیر
ایملی زولا اور کئی قبروں کو دیکھتے پھر رہے تھے تو ربیعہ کے چہرے پر ایسا مقدس سکون تھا
جیسے وہ مصر کے معبدوں میں گھومتی کوئی پجارن ہو۔

ان دنوں وہ اتنی خوش تھی کہ اسے میری کسی بات سے اختلاف کرنے کا خیال بھی نہ
آتا تھا اور نہ وہ کبھی تھکن کا اظہار کرتی تھی۔ یہ ضرور ہوتا کہ جب ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے
تو وہ جوتے پہنے پہنے بستر پر دراز ہو جاتی اور سو جاتی۔ میں آہستہ سے جوتے اتارتا اور
اس کے پرسکون چہرے کو دیکھتا رہتا جو کسی معصوم اور مطمئن بچے کے چہرے سے کسی طرح کم
نہیں تھا۔ ایک دن نوتر ڈیم کے گرجا گھر میں سینکڑوں موم بتیوں کے سائے میں کھڑے
ہو کر اس نے مجھ سے تصویر اتارنے کے لئے کہا تھا۔ روشنیوں اور سایوں کے امتزاج میں

اس کا پروفائل کسی عظیم آرٹسٹ کی بنائی ہوئی پینٹنگ کا تاثر لئے ہوتے تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے سے چند دن پہلے ہی، ہم لندن واپس لوٹ آئے کیونکہ میں ساتھ رہنے کے لئے کسی نہ کسی گھر یا کمرے کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔ آخر ساری تگ ودو اکیلے کرنے کے بعد میں نے اس فصل کو وصل سے بدل لیا۔ میں نے ایک کمرے باورچی خانے اور غسل خانے پر مشتمل ایک گھر کا انتظام کر ہی لیا جس میں ربیعہ کے کہنے کے مطابق بہت جھمیلے اور بکھیڑے پڑے مگر میں اس سے کہا کہ بھئی شادی شدہ زندگی میں یہ بکھیڑے کبھی نہ کبھی تو آئیں گے ہی، تو کیوں نہ ہم ابھی سے انہیں قبول کر لیں۔ بظاہر ربیعہ نے بھی انہیں خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ گرمیوں کا سہانا موسم لندن میں بھی بڑے مزے میں گزرا۔ چھم چھم کرتی بارش ہمیشہ سے زیادہ حسین لگتی۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے چھپ چھپ کرتے بھاگتے۔ جس طرح بچپن میں بارش میں بھیگنے میں مزا آتا تھا۔ اب بھی وہی لطف ملتا۔ ہم برساتیوں کے ہڈ پیچھے ڈال کر چہرے پر گرتی پھوار کا لطف لیتے "سرپن ٹائن" کے کنارے ٹہلتے اور جھیل میں گرتی بوندوں کا تماشا دیکھتے رہتے۔ گھنٹوں وہاں کے شیشے کے بنے ہوئے ریستوران میں بیٹھے کراچی کی چپچپاتی گرمیوں کی باتیں کرتے۔ یا اللہ کتنا گندا موسم ہے کراچی کا لندن تو اس کے مقابلے میں بہشت ہے۔ جون جولائی میں ساری دنیا جیسے لندن میں ڈھل آتی تھی۔ جدھر جاؤ میلہ سا لگا ہوا تھا۔ پھر ایک دن میں سینکڑوں کھیل تماشے۔ پچاس ڈرامے بیلے اور آرٹ کی نمائشیں اور کیا کیا کچھ۔ خاصا پیسہ ہم نے ان پر لٹایا۔ چند دن کے عیش کے بعد ہم پھر اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے۔ مگر اب وہ پہلے کی سی بات نہیں رہی تھی۔ گھر کے کام ہی دم نہ لینے دیتے تھے۔ پھر اپنی اپنی پڑھائی۔

جوں جوں سردیاں بڑھتی گئیں۔ یوں لگتا جیسے ہم موم کی طرح جمتے جا رہے ہوں۔ کام کرنا دو بھر ہو جاتا۔ ہمارا گھر گرم نہ تھا۔ اسے گرم کرنے کے لئے گھنٹہ بھر بعد پیسے ڈالنے پڑتے۔ ہم اس قسط وار گرمی پہنچانے والے ہیٹر کے آگے بیٹھے کراچی کے دسمبر جنوری کے نرم گرم موسم کو

یاد کرتے اور آہیں بھرتے۔ کراچی میں بعض اوقات پوری سردی کا موسم بغیر سویٹر پہنے گزر جاتا تھا اور یہاں روئی کا دگلا بننا پڑتا تھا۔ سردی میں باہر جانا، واپس آکر گیلے موزوں اور جوتوں کو سکھانا۔ برساتیوں اور چھتریوں کا سنبھالنا ہی دو بھر ہو جاتا۔ اندر بیٹھے برف کے جھکڑوں کو دیکھتے تو دل اڑنے لگتا۔ باہر نکلتے تو دھند میں سے جھانکتی زرد روشنیاں بیمار اور لاغر مریضوں کی طرح نظر آتیں۔ وہ گرمیوں کی شامیں جب رات کے نو بجے تک اُجالا پھیلا رہتا تھا جیسے خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ دوپہر دو بجے سورج ڈوبنے کی کرتا اور ٹھنڈ سے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے۔ سردی ہڈی کے گودے تک پہنچتی معلوم ہوتی۔ انگلستان میں روتی تھی نہیں، دوئی بھی کب تک کام آتی۔ سردی کے ختم ہوتے ہوتے تک ہم دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے۔ لشتم پشتم چند مہینے کھینچے اور پھر اپنے وطن بھاگے۔

یوں تو میرے والدین بھی کراچی میں تھے اور ربیعہ کے بھی مگر سوال یہ تھا کہ رہا کہاں جائے۔ میرا گھر ربیعہ کو ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار تھا۔ مگر وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ آٹھ بہن بھائی شادی شدہ بھائی اب کنبے والے تھے اور سب اسی گھر میں رہتے تھے۔ ربیعہ دو ہی دن میں اوبھ گئی اور اپنے گھر جانے کی باتیں کرنے لگی۔ میں اس گھر میں جا کر کیسے رہ سکتا تھا۔ جہاں ہماری شادی کو نہایت بے جوڑ قرار دیا گیا تھا۔ ربیعہ جو بہت خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ ایک کھاتے پیتے گھر کی فرد تھی جسے ایک سے ایک شاندار رشتہ مل سکتا تھا۔ متوسط طبقے کے ایک نہایت معمولی لڑکے کے ساتھ پھنس گئی تھی۔ جو کچھ کھاتا کماتا نہ تھا اور جس کا گھر چیونٹیوں بھرا کباب تھا۔ میرے سسرال والے اتنے اسٹیٹس کانشیس تھے کہ ان کے گھر کے پالتو جانور تک مجھے حقیر سمجھتے تھے۔ کتا کسی ڈوم ڈھاری دھوبی اور فقیر کو برداشت کر لیتا مگر مجھے دیکھتے ہی کاٹنے کو دوڑتا۔ سفید جھاگ سی ایرانی بلی مجھے اپنے صوفے پر بیٹھے دیکھ کر خاموش ناگواری سے اُٹھ کر وقار سے چلتی ہوئی دوسرے صوفے پر دراز ہو جاتی۔ سالے ایک گز دُور سے ہاتھ ملاتے اور جلدی جلدی ضروری کاموں پر نکل جاتے۔ سالیاں جو دوسرے

بہنوئیوں سے اٹھلا اٹھلا کر گھنٹوں باتیں کرتیں، مجھے دیکھتے ہی کمرے میں دبک جاتیں۔ ساس یا تو لئے دیئے رہتیں یا باتیں کرتیں تو ایسی کہ ایک بات میں دو دو نہیں چار چار مطلب ہوتے۔ ان کے سب بیٹے باہر سے لمبی لمبی گاڑیاں لے کر آئے تھے۔ سب ڈیفنس سوسائٹی میں رہتے تھے۔ یہی حال بیٹیوں کا تھا۔ سب اپنے اپنے گھر میں راج رج رہی تھیں۔ صرف ربیعہ تھی جو اب "ممی سیٹل" نہیں ہوئی تھی۔

میں ان کو بتاتا تھا کہ مجھے اور ربیعہ کو ٹک کر بیٹھنے کا اتنا شوق بھی نہیں ہے۔ مگر وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھیں۔ درخت وہی اچھا ہوتا ہے جس کی جڑ مضبوط ہو، تنے ہوں، شاخیں لمبی ہوں۔ پھول اور پھل دے۔ کمزور جڑ والے پودوں کا کیا ہے۔ خود بخود ہی سوکھ جاتے ہیں۔ ورنہ جب دل چاہا کسی اور نے اکھاڑ پھینکا۔ مشکل یہ تھی کہ یہ باتیں رفتہ رفتہ ربیعہ کو بھی وزنی لگنے لگی تھیں۔ وہ انگلستان میں یہاں کی ذہنیت کا مذاق اڑاتی تھی۔ مگر اب اسے رکشا اور ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے شرم آنے لگی تھی، ایک ساری کو دوسری دفعہ کسی تقریب میں پہنتے ہوئے ناگواری کا احساس ہوتا تھا۔ رہنے کا سلسلہ یہ تھا کہ ربیعہ اپنے میکے میں رہتی تھی اور میں اپنے گھر۔ ہم اب، چوکوں پہ تو نہ ملتے تھے۔ مگر کبھی وہ آ جاتی اور ہمارے گھر والے باصرار اسے دو ایک دن کے لئے ٹھہرا لیتے اور کبھی میں چلا جاتا تو ربیعہ کے گھر والے بادل نخواستہ مجھے دو چار دن برداشت کر لیتے۔ یہ صورت حال میرے لئے خاصی عذاب ناک تھی۔ جسے میں زیادہ دن نہ جھیل سکتا تھا۔

جس طرح ربیعہ کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے گھر والے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ یہ رشتہ اس کے لئے مناسب نہیں تھا۔ اسی طرح میں بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے گھر والے بھی صحیح سوچتے تھے وہ صاف صاف نہیں کہتے تھے، مگر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ کہ ان کی بہت سی امیدیں میرے ساتھ وابستہ تھیں۔ بھائیوں کی تعلیم اور اور بہنوں کی شادی کے جو اخراجات مجھے اٹھانے چاہئیں تھے، ان میں ربیعہ نے قبل از وقت حصہ بٹا کر کچھ اچھا نہیں

نہیں کیا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں اور ربیعہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے دور تھے اور جب نزدیک آتے تھے۔ تو صورتِ حال سے پریشان ہوکر لڑنا شروع کر دیتے تھے۔ بند کمروں میں یہ لڑائیاں دن بدن شدت اور تندی اختیار کرتی گئیں۔ جسمانی دوری سے بگڑے مزاجوں پر خارجی حالات جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ آخر میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ربیعہ واپس جانے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی اپنی ریسرچ میں دلچسپی بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب وہ گھر کے کاموں میں الجھ کر اپنی ریسرچ جاری رکھ ہی نہیں سکتی تو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے اس کا خیال تھا کہ مجھے بھی ان کی سسرال کی بزنس میں کھپ جانا چاہیئے۔ تاکہ ہم ٹھاٹھ سے نہیں تو کم از کم آرام سے رہ سکیں۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ ابھی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ کراچی میں لسانی جھگڑے شروع ہو گئے۔ ربیعہ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی تھی۔ میں ناظم آباد میں رہتا تھا۔ درمیان میں لسبیلہ کا پُل تھا۔ جب بھی ہنگامے ہوتے اس پُل پر سے گزرنا خطرناک ہو جاتا تو ربیعہ اپنے گھر اور میں اپنے گھر میں قید ہو جاتا۔ ربیعہ کے اور ہمارے گھر میں بھی ان موضوعات پر گھنٹوں بحثیں ہوتی۔ کوئی کہتا۔ لوگ پاکستان میں اس لیے تو اپنا سب کچھ لٹا کر نہیں آئے تھے کہ مار مار کر انہیں سندھی بنایا جاتے۔ ورنہ ان پر نان نفقہ بند کر دیا جائے۔ دوسرا کہتا ہجرت کرنے والوں پر فرض تھا کہ خود کو یہاں کے لوگوں میں ضم کرتے اور اپنے آپ کو ان میں سے ایک جانتے اور اپنے کلچر اور زبان کو ان کے کلچر اور ان کی زبان پر ترجیح نہ دیتے اور ان کے ملک میں آن کر ان کی کرسیوں اور تختوں پر مختار اعلیٰ بن کر نہ بیٹھتے۔ کوئی کہتا ہجرت تو یوں ہوتی ہے کہ انصار اپنے گھر، اپنی زمینیں تک بانٹ لیتے ہیں۔ ایک آدمی کی دو بیویاں ہوں تو وہ ایک کو طلاق دے دیتا ہے کہ مہاجر بھائی اس سے شادی کر لے۔ مگر ان بحثوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اُدھر میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے کراچی چھوڑ کر جہاں منہ اٹھے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میری اور ربیعہ کی ملاقات پھر ایک

ہوٹل میں ہوتی اور ہم میں ایک فیصلہ کن جنگ ہوتی۔

"تم میرے ساتھ چلوگی یا نہیں ؟" میں نے پوچھا۔

"کہاں ؟" اس نے سوال کیا۔

"جہنم میں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"نہیں، مجھے جہنم سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ بھی تمہارے ساتھ۔"

"اچھا میں جا رہا ہوں۔ مگر میں تمہیں آزاد نہیں کروں گا کہ تم گلچھرے اڑاتی پھرو۔"

"مجھے مردوں سے اتنی نفرت ہو گئی ہے کہ میں دس قدم سے آگے اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ البتہ تم میری طرف سے گلچھرے اڑانے کے لیے آزاد ہو۔"

"مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔ اگر میں چاہتا تو تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی گلچھرے اڑا سکتا تھا اور اڑا سکتا ہوں۔"

"تو جاؤ جہنم میں" اس نے کہا۔ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کہ کہیں میں اس کے بال پکڑ کر نہ گھسیٹ لوں۔

یہ اس سال کا ہم جیسے پیارے، محبت کرنے والے جوڑے کا آخری مکالمہ تھا۔ میں نے اندھا دھند درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں۔ چین، کوریا، جاپان، فلپائن، آسٹریلیا، نیروبی، گھانا، ایرانی، ترکی اور امریکہ میں سارے سفارت خانوں کے اخبار دیکھتا اور جہاں کہیں کوئی جگہ نظر آتی۔ ایک عدد درخواست داغ دیتا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ مضامین کی فہرست طویل تھی۔ پڑھانے اور ایک آدھ جگہ کام کرنے کا تجربہ بھی تھا اور اس زمانے میں دوسرے ملکوں میں جانا آج کی طرح دشوار نہ تھا۔ مجھے امریکہ سے بلاوا آیا اور میں نے وہاں جانے کی تیاری شروع کر دی غصے میں ربیعہ کو میں نے اطلاع نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ غصہ ٹھنڈا ہونے پر ضرور ملنے کی کوشش کرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ شاید گھر والوں کے کہنے میں آگئی تھی یا اس کے گھر والوں نے محاذ بنا کر میری ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ جب میں کہیں

سے فون کرتا جواب ملتا ربیعہ گھر پر نہیں ہے۔ آخری دن جب اس سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی رشتے دار کی شادی میں حیدرآباد گئی ہوئی ہے اور تین چار دن بعد واپس آئے گی۔

میں امریکہ پہنچ گیا۔ ربیعہ کا نہ کوئی خط آیا نہ میرے کسی خط کا جواب۔ میرے گھر والوں نے لکھا کہ انہوں نے ہم سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ غیروں سے بدتر سلوک کرتے ہیں۔ گھر پر جاؤ تو توہین کی حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور ہمیشہ ایک ہی جواب ملتا کہ ربیعہ گھر پر نہیں ہے چند دن بعد گھر والوں کے خط سے ہی معلوم ہوا کہ ربیعہ دوبارہ لندن چلی گئی۔

"ایک مرتبہ جب میں فرم کے کام سے اٹلی جا رہا تھا تو میں نے ربیعہ کو تار دے دیا۔"

دوسرے دن جب میں کام سے لوٹا تو ہوٹل کے سامنے ساڑھی میں ملبوس ایک عورت کو ٹہلتا دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور جب میں نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ انہونی، وہ ناممکن بات، وہ معجزہ ہو چکا ہے۔ ہم دونوں بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ربیعہ میری زندگی پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ نہ میں اسے بھول سکتا ہوں نہ چھوڑ سکتا ہوں۔۔ وہ تین دن جب میں صبح کو اپنے کام پر جاتا اور سہ پہر سے رات گئے تک روم میں ربیعہ کے ساتھ مارا مارا پھرتا، میری زندگی کا ماحصل بن گئے اور پھر ہم جہاں بھی چلتے روم کے کلوسیم میں شیروں کے بھٹوں کے آگے، فورم کے سنگِ مرمر کے ستونوں کے سائے میں ہسپانوی سیڑھیوں میں، جہاں کئی انگریز شاعروں کے چڑھنے اور اترنے کے نظر نہ آنے والے نشان تھے۔ روم کے گلیاروں میں جہاں ہم نلکوں سے پھل دھو دھو کر کھاتے تھے اور پیازا دینیز یا میں شہنشاہ مارکس آریلیس کے سیاہ سنگی مجسمے کے نیچے کھڑے ہوتے ہمارے درمیان ایک ہی معرکہ تھا۔ میں ربیعہ سے کہتا۔

"میرے ساتھ امریکہ چلو۔۔ اتنا بڑا اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ ہم وہاں بہت خوش رہیں گے۔"

وہ کہتی۔۔ تم کینیا چلو۔۔ وہ امریکہ سے کم ترقی یافتہ سہی۔ مگر کم خوبصورت نہیں ہے۔

ہم بڑے ملک کا کیا کریں گے؟ نیروبی میں میرے پاس ایک بڑا سا گھر ہے اور اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ تم نوکری نہ بھی کرو تو مزے سے گزر ہو سکتی ہے۔"

یہ بات میرے مشرقی مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ ہر بیوی کو وہاں جانا پڑتا ہے جہاں اس کا شوہر کہے۔ جہاں اس کا شوہر رہے — ربیعہ کہتی "یہ کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں وہاں رہنا چاہیئے۔ جہاں زیادہ آسانیاں ہوں۔ جہاں سے ہمارا اپنا ملک نزدیک ہو اور پھر میں وہاں سوشل کام بھی کر رہی ہوں۔ میرے نزدیک وہ بہت اہم ہے۔ ہم دونوں وہاں بہت خوش رہیں گے۔"

آخر میں نے تنگ آکر غصے میں کہا۔

"خوش تو ہم ایک دوسرے سے دُور ہی رہ سکتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے"۔ اُس نے بغیر بُرا مانے کہا۔

وہ ہمارے ملاپ کا آخری دن ایک طویل جدائی شروع ہونے سے پہلے کا دن، وصل و فراق کی عجیب و غریب کش مکش میں گزرا۔ ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی کہ باتیں تو پہلے ہی بہت ہو چکی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ میں مغرب کی طرف اور وہ مشرق کی سمت لوٹ گئی۔

ہم میاں بیوی جو ایک دوسرے کے رفیق حیات تھے۔ ایک دوسرے کا پردہ تھے۔ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دُور تھے اور بظاہر اس کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی۔

اُس دن روم میں جو تصویریں اکٹھی یا الگ کھینچی تھیں۔ وہ سب میرے پاس تھیں اور میں انہیں گھنٹوں دیکھا کرتا تھا — ایک دن ایکا ایکی مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ بچپنا ہے جب ہم ساتھ نہیں رہ سکتے تو نہ صرف ہمیں الگ رہنا چاہیئے۔ بلکہ الگ ہو جانا چاہیئے اور اُسی دن سے میں نے عورتوں میں بطور خاص دلچسپی لینی شروع کر دی کوئی نہ کوئی مجھے اتنی بھا ہی جائے گی کہ میں اُسے اپنا جیون ساتھی بنانے پر تیار ہو جاؤں۔ تب میں ربیعہ کو آزاد کر دوں گا —

مگر انصاف ـــ کا تقاضہ تھا کہ میں اسے پہلے سے آزاد کر دیتا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا، فیصلہ کیا، خط لکھنا شروع کیا۔ مگر کبھی کوئی خط پورا نہ ہو سکا۔

اور پھر ایک دن مجھے ربیعہ کا تار ملا۔ وہ کسی سیمینار کے سلسلے میں واشنگٹن آئی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے لکھا "صرف ایک ہفتہ ہے۔ اگر تم آسکو تو آجاؤ، اکٹھے سیر کریں گے مجھے بڑی خوشی ہوگی" اچانک اس کا تار پا کر میں بے حد خوش ہوا جیسے کسی بچے کو یکایک وہ کھلونا مل جائے جس کا وعدہ اتنا پرانا ہو کہ وہ اسے بھول بھی چکا ہو۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ کیا بچپنا ہے میں اس سے ملنے اتنی دُور جاؤں۔ کس لئے ـــ ذرا سی دیر کی رفاقت کے لئے جس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ یہ زن و شوہر کی رفاقت، نہیں ہے۔ یہ تو ان دو اجنبیوں کی یکجائی ہے جو سفر میں چلتے پھرتے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مجھے ہرگز نہیں جانا چاہیئے۔ تاکہ اسے اندازہ ہو کہ میں اس کے حکم کا بندہ نہیں ہوں۔ کیوں نہ میں جواب میں لکھ دوں "افسوس ہے میں نہیں آسکتا" مگر اس درجہ خوش اخلاقی کی بھی کیا ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں خاموشی اور مایوسی جو چرکا لگائے گی، وہ یقیناً گہرا ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس مرتبہ اس کا آنا اپنی شکست کا اعتراف ہی ہو آخر امریکہ تک تو وہ آہی گئی۔ البتہ میری ریاست تک، اُسے آنا گوارا نہیں ہے۔ اب بھی وہ مجھ ہی سے خوشامد کروانا چاہتی ہے۔ لیکن میں اب اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اب وقت نکل چکا ہے اور میں اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔

لیکن پھر خدا جانے کیا ہوا۔ ایکا ایکی میرا دل مجھے ملامت کرنے لگا۔ میں نے ربیعہ کے ساتھ واقعی زیادتی کی تھی۔ اسے یقیناً مجھ سے اچھا شوہر مل سکتا تھا اور اب جب کہ وہ غالباً پچھتا رہی تھی اور نرم پڑ رہی تھی۔ میرا اکڑ جانا یقیناً نامناسب تھا۔ اس سے قبل کہ میرا دل ان خیالات کے خلاف دلائل دے کر مجھے قائل کرے۔ میں نے چھٹی لی اور واشنگٹن جا پہنچا۔

ربیعہ اتنی ہی حسین، اتنی ہی شگفتہ اور اتنی ہی بے مروت تھی۔ وہ واقعی ایک سیمینار میں شرکت کرنے آئی تھی۔ دن کے اور کبھی کبھی شام کے چند گھنٹے وہ سیمینار میں گزارتی اور باقی

ہر پل میرے ساتھ۔ وہ پل، وہ گھنٹے، وہ دن کتنے دل کش تھے کہ باقی زندگی ان لمحوں کے مقابلہ میں ایک بوجھ نظر آتی تھی۔ مجھ پر ایک دفعہ پھر اس بات کا انکشاف ہوا کہ میں ربیعہ کے بغیر خوشی کا دھوکا تو کھا سکتا ہوں، لیکن دراصل خوش نہیں رہ سکتا۔۔۔ ایک مرتبہ پھر میں نے اس سے ساتھ رہنے کی استدعا کی۔ اس نے جواب دیا۔

"ہم ایک دوسرے سے دور رہنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب ساتھ رہنا مشکل ہے ساتھ رہیں گے۔ تو ہر وقت لڑیں گے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے نفرت ہو جائے گی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہمیں ایک دوسرے سے نفرت ہو جائے۔۔۔ یہ فیصلے کا عجیب و غریب لمحہ تھا، یا تو ہم ایک دوسرے سے دور رہ کر دائمی محبت کرتے رہیں یا ایک دوسرے کے وصل میں سرشار ہو کر ہر وقت کی جنگ و جدل اور آخر کار نفرت کا بوجھ برداشت کریں۔

وقت گزرتا گیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ربیعہ نے چلتے وقت کہا۔۔ "ہمیں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔" تب میں یکدم پھٹ پڑا۔ میں نے کہا۔

"سنو۔۔ اگر دور رہ کر ہمیں دائمی محبت میں بندھے رہنا ہے تو اس کے لئے ازدواجی بندھن کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اگر ہم ساتھ نہیں رہ سکتے تو ہمیں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنا ہوگا۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔" میں نے دیکھا کہ یکایک ربیعہ کا رنگ یوں سفید ہو گیا جیسے لمحہ بھر میں کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ میں نے اس کی خالی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے فوراً اضافہ کیا۔

"اب کے ہم جہاں کہیں ملیں گے وہیں اس بات کا فیصلہ ہوگا۔ یا تو ہماری راہیں ہمیشہ کے لئے مل جائیں گی، یا ہم ہمیشہ کے لئے الگ ہو جائیں گے۔

"تو تم ساتھ رہ کر دن رات دوزخ میں جلنے کو تیار ہو۔۔"

"ہاں اگر یہی ہمارا مقدر ہے تو یہی سہی۔۔۔ میں دور کی جنت پر نزدیک کی دوزخ کو ترجیح دیتا ہوں۔"

"ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم پچھتاؤ ــــ !"

"ٹھیک ہے میں بھی سوچوں گا ــ تم بھی غور کرنا ۔ بہر حال اب کے جب ہم ملیں گے ۔ تو جو بھی فیصلہ ہوگا وہ آخری ہوگا ۔"

ہم اب رخصت ہوئے تو ہمارے دل ہمیشہ سے زیادہ بوجھل تھے ۔ خدا جانے یہ دوزخ میں جلنے کا خوف تھا کہ بہشت سے نکل کر اپنے پسینے کی کمائی کھانے کی فکر تھی ۔ وصلِ مسلسل یا فراقِ پیہم ــــ دونوں ہی ہمارے لئے عذابِ جان تھے ــــ

اور اس دفعہ ہمارے ملنے کی جگہ ایمسٹرڈم تھی ــــ میں نے اپنے آنے کی تاریخ ، ہوٹل کا نام پتہ سب کچھ لکھ دیا ۔ مگر ربیعہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی ۔ میرے لئے ہوٹل کے چھوٹے سے جلتے جھلستے کمرے میں بیٹھنا دوبھر ہو چکا تھا ۔ ہوٹل کے استقبالیہ میں بیٹھنا ناممکن تھا ۔ اور ٹہلتے ٹہلتے میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں ۔

میں نے استقبالیہ پر بتایا کہ کوئی خاتون مجھے پوچھیں تو میرے کمرے کی چابی انہیں دے دی جائے اور پھر میں بس میں سوار ہو کر سیر کرنے نکل گیا ۔

ڈیم اسکوائر سے میں نے کشتی کی سیر کے لئے جانے کا فیصلہ کیا ۔ جس وقت میں کشتی میں بیٹھا ۔ مجھے یوں لگا ۔ جیسے ربیعہ میرے پاس بیٹھی تھی ۔ جب بھی ہماری رہبر خاتون کوئی دلچسپ بات بتاتی میں خوش ہو کر ربیعہ کی طرف دیکھتا اور یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا کہ میرے برابر میں استی سالہ ایک بڑے میاں بیٹھے تھے ۔ جب ہماری کشتی ایک پُل سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر رہی تو پُل کے اندرونی تاریک اور سیلے حصے میں بنے ہوتے گھونسلے میں ایک کبوتری ایک انڈے پر بیٹھی تھی وہ بالکل تنہا تھی اور اس کی آنکھوں میں اداسی تھی ۔ میں نے پلٹ کر ربیعہ کی طرف دیکھا ۔ میرے بار بار اس طرح دیکھنے سے بڑے میاں پہلے ہی بروامان کر دوسری سیٹ پر جا بیٹھے تھے اور اب میرے برابر میں کوئی بھی نہ تھا ۔

نہریں ہی نہریں ، پُل ہی پُل ۔ کہیں سے کتنے ہی پلوں کی محرابیں بیک وقت نظر آتیں ،

نہروں سے ہماری کشتی کھلے سمندر تک جا پہنچی۔ اور پھر گھوم پھر کر وہیں لوٹ آئی۔ جہاں سے چلی تھی۔ ایک فوٹو گرافر نے میری تصویر نذر کی جو اُس نے کشتی میں اُترتے ہوئے لی تھی۔ اور مجھے ایک بار پھر تعجب ہوا کہ ربیعہ کی تصویر اس میں شامل نہیں تھی۔ سارے مسافر جوڑے جوڑے تھے۔ سوائے میرے اور اسی سالہ بڑے میاں کے ——— اور میری ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی تھی ——— مجھے یقین تھا کہ اب تک ربیعہ ہوٹل پہنچ چکی ہوگی۔ وہ میرے کمرے میں میرے بستر پر دراز ہوگی اور میرا جی چاہا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر ہوٹل پہنچ جاؤں ——— سڑک پر پہنچ کر میں نے ٹیکسی لی اور ہوٹل کا پتہ بتایا۔

راستے بھر سوچتا رہا۔ ہوسکتا ہے۔ ربیعہ ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھی ہو۔ ہوسکتا ہے۔ اوپر لاؤنج میں بیٹھی ٹیلیویژن دیکھ رہی ہو یا میرے کمرے میں میرے بستر پہ دراز میرے سگریٹ پی کر وقت کاٹنے میں مصروف ہو۔

ہوٹل پہنچا تو ربیعہ ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی کرسیوں پر نہیں تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بھی نہیں تھی اور نہ میرے بستر پر دراز سگریٹ پی رہی تھی۔ وہ آئی ہی نہیں تھی ——— اور کل میری واپسی تھی۔

کمرے میں بے حد گرمی تھی اور میری طبیعت از حد جھنجھلائی ہوئی تھی۔ میں نے غصے سے پردے ایک طرف سرکائے۔ کھڑکیاں بالکل سڑک پر کھلتی تھیں۔ میں نے کھڑکیاں کھول دیں۔ تازہ ٹھنڈی ہوا میں کچھ دم میں دم آیا تو خیالات نے ایک بار پھر یلغار کی ———

اس کا مطلب ہے ربیعہ نے اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔ اب میری بات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ہر قیمت پر دُور رہنا چاہتی ہے۔ خواہ میں اس سے بندھا رہوں یا آزاد ہو جاؤں۔ کتنی سنگدل ہے وہ جب کہ میں ——— ایک یورپی ملک میں چاروں طرف حسین و جمیل لڑکیوں کے ہوتے ہوئے ہمہ وقت ربیعہ کو اپنا شریک سفر سمجھا کیا ——— اُس کے آنے کی آس ہی مجھے اس کی موجودگی کا احساس دلانے کو کافی تھی اور اس

وقت بھی جب میں یہ سب باتیں سوچ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر ہرگزرتے سائے پہ مجھے ربیعہ کا گمان گزر رہا تھا۔ ایک آس نے مہینوں کے فصل کو یکایک پاٹ دیا تھا۔ مگر وہ انہیں صدیاں بنانے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔

ٹھیک ہے۔ اگر وہ بھی چاہتی ہے تو میں بھی گھر پہنچتے ہی اسے طلاق نامہ بھجوا دوں گا۔ اور تب میں نے دوبارہ پردے کھینچ دیئے اور بستر پہ لیٹا سگریٹ پھونکتا رہا۔ اس وقت ربیعہ کی قربت کا ذرا بھی احساس نہیں تھا بلکہ محسوس ہوتا تھا جیسے میں اُسے طلاق دے چکا ہوں۔ ہم میں دائمی جدائی ہو چکی ہے۔ اب میں اُسے کبھی نہیں دیکھوں گا۔ اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔ وہ آج تک میرے لئے سب کچھ تھی۔ اب میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے دائمی فراق کی یہ پہلی رات تھی۔ جو میں نے سگریٹ پھونکتے آنکھوں میں کاٹ دی۔

دوسرے دن جب میں تیار ہو کر سوٹ کیس تھامے باہر نکلا اور آخری بار کنجی استقبالیہ میں دی تو انھوں نے ایک تار میری طرف بڑھا دیا۔ ربیعہ نے لکھا تھا۔ "بہت کوشش کے باوجود ہفتہ کو نہ پہنچ سکی۔ اتوار کو پہنچوں گی"۔ مگر اب میں ٹھہر نہیں سکتا تھا مجھے پیر کے دن اپنی ملازمت پر پہنچنا تھا اور میرا آج روانہ ہونا ضروری تھا۔ میں نے وہی کمرہ ربیعہ کے لئے بُک کروا کے پیشگی پیسے ادا کئے اور کنجی واپس لے کر پھر اس کمرے میں آیا اور ربیعہ کو ایک طویل خط لکھا۔ جہاں جہاں کل گیا تھا۔ اس کی تفصیل لکھی اور لکھا کہ کل مجھے یہ محسوس ہوتا رہا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ آج ان سب جگہوں پہ جاؤ تو ممکن ہے تم محسوس کرو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب تم واپس آؤ۔ تو میرے بستر پہ لیٹ کر سوچنا کہ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔

اس کے بعد مجھے پتہ نہ چل سکا کہ ربیعہ آئی یا نہیں۔ وہ ان سب جگہوں پر گئی یا نہیں اسے اُس ملاقات کا جو نہ ہو سکی۔ میری طرح تجربہ ہوا یا نہیں۔ اُس نے بستر پہ لیٹ کر ساری رات سگریٹ پھونکی یا نہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا اور جب طلاق کے کاغذات کا پہلا

مسودہ میں نے اسے بھیجا تو وہ واپس آگیا۔ اس نام کی کوئی خاتون اب وہاں نہیں رہتی تھیں۔ وہ کہاں گئی۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ گھر والے مدت سے ربیعہ کا ذکر بھی کسی خط میں نہیں کرتے تھے ان سے پوچھنا اچھا نہیں لگا اور پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اس سے ہر رابطہ قطع کر لیا تھا۔ میری بلا سے وہ کہیں جائے۔ اگر اسے طلاق چاہیئے ہو گی تو وہ خود مجھ سے رجوع کرے گی۔ میں ظاہر ہے کہ اس کو طلاق دیئے بغیر بھی دوسری شادی کرنے کا مجاز تھا۔

اور جب کئی سال بعد میں کراچی آیا تو پتہ چلا کہ ہمارے گھر والوں کا ربیعہ کے خاندان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اڑی اڑی سی خبر سنی گئی ہے کہ ربیعہ دوبارہ انگلستان چلی گئی ہے۔

"اوہ مجھے پتہ ہوتا تو میں اس سے ملتا آتا ــــ" ذہن میں فوری طور پر خیال آیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میرا اور ربیعہ کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔

تو وہ انگلستان چلی گئی۔ کوئی جیسے بار بار مجھے یاد دلاتا۔ اور میرے ذہن میں آج سے سالوں پہلے کے مناظر گھومنے لگتے۔ میں اور ربیعہ گرین (GREEN) پارک کے لمبے لمبے سایوں والی گھاس پر دراز ہیں۔ ریجنٹ اسٹریٹ پر جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ برٹش میوزیم میں مصری، یونانی، رومن چینی اور ایرانی گیلریاں دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں کبھی پاکستانی، ہندوستانی اور بنگالی ریسٹورانوں میں اصل کھانوں کی نقل کھا رہے ہیں۔ کبھی انڈر گراونڈ سے نکل رہے ہیں کبھی انڈر گراونڈ میں جا رہے ہیں۔ کبھی برف میں پھسل رہے ہیں۔ کبھی پھواروں میں نہا رہے ہیں کبھی شیکسپیر کے سرسبز جھونپڑے کا عکس ندی کے پانی میں پڑتا دیکھ رہے ہیں۔ تو کبھی برانٹی بہنوں کے دیس یارک شائر میں لانبی لانبی گھوڑے سے ابال ایسی گھاس کو پار کر رہے ہیں۔ کبھی یارک منسٹر کے جلال و جمال سے مسحور ہو رہے ہیں اور کبھی اپنے ایک کمرے کے فلیٹ میں لڑ رہے ہیں اور لڑتے جا رہے ہیں۔

سارا دن ذہن میں قصے دہراتا رہا۔ طبیعت سخت پراگندہ رہی۔ ہزار کوشش سے

ذہن کو انگلستان سے نکالتا اور امریکہ کے خوش باش شہروں میں لے جانے کی کوشش کرتا مگر وہ کسی غیر ذمہ دار سیاح کی طرح کبھی پیرس، کبھی روم اور کبھی کہیں اور اُڑتا جاتا۔ کسی ایسی جگہ جہاں میں اور ربیعہ ساتھ گئے تھے۔

پریشان ہو کر میں تیار ہوا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ شاید میں خواب میں گھومتا پھر رہا تھا کیونکہ یکایک وہی شکل نظر آئی جو خوابوں میں نظر آیا کرتی تھی ہلکے رنگ کی ساڑھی پر ایسا پرنٹ جیسے رنگ کے چھینٹے ڈالے گئے ہوں پہنے وہ کسی سے بڑی دھیرج سے پوچھ رہی تھی۔

"یہاں برٹش کاؤنسل لائبریری ہوا کرتی تھی۔"

"وہ تو بہت سال ہوئے یہاں سے اُٹھ گئی۔ اب وہ....." کوئی راہگیر اسے پتہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ربیعہ لوٹ چکی تھی۔ جیسے اُسے یہ جاننے کا ذرا بھی شوق نہ ہو کہ وہ اب کہاں ہے۔

راہ بتانے والا حیران تھا کہ اتنی مدت بعد لائبریری کا پتہ پوچھنے نکلی تھیں۔ تو ڈھنگ سے پتہ سن تو لیا ہوتا۔ وہ گردن ہلاتا ایک طرف چل دیا تو میں لپک کر آگے بڑھا... "ربیعہ"..... میں نے کہا

اُس نے آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ان میں ویرانی پہلے سے تھی۔ حیرانی بعد میں آئی۔

"تم کہاں ہو آجکل؟" میں نے اس سے پوچھا..... "یہیں ہوں" اس نے کہا۔

"اور تم کہاں ہو؟"

"میں بھی یہیں ہوں۔ ہیں چند دن ہوئے مستقل طور پہ پاکستان آگیا ہوں" پھر جیسے تمام باتیں ختم ہو گئیں۔

"آؤ چلیں" میں نے اُس سے کہا۔

"کہاں؟" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"گھر۔"

"گھر کہاں ہے؟"

"جہاں کہیں بھی ہو۔" میں نے کہا اور ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور، ہم چل دیئے۔ نہ مجھے معلوم تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے نہ اسے خبر تھی کہ میرا گھر کہاں ہے، نہ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ ہمارا گھر کہاں ہے اور ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہمیں صرف، اتنا معلوم تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مکعب

+ یہ ایک مکعب ہے۔

— ہاں دیکھ رہا ہوں۔

+ اس میں ستائیس چھوٹے چھوٹے مکعب ہیں جو آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس میں چھ رنگ ہیں۔ سفید، زرد، نارنجی، سرخ، سبز اور نیلا۔ اس مکعب کو تم تین طرف گھما سکتے ہو۔

— معلوم ہے۔ تم چاہتے ہو کہ ہر رنگ ایک طرف ہو جائے۔

+ بالکل ساری سرخ سطحیں ایک طرف، زرد ایک طرف، سبز ایک طرف ہوں۔ کوئی رنگ کسی دوسرے کی حد میں نہ ہو، صرف اپنی حد میں ہو اور یوں مکعب میں مکمل ہم آہنگی ہو جائے۔

— یہ ناممکن ہے، میں بہت دن سے کوشش کر رہا ہوں مگر ایک طرف بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ معمہ نہیں فراڈ ہے۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

+ یقین کرو بھائی، ہو سکتا ہے، ہوا ہے اور ہو گا۔

+ اگر ہوا ہے تو کروڑوں مرتبہ میں سے ایک مرتبہ ہو گیا ہو گا اور ہو گا تو سینکڑوں سال بعد اتفاق سے کبھی ہو جائے گا۔

+ اس مکعب کے امکانی پیٹرن کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ مجھے اتنی گنتی نہیں آتی۔ میں لکھ کر بتاتا ہوں اگر پڑھ سکتے ہو تو پڑھ لو۔

ان امکانات کی تعداد ۸۵۶۰۰۰، ۴۸۹، ۳،۴۷، ۲۵۲۰۰۳، ۴۳ ہے۔ مگر جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا تو یہ مکمل ترتیب میں تھا۔ سب رنگ اپنی اپنی جگہ تھے۔

— تو تم نے اس کی ہم آہنگی کو توڑا کیوں۔ انہیں بے جگہ کیوں کیا؟

+ اس لئے میرے بھائی کہ کھیل ہی یہی ہے۔

— کھیل ہی یہی ہے؟

+ ہاں...... یہی تو کھیل ہے کہ اس ہم آہنگی کو توڑا جائے اور پھر اسے قائم کیا جائے ہر رنگ سدا اپنی جگہ رہتا تو مزا کیا آتا۔ کس کی ذہانت کا امتحان ہوتا۔

— کیا ذہانت کا امتحان بہت ضروری ہے؟

+ اور کیا! یہ بھی تو کھیل کے لطف میں شامل ہے کہ تمہاری طرح لوگ پکار پکار کہ کہیں یہ ناممکن ہے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ یہ قطعی ممکن ہے۔

— تمہارے یقین دلانے سے کیا ہوتا ہے اگر میں پھر بھی نہ مانوں!

+ تم یہ تو مانتے ہو کہ اسے کسی نے بنایا ہے؟

— ہاں مانتا ہوں۔

+ تم میری بات پر یقین کرتے ہو؟

— ہاں کرتا ہوں۔

+ تو میں تمہیں بتا رہا ہوں تاکہ جب میں نے اسے دیکھا ہے تو اس کا ہر رنگ ایک طرف تھا۔

— اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے دوبارہ بنایا جا سکتا ہے۔ پہلے یہ ٹکڑے جُدا جُدا ہوں گے۔ بنانے والے نے سارے رنگ یکجا کئے اور انہیں جوڑ دیا۔ اب جب کہ تم نے سارے خلئے اپنی جگہ سے ہلا دیئے ہیں۔ وہ سب دوبارہ اپنی اپنی جگہ نہیں جا سکتے۔

+ کیوں نہیں جا سکتے؟

— ابھی تم ایک مکمل انسان ہو، اگر میں تمہارا جوڑ جوڑ الگ کر دوں، ہر عضو بے جگہ کر دوں

تو کیا انہیں دوبارہ جوڑ سکتا ہوں۔ نہیں ایسی ابتری اور کیوس سے ترتیب پیدا ہونا ممکن نہیں۔

+ کیوں نہیں! اچھا تھیوری سے شروع کرو۔ ممکن ہے تم میرا جوڑ جوڑ الگ کر کے نہ جوڑ سکتے ہو۔ مگر کوئی بے حد ماہر سرجن جو علم البدن سے اچھی طرح واقف ہو ایسا کر سکتا ہے یا نہیں۔

— صرف تھیوری کی حد تک۔

+ جو چیز تھیوری میں ممکن ہو وہ ایک نہ ایک دن عملی طور پر بھی ممکن ہو جاتی ہے۔ سمندری سطح پر چلنے والے جہاز پہلے کاغذ ہی کی سطح پر رواں ہوئے تھے اور ہوا میں اُڑنے والے جہاز پہلے کاغذ پر ہی اُڑائے گئے تھے۔ دیکھو باتوں میں ایک طرف تو مکمل بھی ہو گئی۔

— دکھاؤ، یہ کیسے ہوا؟

+ کوشش سے اور اس یقین سے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

— ایک طرف کا مکمل ہو جانا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ چھ کی چھ اطراف مکمل ہو سکتی ہیں

+ ایک طرف کا مکمل ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ چھ کی چھ اطراف مکمل ہو سکتی ہیں کسی نہ کسی دن، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی کے ہاتھوں۔

— کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک۔

+ جینے اور مرنے کی بات اور ہے، ایقان کا مسئلہ دوسرا ہے۔ یہ یقین کہ ہم مریں یا جیئیں یہ بات ہو سکتی ہے اور ہو گی۔

X اب میری بات سنیئے، میں آپ دونوں کو اس مکعب کی کہانی سناتا ہوں۔ ہنگری میں روبیک نامی ایک شخص نے جب یہ مکعب بنایا تو بچوں کے کھیل یا معمّے کی حیثیت سے اُسے فروخت کرنے کے لیئے بھی کوئی تیار نہ تھا۔ بمشکل ایک کھلونا بنانے والی کمپنی چند ہزار مکعب بنانے پر راضی ہوئی مگر ہوا یہ کہ پہلے دوسرے دن ہی سارے مکعب بک گئے جو شخص اُسے کسی بچے کو تحفتاً دینے کے لیئے خریدتا اس میں ایسا اُلجھتا کہ اپنی سدھ بدھ بھول جاتا۔ بچے

بوڑھے جوان سب اس کے جال میں پھنس کر رہ گئے ۔ کچھ لوگ تو دیوانگی کی حد کو جا پہنچے۔ اور اس کا نام روبِک دیوانگی پڑ گیا ۔ ہنگری ہی سے جو لوگ باہر جاتے اور اُن کے ہاتھ میں یہ مکعب ہوتا تو دوسرے لوگ بھی اس میں دلچسپی لیتے ۔ ۱۹۷۸ء میں اسے ایک ہنگرین پروفیسر بین الاقوامی ریاضی کانفرنس میں لے گیا اور وہاں ایک امریکی پروفیسر نے جو لندن میں پڑھاتا تھا اسے پہلی مرتبہ دیکھا ۔ اس سے اور مکعب بھیجنے کی درخواست کی اور اس کا حل دریافت کیا ۔ چھیاسٹھ صفحے کی یہ کتاب فوری طور پر دس ہزار کی تعداد میں بک گئی اور اس کے، خدا جانے کتنے ایڈیشن چھپے ۔ اب یہ مکعب ایک سو پانچ ملین ماہانہ کے حساب سے بنائے جاتے ہیں تب بھی لوگوں کی مانگ پوری نہیں کر سکتے ۔ اب ریاضی داں اور سائنسداں اس میں نئی نئی تھیوریاں تلاش کر رہے ہیں اور پا رہے ہیں حالانکہ روبِک نے اس میں کسی علمی امکان کا دعویٰ نہیں کیا تھا ۔

— مگر کیا واقعی اس کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے ، میں نہیں مانتا ۔

X جناب آپ بہت بے خبر ہیں ۔ یہ نا ممکن کب کا ممکن ہو چکا ہے ۔ لوگ بڑی آسانی سے چھ کی چھ اطراف بنا لیتے ہیں ۔ میں اسے ایک منٹ میں بنا لیتا ہوں جب کہ دنیا کا ریکارڈ ہے بتیس سیکنڈ ۔

— واقعی! کیا نا ممکن اتنی آسانی سے ممکن ہو جاتا ہے ؟

+ آسانی سے نہیں بھائی ، کوشش سے ، لگن سے ، محنت سے اور یقین سے ۔

X اور اس کا کوئی ایک حل نہیں ہے ۔ کئی حل دریافت ہو چکے ہیں اور ہر شخص کا دعویٰ ہے کہ اس کا حل سہل ترین اور بہترین ہے ۔

+ تمہارا کیا خیال ہے ، کون سا حل بہترین ہے ؟

X جو حل سب سے پہلے آپ کے ہاتھ لگے یا جو حل آپ کی اُفتادِ طبع کے مطابق ہو ۔ اصل مسئلہ تو معمہ حل کرنا ہے ۔

— سچی بات یہ ہے کہ میرا دل نہیں مانتا، مجھے لگ رہا ہے کہ تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔

X لائیے یہ مکعب مجھے دیجئے اور آپ گھڑی پر نظر رکھئے۔۔۔۔۔ یہ ایک۔۔۔۔۔ یہ دو۔۔۔۔
یہ تین۔۔۔۔ یہ چار۔۔۔۔ یہ پانچ۔۔۔۔ یہ چھ، لیجئے مکعب مکمل ہو گیا۔ دیکھ لیجئے اپنی آنکھوں سے۔

— ہاں واقعی یہ تو ہو گیا۔ تو یہ ناممکن نہیں تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اپنی جگہ سے ہلانے کے بعد
یہ قیامت تک بھی اپنی جگہ واپس نہ جا سکیں گے۔

+ اب جب کہ سب رنگ ایک طرف ہو گئے ہیں۔ انہیں چھیڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھو
کیسا سکون ہے جیسے سب نے اپنی منزل پا لی ہو۔

X شاید سکون ہمارے اپنے دل و ذہن میں ہو۔ ہمارے لئے یہ معمہ ایک چیلنج تھا جسے پورا کئے
بغیر دل نہیں مانتا تھا۔ تجسس اور تکمیل کی جو خواہش ہر انسان میں ہے وہ ہمیں اس جنون
میں مبتلا کرتی ہے۔ مگر ہم بہت جلد ہی چھوڑ دیتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم اس
دیوانگی سے نکل آئے۔ عجب بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے فضول کاموں میں وقت گنوانے
کو ہم کام کرنا کہتے ہیں اور کھوجنے اور تحقیق کرنے کو دیوانگی کا نام دیتے ہیں۔

+ یہ تو صرف ایک مکعب ہے جس میں چون سوالات ہیں۔ سوالوں کی صرف ایک چھوٹی سی
ڈھیری۔ کائنات کی شش جہات میں سوالوں کی نہ جانے کتنی ڈھیریاں ہیں جن کے جواب
تلاش کرنا ہیں۔

X ان سب کے امکانی پیٹرن اتنے زیادہ ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔

+ صرف ایک امید ہے۔

— کیا؟

+ یہی کہ اگر انسان کوشش کرتا رہے تو ان سب کے حل ملنے ممکن ہیں، محنت سے، لگن سے
ایمان اور ایقان سے سارے سوالوں کی ساری ڈھیریاں کبھی نہ کبھی حل ہو جائیں گی، کسی نہ کسی
دن سارے جگ۔ نشا، منزل اپنی اپنی جگہ پا کر مکمل ہو جائیں گے۔

— ناممکن!

X دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ ریاضی داں کہتے ہیں کہ اگر کوئی بندر ٹائپ رائٹر پہ بیٹھ کر اندھا دُھند ہاتھ مارنے لگے تو وہ شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ جوں کا توں لکھ دے گا۔ اربوں کھربوں میں سے ایک سہی مگر اس کا امکان ہے۔

— میں اسے ناممکن کہتا ہوں، تو یوں کہو یہاں آن کر امکان اور ناممکن مل جاتے ہیں۔

+ مگر تمہیں ناممکن کہنے ہی پر اصرار ہے۔ تم ہر چیز کا منفی پہلو دیکھتے ہو اور اسی لئے غمگین رہتے ہو۔ کیا تمہارے غمگین رہنے سے دنیا کے غم کم ہو جائیں گے؟

— تو کیا تمہارے پُر امید رہنے سے دنیا کے دُکھ دور ہو جائیں گے۔ جب دنیا میں اتنے دُکھ، اتنی محرومیاں اور اتنے معمّے ہیں تو بتاؤ کہ خوش رہنے کا کیا جواز ہے تمہارے پاس؟

+ زندگی بذاتِ خود خوش رہنے کا جواز ہے۔ کائنات کے ہزار ہا معمّے ہماری عقدہ کُشائی کے منتظر ہیں۔ ان کو ناممکن سمجھنے والے غمگین رہتے ہیں اور امکان پر یقین رکھنے والے پُر امید رہتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے، ہے یا نہیں؟

— میں نے کبھی سوچا نہیں۔

+ سوچا کرو، سوچ کر فکر مند ہونا بغیر سوچے غمگین رہنے سے بہتر ہے۔

سرخ پلنگ پوش کی رات

خدا جانے یہ ناہید کی قربت کی آگ تھی یا سیما کے فراق کی تڑپ یا اس احساس کی شدت کہ اگر آج رات کسی لمحے میں کمزور پڑ گیا تو سیما ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہو جائے گی۔

وہ جو میرے قریب سو رہی تھی میری طرف سے مطمئن تھی۔ سونے سے پہلے پاس پاس بیٹھے اور کافی پیتے ہوئے اس نے کہا تھا "کل صبح آس پاس کے لوگ ہمیں اکٹھے دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟"

"وہی جو انہیں سوچنا چاہیئے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ ہم تم اکٹھے رہ رہے ہیں۔"

"یعنی.... اکٹھے کیا!!! اکٹھے تو ہم رہ ہی رہے ہیں مگر وہ رشتہ....؟"

"ہاں یقیناً اس رشتے کے بغیر اکٹھے رہنے کا تصوّر کون کر سکتا ہے۔"

"کیوں.... مگر کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ بضد تھی۔

"کیونکہ.... یہ قریب قریب ناممکن ہے۔"

"ناممکن کیوں ہے، قطعی ناممکن نہیں ہے۔ انسان اپنے اوپر قابو رکھ سکتا ہے۔ نہیں رکھ سکتا.... تم بتاؤ۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا اگر مرد اور عورت دونوں سمجھدار ہوں تو کوئی وجہ نہیں".... کیا خیال ہے تمہارا۔

"ہاں ٹھیک ہے مگر کیا کہا جا سکتا ہے..... آج پہلا تجربہ ہے۔"

"دیکھو تم کمزور پڑ رہے ہو۔"

"قطعی نہیں۔"

"اچھا وعدہ کرو..... کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوگی۔"

"نہیں ہوگی۔"

پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ ناہید نے کہا اب سو جائیں۔ اس نے بتی بند کی ہم دونوں پاس پاس بچھے ہوئے پلنگوں پر لیٹ گئے وہ سو گئی میں جاگتا رہا۔

دل نے کہا۔ وہ اتنی دور سے یہ دیکھنے آئی ہے کہ اپنے سب عزیز واقارب سے دور اس ملک میں ان حالات میں رہ سکتی ہے یا نہیں، وہ دو چار دن میں فیصلہ کر لے گی۔ مگر تم..... تم کیا فیصلہ کرو گے بولو!!!! تمہیں ایک زمانے میں اس سے محبت تھی کھلے بندوں تم دونوں ملتے تھے۔ حالات نے دونوں کو بچھڑنے پر مجبور کیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ تم اپنا خیال بدل دو گے وہ نہ معلوم کیسے کیسے اپنے حالات سے لڑ کر تم تک پہنچی اور اب تم..... صاف صاف مان لو کہ اب تمہیں اس سے محبت نہیں۔ مگر یہ بات میرے ذہن میں صاف نہیں تھی۔ یہ ضرور تھا کہ اب وہ پہلی سی تڑپ نہیں تھی۔ اس کے آنے پر اسے دیکھ کر خوشی بھی ہوئی تھی مگر ایک کانٹا سا بھی چبھا تھا۔ ایک دم سیما کا خیال آیا تھا۔ وہ جو مجھ سے اتنی چھوٹی تھی مگر کچھ دنوں سے یہ ننھا منا میرے حواسوں پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔

پھر جب میں اور ناہید بازار میں ساتھ ساتھ پھر رہے تھے تو دل میں ہوا سی بھری ہوئی تھی، پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں مگر ایک ٹیس سی بھی تھی جیسے زیادہ ہوا دل کو تکلیف پہنچا رہی ہو۔ یہ عجب دوراہا تھا۔ اصل میں میں اس پر وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ ایک کی طرف کھنچتے ہوئے دوسری کی یاد کی خلش آہستہ آہستہ نکل رہی تھی کہ وہ آ پہنچی، نہ کانٹا نکلا نہ اندر رہا۔

ایک بات اور بھی تھی۔ سیما کو تو کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر ناہید کو بڑی امیدیں تھیں امیدیں کیسی یقین۔ گویا فیصلہ تو بس اسے ہی کرنا تھا، میرا پرپوزل تو جوں کا توں اب تک قائم ہی تھا۔ ہاں اسے شبہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ میں اب تک کنوارا جو رہا مگر اب . . . . ! اور بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو ناہید کو واپس جانا ہی ہوگا۔ آج کی رات فیصلے کی رات تھی مگر یہ بات نہ اس کو معلوم تھی جو میرے قریب تھی نہ اس کو جو مجھ سے دور تھی۔ اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ جب میں کمزور پڑتا تھا تو یہی فیصلہ مجھے قوت دیتا تھا، شاید قربت کی آگ سے زیادہ دوری کی تپش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی مگر مجھے وہ وقت بھی شدت سے یاد آرہا تھا جب میں اس قریب کی آگ میں گرنے کو، جلنے کو، مرنے کو بھن جانے کو سر سے پا تک بنا رہتا تھا۔ وہ آنچ آج بھی تھوڑی سی باقی تھی جو مجھے دھیرے دھیرے پگھلا رہی تھی، اتنے قریب۔ اتنے۔ دو چار آنچ کا فاصلہ . . . اور ایک زمانے میں ہم نے کتنی ٹوٹ کر محبت کی تھی۔

کروٹ لے کر میں نے اس کے لٹکتے ہوئے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ وہ کچھ جاگی یا سوتے میں میرے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ میں اور نزدیک ہو گیا، اتنا کہ بس پٹی پر لیٹ گیا . . . مگر اس نے کروٹ بدل لی . . . گویا مجھے جتایا کہ ہمت سے کام لو۔ بہادر بنو۔ کتنا پاگل لمحہ تھا۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ اگر میں کمزور نہ ہوا، اگر میں نے ہمت کر لی تو وہ مجھے کھو دے گی . . . اگر اسے معلوم ہوتا تو شاید . . . اور ویسے بھی سنا ہے عورت جب نہیں کہتی ہے تو اس کے دل کی دھڑکنوں میں کہیں ہاں کی آواز آتی ہے۔ شاید اس کے کروٹ بدل لینے میں کھینچنے کی ادا ہو، اکساہٹ ہو، چیلنج ہو . . . . .

کشاکش بڑھ رہی تھی، نیند کا سوال ہی نہیں تھا، میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اٹھ کر بتی جلا دی اور کیا کرتا۔ وہ جاگ گئی۔ سرخ آنکھیں کھول کر معصومیت سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں"

"نیند نہیں آئی ؟"

"نہیں۔"

"کیوں ؟"

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا اور سچ بات بتلانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے تکئے کے نیچے سے نکال کر گھڑی دیکھی۔

"تین بجے ہیں صبح تو ہو گئی میں کافی بناتی ہوں۔"

اس نے اُٹھ کر گاؤن پہنا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ کافی بنا کر لائی تو میں نے اس سے کہا "آج ہوٹل میں تمہارے لئے کمرہ بک کرا دوں گا۔"

"کیوں ؟"

"بس۔"

"ارے دو چار دن کی تو بات ہے، ایک رات تو گزر ہی گئی . . . اور بھی گزر جائیں گی . . . پہلی ہی رات تو مشکل ہوتی ہے۔" یہ بات اس نے میری پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر کہی تھی تاکہ میں اس کے چہرے پر حیا کی سرخی نہ دیکھوں مگر اس کے لہجے میں اور آخری فقروں میں جو منمنانے کی کیفیت تھی وہ مجھ سے چھپی نہ رہی "اور دیکھو نا، ہم اب بچے تھوڑی ہیں . . . کیا ہم ساری عمر اس بات پر فخر نہیں کر سکیں گے کہ . . . . . ."

"میرے حساب سے ابھی بہت رات باقی ہے . . . . اور میں اب تک جاگتا رہا ہوں" میری آواز پھٹس تھی۔

"تو اب سو جاؤ . . . . تمہیں میری قسم، میری نیند بھر چکی ہے میں دوسرے کمرے میں بیٹھ کر کچھ پڑھوں گی" اس نے بتی بند کی اور اپنی کافی کی پیالی اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ میں پھر لیٹ گیا۔ کمزوری کا لمحہ گزر گیا تھا . . . . سو گیا۔

صبح اُٹھا تو دیکھا کہ وہ پھر میرے نزدیک کے بستر پر سو رہی ہے مگر اب اسے یہاں سونے

کا کوئی حق نہ تھا ...... وہ ہار چکی تھی۔

دوسرے دن میں سیما کے گھر گیا۔ اس کو ساتھ لانے کی کوشش کی تو سارے بہن بھائیوں بلکہ دو چار کزنوں کو اور لادنا پڑا۔

"آؤ تمہیں انار یا گنے کا رس پلائیں" میں نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے اس لونڈھار پارٹی سے کہا۔

"گنے کا رس یا کھیوں کا" اس نے ٹھیلے کے گرد منڈلاتی ہوئی مکھیوں کو دیکھ کر شرارت سے کہا مگر اتنا آہستہ کہ کوئی سن بھی لے اور بھی نہ سنے۔ اس کی یہ ادا بھی خوب ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا وہ کس سے کیا کہتی ہے، کس کو کیا جتاتی ہے کس سے کیا چھپاتی ہے۔ مجھے اتنا اہم فیصلہ کرنا ہے مگر نہیں معلوم کہ اس کے جی میں کیا ہے۔ رات کو اتنے بڑے اور خطرناک کھیل میں وہ جیت چکی ہے مگر اسے کانوں کان خبر نہیں۔ اسے اپنے کام سے کام، ہنسنے سے، بولنے سے، دوسروں کو ہنسانے سے سبھی اس کی باتوں پر ہنستے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں۔ میری بھی بس عزت ہی کرتی ہے مگر اکثر یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے دل کے چور کو جانتی ہے، جان کر انجان بنتی ہے مگر جتاتی بھی ہے کہ جیسے وہ جان گئی ہے مگر مانے گی نہیں یا شاید مان بھی لے گی مگر کوئی منوائے تو ..... اس کی بڑی بڑی سلگتی ہوئی آنکھیں جن کی اس کی ظاہرا شوخی کے ساتھ ذرا بھی مطابقت نہیں، اپنی الگ زبان میں کچھ ایسی ہی گول مول باتیں کہتی رہتی ہیں۔ بہر حال آج تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

میں سب کو اپنے کمرے پر لے گیا۔ دو کمروں اور ایک کچن کا چھوٹا سا سوئٹ۔ ناہید نے اس طرح ان سب کا خیر مقدم کیا جس طرح کوئی بڑی عمر کی گھروالی اپنے میاں کے چھوٹے بہن بھائیوں کا کرتی ہے۔ بڑے سلیقے، رکھ رکھاؤ سے سب سے ملی۔ ہر ایک سے اس کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ میں سب کو اس سے مانوس کرانے لایا ہوں

اور میں اس کو دیکھ رہا تھا جو چھوٹے چھوٹے پُر مذاق فقرے کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ فقرے کچھ اوپری اوپری لگ رہے تھے اور اس کی سلگتی ہوئی آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جب ناہید ان سب کے لئے کافی بنانے کچن میں چلی گئی تو میں نے اس سے کہا "سیما میرے بیڈ روم سے فیض کی تازہ کتاب تو اُٹھا لاؤ۔ شاید میرے بستر پر پڑی ہوگی" وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

باتیں ہوتی رہیں۔ کسی نے اُٹھ کر ریکارڈ پلیئر آن کر دیا۔ دو ایک لڑکیاں ناہید کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ صرف میں نے ہی محسوس کیا کہ سیما بہت دیر تک باہر نہیں آئی۔ میں چپکے سے اُٹھ کر اندر گیا۔ وہ میرے بستر پر بیٹھی تھی "دستِ تہہ سنگ" سامنے کھلی پڑی تھی مگر وہ اُسے پڑھ نہیں رہی تھی بلکہ سامنے والے بستر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی جو آج سے پہلے کبھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ پٹی سے پٹی ملے ہوئے ان پلنگوں پر غور کرتے ہوئے شاید وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اضافہ بہت تازہ ہے ایک پلنگ پر سرخ پلنگ پوش تھا دوسرے پر سیاہ اور یہ ان میل بے جوڑ پلنگ پوش بذاتِ خود ایک داستان تھے۔

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اس کی سلگتی ہوئی آنکھوں میں شعلے سے ناچ کر بجھ گئے۔ میں نے اس سے کہا "سیما شاید تمہیں معلوم ہو، ایک زمانے میں میں نے ناہید کو پرپوز کیا تھا۔۔۔۔ وہ اسی سلسلے میں یہاں آئی ہے مگر۔۔۔ اب میں چاہتا ہوں کہ وہ واپس چلی جائے۔۔۔۔۔ بھیج دوں؟"

اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا "یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

"نہیں، وہ جس زندگی کی عادی ہے اسے بدلنا اب اس کے لئے مشکل ہے۔ وہ صرف میری خاطر یہ قربانی کر رہی ہے مگر اب شاید میں اس کا اہل نہیں۔ میں آج اسے یہ بات بتا دوں گا۔"

سیما کے چہرے پر جو بشاشت آئی وہ واضح تھی۔ میں نے اس کے سر پہ ہلکی سی دھول

جما کہ کہا، "مگر اس کا خیال رکھنا کہ میں تمہارے چچا کے برابر ہوں،" وہ ہنس دی مگر اس نے نظریں نہیں اُٹھائیں۔ کاش میں دیکھ سکتا کہ اس کی سلگتی ہوئی آنکھوں میں اس وقت بھی پھول کھلے یا نہیں۔

اس سب ہنگامے کے ٹل جانے کے بعد میں نے ناہید کو بتایا کہ ہوٹل میں کمرہ بک کرانے کے بجائے میں، ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ بک کرا آیا ہوں۔ اسے ذرا بھی شاک نہ ہُوا۔

"یہ فیصلہ تم پہلے کر چکے تھے۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں کل رات۔۔۔۔" اور میں نے اسے ساری بات سچ سچ بتا دی۔

وہ نہ روئی نہ جھینکی۔ اچھے دوستوں کی طرح ہم نے ہاتھ ملایا اور وہ جہاز میں بیٹھ کر چلی گئی۔

سیما کی عادتیں ویسی ہی ہیں۔ چست ہنسانے والے فقرے اسی ادا سے کہے جاتی ہے مگر آنکھیں آج بھی سلگتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایک بستر پر بیٹھے ہوئے دوسرے بستر کے پلنگ پوش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ حالانکہ اب ان دونوں پلنگوں کے پلنگ پوش ایک سے ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ کیا سوچتی ہے۔ وہ سُرخ پلنگ پوش کی رات اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے جسے وہ ناہید کی رات سمجھتی ہے حالانکہ وہ سراسر اس کی اور میری ملن کی رات تھی۔ آج تک اس نے اس کی بابت کچھ نہیں پوچھا، شاید پوچھے گی بھی نہیں۔ میں نے بھی اُسے کبھی نہیں بتایا۔۔۔۔ بتاؤں گا بھی نہیں۔۔۔۔ اگر میں نے اسے بتایا اور اس نے یقین نہ کیا تو چُپ کا بھرم بھی گیا۔
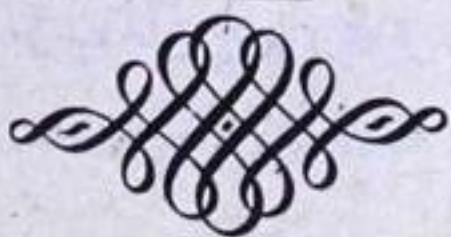
اُڑان

قبرستان کی دیوار کے نزدیک ایک خاموش سایہ سا کھڑا تھا۔ نزدیک سے گزر ہوا تو اس نے مجھے سلام کیا۔

"میں نے کبھی اس سے پہلے آپ کو نہیں دیکھا۔"

"میری قبر یہاں سے خاصی دور ہے، میں نے سوچا کوچ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ سارے قبرستان کا چکر لگایا جائے۔"

"کوچ! کہاں؟"

"کہیں بھی، سفر ہے شرطِ مسافر نواز بہتیرے"، جواب میں پُراسراریت سی تھی۔

"آپ کو سیر کا شوق رہا ہے؟"

"جنوں کی حد تک"

"کون کون سی جگہیں دیکھی ہیں آپ نے" میں نے مشتاقانہ پوچھا۔

"پہلے آسمان سے لے کر پہلی پاتال تک کی ساری جگہیں۔ اس سے آگے جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"آپ خوش مذاق ہیں"، میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ کو یقین نہیں آ رہا، آ بھی کیسے سکتا ہے..... بات صرف اتنی ہے کہ مجھ میں بچپن ہی میں اڑنے کی پُراسرار قوت پیدا ہو گئی تھی۔"

"معاف کیجیے، تجسّس میری کمزوری ہے، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو پوچھوں کہ یہ قوت کب اور کیسے پیدا ہوئی؟"

"لمبی کہانی ہے۔ ۔ ۔ ۔ آیئے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں، ایک تو اس قبرستان میں درخت اتنے کم ہیں، چلئے وہاں سہی" دور ایک بل کھاتا، نازک سا درخت تھا ہم اس کی چھدری چھدری چھاؤں میں دُو تو دوں پر جا بیٹھے۔

"ہوا یہ کہ بچپن میں ایک مرتبہ ایک اونچے زینے پر سے لڑھک جانے کے سبب میرے سر کی ساری ہڈیاں چٹخ گئیں۔ اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کم عمری کی وجہ سے وقت کے ساتھ ہڈیاں خود بخود جڑ جائیں گی، ان پہ پلاسٹر چڑھانے کی ضرورت نہیں مگر انہوں نے مجھے ہسپتال میں زیر نگرانی رکھا۔ خدا کے فضل سے ہڈیاں ٹھیک ٹھاک جڑ گئیں مگر ہسپتال کے قیام کے ابتدائی دنوں ہی میں شدتِ تنہائی اور اڑنے کی بے پناہ خواہش کی وجہ سے مجھ میں یہ قوت پیدا ہو گئی۔ پرندوں کی طرح اُڑ کر میں نے جی بھر کر سیر کیں۔"

"خوب" میں نے اُس کی بات سے مسحور ہو کر کہا۔

"آپ نے کبھی ہوا جہاز کا سفر کیا ہے؟"

"کئی مرتبہ۔" میں نے کہا۔

"کیسا لگتا ہے آپ کو؟"

"اچھا، بہت اچھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ بنگلہ دیش جاتے ہوئے ہمارا جہاز گیا شہر پر سے گزرا وہی گیا جہاں گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ اس وقت کھڑکی سے ایورسٹ کی چوٹی بالکل سامنے نظر آ رہی تھی۔ ہو بہو تصویر کی طرح یہ منظر میلوں ہمارے سامنے رہا، اور مجھے اتنا لطف آیا کہ بیان سے باہر۔"

"بالکل ٹھیک! آپ کو تو تجربہ ہے کیسی ساری زمین آنکھوں کے سامنے پھیل سی جاتی ہے۔ ہر چیز آپ بیک وقت دیکھ رہے ہیں۔ پہاڑ بھی، دریا کے چوڑے چوڑے پاٹ بھی، میدان بھی، سڑکیں بھی اور آتے جاتے شہر بھی۔ اس سے بھی بلندی پہ ہوں تو ساری دنیا یوں نظر آتی

ہے کہ یہ امریکہ ہے، یہ یورپ، یہ بحر اوقیانوس ہے اور یہ بحر الکاہل اور یہ منّا سا نقطہ انگلستان' اور یہ پاکستان۔"

"مگر اتنی بلندی سے یہ سب دیکھنے کے لئے تو بہت تیز نگاہوں کی ضرورت ہو گی؟"

"ہم ہر چیز آنکھوں ہی سے تو نہیں دیکھتے، بہت کچھ اپنے جانے بوجھے علم اور تجربے سے بھی تو دیکھتے ہیں۔ دیکھنے اور پہچاننے میں تو فرق ہوتا ہے۔"

"آپ نے درست کہا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قوتِ پرواز بذاتِ خود کتنی خوبصورت چیز ہے۔ میری تو خواہش ہے کہ ہر انسان کو یہ طاقت مل جائے۔"

"ایک بات تو بتایئے کہ جب آپ نے اپنی اس پُراسرار صلاحیت کا ذکر دوسروں سے کیا تو انہوں نے کیا کہا؟"

"شروع میں تو میں نے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ باوجود کم عمری کے مجھ میں یہ عقل تھی کہ دوسرے لوگوں کے لئے اس بات کو سمجھنا آسان نہیں ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر مجھے گھر جانے کی اجازت ہی نہ دیں۔ آخر ڈاکٹر مطمئن ہو گئے اور مجھے گھر بھیج دیا گیا۔ مگر جب میں نے اپنی پروازیں شروع کیں تو امی کو کچھ شبہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتیں "ضرور تمہارے دل میں کوئی بات ہے، مجھ سے نہ چھپاؤ، میں تمہاری ماں ہوں۔" میں نے انہیں سالوں ٹالا مگر ایک دن ان کے اصرار پر میں نے ساری بات انہیں بتا دی۔ ہوا وہی جس کا ڈر تھا۔ وہ رونے لگیں اور بلک بلک کر کہنے لگیں۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مگر ڈاکٹر مانتا ہی نہ تھا، ہائے اب کیا ہو گا۔"

میرے احتجاج کے باوجود وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے مجھے دوبارہ ہسپتال میں داخل کیا، سینکڑوں ٹسٹ ہوئے اور نہ جانے کتنی دوائیں دی گئیں۔ ڈاکٹر سے

میری مستقل بحث ہوتی کہ اڑنے کی قوت بیماری نہیں ہو سکتی مگر وہ بالکل ٹس تھا مجھے تو
وہ ذہنی بیمار لگتا تھا، اس کے لئے ان باتوں کو سمجھنا واقعی مشکل تھا۔ وہ تو وہ امی جب
بھی میری سیر کے قصے سنتیں فوراً رونا شروع کر دیتیں۔ آخر میں نے بہانہ سازی شروع کی،
گویا مجھے علاج سے فائدہ ہو رہا ہے۔ ہسپتال کے کمرے میں تنہا رہتے ہوئے مجھے یوں
تو پرواز میں آسانی ہو گئی تھی۔ بعض اوقات رات رات بھر میری سیریں جاری رہتیں مگر اب
ان کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا میری عادت ہو گئی۔ امی کو پتہ چلا کہ میری پروانکی قوت
یا دوسرے الفاظ میں میرا وہم ختم ہو گیا ہے تو انہوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان
وہی ہے جو دو ٹانگوں پر چلے، اڑنے والا انسان نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر بھی جلد مطمئن ہو گیا اور اس نے مجھے دوبارہ ہسپتال سے جانے کی اجازت دے
دی۔ اب امی نے میرے لئے ایک ساتھی کی تلاش شروع کر دی۔ بندھن میں باندھے جانے
سے پہلے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ دیکھو اپنے اڑنے وڑنے کی بات کسی سے نہ کرنا میری
بات یاد رکھنا ورنہ پچھتاؤ گے ساری عمر تمہارا پیچھا کریں گے اور بگڑی بات پھر نہ بن
سکے گی۔ میں نے امیؔ کے کہنے پر عمل کیا، اُڑنے کی بات چھُپانے کی تو یوں بھی مجھے
عادت ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے کی بہ نسبت اپنی پروازیں بھی بہت کم کر دیں، پھر بھی
امیؔ کی طرح ساتھی کو بھی کہہ ید لگ گئی کہ مجھ میں کوئی کمی یا زیادتی ضرور ہے۔ ایک رات
اس نے اپنے بندھن کے واسطے دے کر کہا۔

"دیکھو ساتھیوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہونا چاہیئے، ساتھی وہ ہوتا ہے جو اچھے کا
بھی ساتھی ہو اور بُرے کا بھی۔ تم مجھ سے کوئی بات قطعی نہ چھپاؤ۔"

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ اس نے سب کچھ بڑے صبر و تحمل سے سنا اور کچھ نہ
کہا... مگر رفتہ رفتہ مجھے اس کے رویئے میں فرق محسوس ہونے لگا جیسے پانی کا جہاز چلنا شروع
ہو تو احساس نہیں ہوتا مگر کنارہ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی دور نکل آیا ہے، اسی طرح غیر

محسوس طور پر ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا رہا۔ دن گزرتے رہے یکسانیت سے اُکتا کر میں نے اس سے کئی دفعہ کہا۔

"کچھ تم بھی تو اپنے قصے سناؤ۔ کوئی آپ بیتی یا جگ بیتی، پرانے سوز ساز کی، گئی رُتوں کی باتیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ تمہارا تو ایمان ہے کہ ساتھیوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہونا چاہیئے"

اس نے جواب میں لاپرواہی سے کہا۔ "میری زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جو بتائی جائے، وہ تو پنسل کی سیدھی سپاٹ لکیر کی طرح ہے جس میں نہ کوئی دلکشی ہے نہ رنگ۔"

چند دن بعد ہی کی بات ہے، میری نیند ہمیشہ بہت گہری ہوتی تھی۔ خدا جانے اس رات کیسے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ سونے سے پہلے ساتھی نے اپنے چہرے سے ایک ماسک اتار کر الگ رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر مندمل زخموں کے بے شمار نشانات تھے جو اتنے عرصے اس نے ماسک کے پیچھے چھپائے رکھے تھے۔ اس کی زندگی سیدھی سپاٹ لکیر نہیں ہو سکتی، اس میں ضرور کوئی راز ہے جو اس نے اب تک چھپا رکھا ہے، کیوں؟ یہ کیوں، مجھے گھلانے لگی۔

اس واقعہ کے بعد اس خول چڑھے چہرے کی میٹھی میٹھی باتیں مجھے زہر لگنے لگیں۔ جی چاہتا فوراً وہ نقاب اس کے چہرے سے نوچ کر پھینک دوں مگر میں نے ضبط کیا۔۔۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ ضبط آدمی کو دو نیم کر دیتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ ضبط کرنے سے نفرت کرنا آسان ہے!!! نفرت ایک منفی جذبہ ہے لیکن یہ ایک سیفٹی والو (VALVE) ہے۔ نفرت کا والو کھول دینے سے ضبط کے لاوے کی کھولن کم ہو جاتی ہے، ورنہ شاید آپ زندہ بھی نہ رہ سکیں۔ میں نے بھی یہی کیا۔ جب ضبط کی کھولن ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو میں نے نفرت کا والو کھول دیا مگر نفرت میرے مزاج کے موافق نہ تھی۔

بہت جلد میں نے فیصلہ کیا کہ کسی سے نفرت کرنے سے تو مر جانا بہتر ہے۔ آخر نفرتوں کے ساتھ جینے جلنے کا کیا جواز ہے!! سقراط نے سچائی کی خاطر زہر پیا تو کیوں نہ میں محبت اور رفاقت کی خاطر زہر پی لوں۔ یہ سوچ کر میں نے خود اپنے لئے زہر کا پیالہ بنایا۔ آپ نے

سقراط کے آخری لمحات کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا۔ سقراط کو زہر دینے والے شخص نے کہا تھا "جب زہر دل تک پہنچے گا۔ تو کام تمام ہو جائے گا۔" اور سقراط نے کہا تھا "زہر پینے میں وہ لوگ دیر کرتے ہیں جنہیں اس سے کوئی فائدہ ہو مگر میرے دیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کو مر جانے کی جلدی تھی، تبھی اس نے فوراً زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں سارا زہر چڑھا لیا۔ جس وقت سقراط نے زہر پیا اس کے پاس اس کے دوست اور غمگسار تھے جو اس کی موت سے سخت دل گرفتہ تھے اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے مگر میرے پاس کوئی بھی نہ تھا۔ سقراط کو اپنی دوسری زندگی کا کیسا یقین تھا.... وہ وہاں بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کپڑے پہنے، ننگے پاؤں، سچائی کی تلاش میں لوگوں سے سوال کرتا پھرے گا تب اسے مرنے کا کیا غم!!! مگر میں نے اپنے لئے جو زہر تیار کیا تھا وہ سقراط والا زہر نہیں تھا۔ یہ وہ زہر نہیں تھا جس سے جھٹ سے آدمی مر جائے.... جب زہر دل تک پہنچے تو اس کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ وہ زہر تھا جو مجھے پینا تھا اور پھر.. تمام عمر اس کے اثر سے زندہ رہنا تھا۔ یہ جھوٹ، مصلحت آمیزی اور زمانہ سازی کا زہر تھا۔ یہ وہ زہر تھا جو دن میں مجھے ہزار بار مارتا، میری پور پور رگ رگ میں سما جاتا تب بھی مجھے موت نہ آتی۔"

"تو کیا آپ نے وہ زہر پی لیا"؟

"جی ہاں، میں نے وہ زہر گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔ یقین کیجئے اس کا ایک ایک قطرہ نشتر بن کر لگ رہا تھا۔"

"پھر.... پھر کیا ہوا؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"نفرت کا جو زہر میرے اندر موجود تھا وہ اس قدر تیز تھا کہ یہ زہر جو میں نے پیا کارگر نہ ہوا۔" اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"پھر....؟" مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ اگر ابھی میری قوتِ پرواز باقی ہے تو کیوں نہ میں ایک

آخری کوشش کروں اور اس کے بل پہ دور، بہت دور ... زمین کی کشش سے باہر نکل جاؤں اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤں۔ ایسی ہی رات تھی جب کسی کو کچھ بتلائے بغیر میں نے گھر کی چھت پر سے اپنی پرواز شروع کی لیکن زہر کے اثرات سے میری قوتِ پرواز میں ضرور کوئی خلل واقع ہو گیا ہو گا اور میرا جسم راہ ہی میں بھاری پتھر کی طرح دھم سے گر گیا ہو گا کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو قبر کے اندھیرے میں پایا۔"

"تو اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری طبیعت اس ماحول سے اکتا گئی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اب یہاں سے بھی کوچ کیا جائے۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی، مجھے یقین ہے کہ اب میری قوتِ پرواز بحال ہو گئی ہے۔"

یہ کہتے کہتے اچانک اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور ہوا میں اڑنا شروع کر دیا۔ میں نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ گہرے کاسنی آسمان پہ نارنجی چاند ترازو کا پلڑا بنا ہوا یہیں جھول رہا تھا۔ دور آسمان پر ایک نقطہ اب بھی اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس طرف سے نگاہ ہٹا کر جب میں نے پیچھے دیکھا تو ایک سایہ قبرستان کی دیوار کے پاس اب بھی موجود تھا۔ اور قبرستان کا ماحول بے حد بوجھل بوجھل تھا۔

جب پھوپی کھوئی گئیں

کچھ واقعات بین الاقوامی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں جیسے عالمگیر جنگیں، کچھ ملکی تاریخ کا جیسے چھوٹے موٹے سیاسی انقلابات۔ کچھ واقعات خاندانی تاریخ کا جزو ہوتے ہیں جن کو گاہے بگاہے اسی طرح یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے دوسرے واقعات کو مثلاً یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب پھوپی کھوئی گئی تھیں۔ یہ ہمارے خاندان کا ایک تاریخی حادثہ ہے اور اس وقت کی بات ہے جب کراچی کا جغرافیہ بہت مختصر سا تھا۔ کراچی کے شاخسانے مختلف سوسائٹیوں کی شکل میں ابھی نہ نکلے تھے۔ کاریں انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں۔ بسوں میں نہ اتنا ہجوم ہوتا تھا نہ ان میں بیٹھنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔

سردیوں کے دن تھے اور شام کا وقت۔ ہم سب اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ تقی بھائی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"پھوپی آئی ہیں؟" انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

"کیسی پھوپی؟ کون سی پھوپی؟" اُلٹا سب ان ہی سے پوچھنے لگے۔ ہماری دو ہی تو پھوپیاں تھیں اور دونوں قطعی اس بات کی نااہل تھیں کہ کراچی جیسی جگہ میں تنہا سفر کر سکتیں۔ تقی بھائی کا زرد پڑا ہوا رنگ بالکل ہی اُڑ گیا۔ پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطرے دریا بن کر بہنے لگے۔

"بات کیا ہے پوری بات تو بتاؤ؟" منجھلی تائی نے پوچھا۔

اور تقی بھائی جیسے تیسے پھوپی کے کھوئے جانے کی داستان سنانے لگے۔ بڑے تایا کا کنبہ ان دنوں ڈرگ روڈ میں رہتا تھا اور کبھی بس سے اور کبھی ٹرین سے کراچی آیا جایا

کہتا تھا۔ آج بڑے تایا کو چھوڑ کر باقی سب لوگ بس سے آ رہے تھے۔ صدر پر اترے تو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ پھوپی نہیں ہیں بس جا چکی تھی۔ سارے گھر والے ڈر کے مارے واپس ڈرگ روڈ لوٹ گئے صرف تقی بھائی کو ریلوے اسٹیشن دوڑایا کہ بس کا آخری سٹاپ وہی تھا۔ وہاں بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ کسی آدمی نے کہا کہ اس نے ایک برقعہ پوش چھوٹی سی لڑکی کو تنہا اسٹیشن پر دیکھا تھا جو کسی ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔ وہاں سے تقی بھائی سیدھے یہاں آئے کہ شاید کسی طرح پھوپی یہاں پہنچ گئی ہوں مگر جب اُلٹا انہیں آڑے ہاتھوں لیا جانے لگا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ادھر سارے گھر والے ایک دم پریشان ہو اُٹھے۔ منجھلے تایا غصے کے تیز تھے۔ انہوں نے جوتے پہنتے ہوئے بیوی کو للکارا "لاؤ پیسے دو، میں اسے ڈھونڈنے جاؤں،" اور جب بیوی نے ڈرتے ڈرتے دس بیس روپے بڑھائے تو وہ پھنکارے۔ "یہ کیا دے رہی ہو ہو سکتا ہے مجھے پشاور تک جانا پڑے۔ نہ جانے کون سی گاڑی میں بیٹھ گئی ہو وہ ڈرگ روڈ میں رکتی بھی ہوگی یا نہیں اور رُکے بھی تو اس میں اتنی عقل ہے کہ وہاں اُتر جائے۔"

چھوٹی پھوپی بڑے اور منجھلے تایا دونوں سے چھوٹی اور ہمارے ابا سے بڑی تھیں ان کا صحیح قد کیا تھا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں البتہ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ٹھوس تری میں پڑا ہوا ہر بچہ وقتاً فوقتاً اپنا قد پھوپی سے ناپا کرتا تھا اور گیارہ بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان سے اونچا نکل جاتا تھا۔ ایک بات یہ یاد ہے کہ گھر کے کسی پلنگ یا کرسی پر بیٹھ جائیں تو ان کے پیر زمین سے اوپر ہی اوپر جھولتے رہتے تھے۔ بہن بھائیوں میں وہ واحد ہستی تھیں۔ جنہوں نے کچھ نہیں پڑھا تھا اور وہ خود ہی کہا کرتی تھیں کہ "اللہ میاں نے اتنا دماغ ہی نہیں دیا کہ کچھ پڑھتی لکھتی۔" مگر ہم بچوں کو یہ شبہ تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ سکتی ہیں۔ ہم نے اکثر ان کے ہاتھ میں اخبار، کتاب یا گھر میں آنے والے خطوط دیکھے تھے چونکہ وہ ان پڑھ مشہور تھیں۔ اس لیئے اس بات کو جھٹلانا نہیں چاہتی تھیں۔ خصوصاً جب کہ ہم بچے "پھوپی پڑھ سکتی ہیں"

کو باقاعدہ سلوگن کے طور پر ان کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ شادی ان کی اسی عمر میں ہوئی تھی جس عمر میں پہلے وقتوں میں ہوا کرتی تھیں۔ یعنی چودہ پندرہ کا سن ہو گا مگر پھوپی چند ماہ سے زیادہ سسرال میں نہیں رہیں۔ ایک مرتبہ جو اپنے سسرالی شہر سے واپس آ کر بیٹھیں تو پھر کبھی واپس نہیں گئیں اور جلد ہی پھوپا نے دوسری شادی کر لی۔ یہ تو ہماری یاد کا واقعہ تھا کہ جب پھوپا کا انتقال ہوا اور پھوپی کی چوڑیاں توڑنے کا سوال اُٹھا تو دادی نے کہا "اسے جانے بھی دو، اس بے چاری کا کیا سہاگ اور کیا بیوگی۔"

یوں پھوپھی کی ساری عمر بھائیوں میں گزری جہاں بھتیجے بھتیجوں کی ایک سے ایک شیطان نسل پیدا ہوتی تھی اور پھوپھی کے نتھنوں میں تیر پہناتی رہتی تھی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہم میں کسی نے بھی چھوٹی پھوپھی کو وہ عزت نہ دی جو پھوپھیوں کا حق ہے۔ بات یہ ہے کہ آنکھ کھولی تو ہم نے اپنے سے بڑے بہن بھائیوں کو ان پر ہنستے پایا۔ اب اس میں کچھ ان کا اپنا بھی قصور تھا بقول ہماری امی کے خواہ مخواہ بچوں سے اُلجھتی تھیں کہ آ بیل مجھے مار۔ ہماری نسل نے بھی ان سے وہی سب مذاق روا رکھے جو ہم سے بڑے کرتے آئے تھے۔ ان کے وقت بے وقت کھانے پینے پر، ان کے روپیہ جوڑنے پر، ان کے شوہر اور سوتیلے بچوں پر مذاق نسل در نسل چلتا رہا۔ اب مثلاً ہر پود انہیں اس بات پر چھیڑتی تھی کہ یہ جو وہ ہر وقت نمازیں پڑھا کرتی ہیں تو نماز کی کوئی سورت انہیں پوری اور صحیح یاد نہیں ہے۔ بعض بچے قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ انہوں نے پھوپھی کو تین سجدے کرتے دیکھا ہے۔ اب ایسی باتوں پر وہ مارنے کو نہ دوڑتیں تو کیا ہم پر پھول برساتیں۔

دادی اماں مرحومہ کو جب کبھی ان کے بیٹے پیسے دیتے ہوں گے ان ہی میں سے کچھ وہ بیٹی کو دے دیتی ہوں گی۔ وہی زنگ کھائے، گھنیائے ہوئے سیاہ زنگ پیسے اب تک ان کے ٹرنک کے کسی کونے میں رکھے تھے جس کی کنجی وہ سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں مگر بندہ بشر آخر غلطی کا پتلا ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ کنجی کسی کے ہاتھ لگ جاتی اور ہم سب یہ اعلان کر دیتے

کہ ہم نے پھوپھی کا سارا خزانہ نکال لیا ہے اور پھر وہ تو تکا ر مچتی کہ سارا محلہ سنتا۔ پھوپھی اپنا ٹرنک دیکھے بغیر ہم سب کو کوس کاٹ کر ڈھیر کر دیتیں یہ سب اس وقت ہوتا جب کوئی مرد گھر میں نہ ہوتا۔ امی کبھی ہمیں ڈانٹیں کبھی نند کے نتے لیتیں کہ تم بھی بچوں کے ساتھ بچی بن جاؤ ہو۔ آخر گھنٹہ بھر کی چخ چخ کے بعد کوئی بڑا بہن بھائی دخل دیتا تو کنجی پھوپھی کو واپس ملتی اور وہ کچھ ہنستی کچھ روتی جا کر ٹرنک کھول کر اپنا اطمینان کرتیں۔ ان کے نماز کے اوقات پر بھی ان سے چھیڑ رہتی۔ وہ اول وقت نماز پڑھنے کی اس حد تک قائل تھی کہ اکثر ایسا ہوا کہ عصر کی اذان ہوئی تو معلوم ہوا کہ پھوپھی مغرب کی نماز بھی نمٹائے بیٹھی ہیں۔ اب کوئی انہیں سنجیدگی سے بھی سمجھاتا تو وہ ہرگز ماننے کو تیار نہ ہوتیں۔ ایک دن غصے میں جل کر کہہ اٹھیں "واہ واہ یہ خوب رہی۔ اگر کسی دن سورج نہیں ڈوبے گا تو کیا مغرب کی نماز ہی نہیں ہوگی۔"

یہ تھیں ہماری چھوٹی پھوپھی کہ جب برقعہ اوڑھ کر ہمارے ساتھ ساتھ چلتیں تو سب سے چھوٹی بہن دکھائی دیتیں۔ منجھلے تایا کے جانے کے بعد منے بھائی ریلوے ٹائم ٹیبل لے کر بیٹھ گئے یہ دیکھنے کہ پھوپھی کون کون سی گاڑیوں میں بیٹھ سکتی ہیں۔ ہمارے ابا اس وقت اپنے کمرے میں اوپر تھے وہ خبر سنکر گم سم مراقبے میں چلے گئے کہ ایسی پریشانی کے وقت وہ کسی کام دھام کے نہیں رہتے تھے۔ ان کی اپنی حالت غیر ہو جاتی تھی اور امی اصل مسئلہ بھول کر ان کی دیکھ ریکھ میں لگ جاتی تھیں۔ پھر منے بھائی اچانک اٹھے اور جوتے پہن کر وہ بھی پھوپھی کی تلاش میں نکل گئے اور ہم سب بچوں پر جو اس وقت تک بغیر کھائے پئے بستروں میں دبک گئے تھے بڑا ہنسی کا دورہ یہ سوچ سوچ کر کہ پھوپھی نے کیسے کیسے ڈرامے کئے ہوں گے وہ بغیر ٹکٹ پشاور یا کوئٹہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئی ہوں گی اور جب ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا ہوگا تو انہوں نے کیا جواب دیا ہوگا۔ پھوپھی کو ہمارے بڑے تایا نے جو ان معاملات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ سینکڑوں ہی مرتبہ اپنے اور نزدیکی عزیزوں کے گھروں کے پتے یاد کروائے ہوں گے مگر وہ ان کے ذہن سے یوں پھسل جاتے تھے جیسے چکنے پتے پر

سے پانی کی بوند۔ اب کسی بھلے مانس نے ان سے ان کے گھر کا پتہ یا بھائیوں کے نام پتے پوچھے ہوں گے تو انہوں نے کیا کہا ہوگا، ہمیں یقین تھا کہ پھوپھی کو اپنے بھائیوں کے نام بھی بڑے بھائی منجھلے بھائی اور "بکی" میاں سے آگے یاد نہ تھے۔ اس سلسلے میں جتنی مضحکہ خیز صورت حالات ممکن تھیں۔ ہم باری باری ان سب کا تصور پیش کرتے اور ہنستے اور کوئی ایسی ویسی ہنسی، اس قدر والہانہ اور بے قابو کہ سانس پیٹ میں نہ سماتا۔ آخر منجھلی تائی جانماز پر سے اٹھ کر آئیں اور ہمیں ڈانٹا۔

"شیطانو! یہ وقت ہنسنے کا ہے یا رو رو کر دعائیں مانگنے کا، کہ ہماری پھوپھی کو ساتھ خیریت کے گھر پہنچائے۔" وہ تو یہ کہہ کر دوبارہ مصلے پر جا بیٹھیں مگر یہاں تو شیطان سوار تھا جو اتنی آسانی سے اترنے والا نہ تھا۔ ناصر نے لمحہ بھر میں سر پر پگڑ باندھ جانے کہاں سے تسبیح نکال لی اور ورد کرنے لگا "یا اللہ ہماری پھوپھی کو خیریت سے گھر پہنچا"۔ اس کا لہجہ کم بخت ایسا تھا۔ کہ ہنسی روکتے روکتے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ادھر گڈو وہیں پلنگ پر سجدہ ریز ہوگیا اور پھر ہاتھ پھیلا کر دعائیں مانگنے لگا "یا مولیٰ ہماری پھوپھی کو ہمارے گھر کا نمبر یاد دلا دے اور محلے کا نام بھی اور ملک کا نام بھی ایسا نہ ہو کہ کوئی منحوس انہیں انگلستان پہنچا دے"۔ سلیمہ نے فوراً انگوٹھی رگڑ کر جن کو بلایا اور حکم دیا "ہماری چھوٹی پھوپھی کو دنیا کے جس کونے میں بھی ہوں فوراً حاضر کرو، ورنہ اے جن تمہاری گردن ماردی جائے گی"۔ ان بے تکی باتوں پر کہ جن کا سر تھا نہ پیر ہنسی تھی کہ سانس نہ لینے دیتی تھی۔ اب یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ بچپن میں کیسی کیسی سنجیدہ باتوں پر ہنسی آتی ہے اور کیسی گھر گھر کر آتی ہے کہ ڈانٹ پھٹکار سے بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ کہتے ہیں جب میدان جنگ میں کسی سپاہی کے گولی لگتی ہے تو پاس کھڑا ہوا سپاہی آپ ہی آپ مسکرا اٹھتا ہے یہ جان کر کہ یہ میں نہیں تھا جس کے گولی لگی۔ شاید ہماری ہنسی بھی اسی قسم کی ہنسی تھی جس میں یہ طرب انگیز جملہ چھپا ہوا تھا "خدا کا شکر ہے یہ ہم نہیں تھے جو کھوئے گئے"۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ پہلے بھی ہم اسی طرح بے لگام ہنستے چلے گئے۔ یہ وہ دن تھا جب ریڈیو پر اعلان ہوا تھا کہ کراچی کے نزدیک سمندر میں طوفان آنے والا ہے اور کراچی کو زبردست خطرہ لاحق ہے سنا ہے کچھ اہلِ دل اس رات ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کراچی کو خیرباد کہہ گئے تھے۔ اس دن بھی ہمارے بڑوں نے جانمازیں اور تسبیحیں سنبھال لی تھیں اور ہم بچوں نے تخیل کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے تھے۔ شاید اس رات ہم ہنس ہنس کر اُس خوف کو دور بھگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اندر سے ہماری روحوں کو منجمد کر رہا تھا۔

جب رات گہری ہونے لگی تو سب سے پہلے منے بھائی اپنی تلاش سے بے نیل و مرام لوٹے۔ ابا لشتم پشتم کوٹھے پر سے اتر کر پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ شکل سے پرانے بیمار نظر آرہے تھے۔ منجھلی تائی اور امی اپنے اپنے بستروں پر صورت تصویر بیٹھ گئیں۔ تب ہم بھی ایک دوسرے میں گھس کر چپ چاپ پڑ گئے کہ اب ہنسنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اسی طرح پڑے پڑے جانے کب سو گئے کہ ذرا ہنگامے سے آنکھ کھلی۔ گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ بڑے تایا چھوٹی پھوپھی کے ساتھ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ پھوپھی کسی نہ کسی طرح ڈرگ روڈ میں اپنے گھر پہنچ گئی تھیں۔ ان دنوں کی طرح گھر گھر ٹیلیفون نہیں تھا۔ تایا یہ سوچ کر کہ رات بھر سب پریشان رہیں گے خود ہی پھوپھی کو لے کر یہاں آگئے تھے۔ امی تایا اور پھوپھی کے لئے کھانا نکالنے چلیں تو چلتے چلتے ہم سے بھی کہا "بچو! اٹھو کھانا کھالو، پھوپھی آگئی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد منجھلے تایا لوٹے۔ اپنی روئیداد تو انھوں نے نہ سنائی ہلے کر پھوپھی کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ کیسے گھر تک پہنچیں۔ پھوپھی نے اُس غبی طالب علم کی طرح جو غلط جواب دینے کے ڈر سے چپ رہ کر سارا دن پٹنے کو ترجیح دیتا ہے چپ سادھ لی۔ ادھر منجھلے تایا رہ رہ کر ایسے دھاڑتے کہ ہم سب لحافوں میں دُبکے قل پڑھنا شروع کر دیتے۔ ادھر

پھوپھی رو رو کر دوپٹے سے منہ اور ناک پونچھے جاتیں مگر ہرگز منہ سے کچھ نہ بولتیں۔ بڑے تایا اور ابا خاموش بیٹھے تھے کہ منجھلے تایا کے غصے کے آگے کسی کی پیش نہ جاتی تھی۔ وہ تو تائی سر پر کفن باندھ آگے بڑھیں اور بولیں "قصہ بعد میں سن لیجئے گا ان کو کھانا تو کھا لینے دیجئے اور آپ بھی کھانا کھا لیجئے منہ ہاتھ دھو کر۔"

منجھلے تایا غصے میں پیر پٹختے غسل خانے میں چلے گئے۔ تائی نے چھوٹی پھوپھی کو دودھ کا ایک پیالہ پلا کر جھٹ بستر میں لٹا دیا کہ کہیں پھر سے عدالت نہ بیٹھ جائے۔ بڑے تایا کو اور ابا کے ساتھ سلا دیا گیا کہ اب کہاں رات کو جاتے پھریں گے اور ہم سب بغیر کھانا کھائے جیسے بڑھے یا نکے جہاں پڑے تھے وہیں سو گئے۔

صبح اٹھے تو حالات نارمل تھے۔ بڑے تایا ابا کو لے کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ منجھلے تایا شیروانی پہن کر بنک کے کسی کام سے جا چکے تھے منے بھائی اپنے دفتر سدھار چکے تھے۔ ہم نے پھوپھی سے اپنے گم ہو جانے کی داستان سنانے کو کہا تو خلافِ توقع انہوں نے سارا قصہ سنا دیا۔ "جب اسٹیشن کے بس اسٹینڈ پر سارے مسافر اتر گئے اور بس کنڈکٹر نے پوچھا اے منی تجھے کدھر جانا ہے تو بس گھبرائی اور گھبرا کر وہیں اتر گئی۔ میں نے سوچا کہ بس سے جاؤں تو پتہ ملے نہ ملے اس سے اگر میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں تو ڈرگ روڈ پر اتر کر گھر جا سکتی ہوں تو بھیا میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔"

"مگر تمہیں کیسے پتہ تھا کہ یہ گاڑی ڈرگ روڈ پر ٹھہرے گی؟"

"ہاں مجھے پتہ تھا" پھوپھی نے فخر سے کہا "یہ وہی تو گاڑی تھی جس کے پہنچنے پر میں روز مغرب کی نماز پڑھا کرتی ہوں۔"

"اچھا پھر ڈرگ روڈ پر بغیر ٹکٹ نکلیں کیسے؟"

"بغیر ٹکٹ کیوں! میرے پاس ٹکٹ تھا۔"

"اچھا! وہ کس نے دلوایا؟"

"میں نے خود لیا۔۔۔ میرے پاس پیسے تھے اماں کہا کرے تھیں کہ باہر جاتے وقت تھوڑے سے پیسے پلّو میں باندھ لیا کرو۔"

"اچھا! پھر کیا ہوا؟"

"بس اسٹیشن سے باہر نکلی تو ایک رکشہ کھڑی تھی میں نے وہ لی اور اپنے گھر پہنچ گئی۔"

"مگر گھر کا پتہ کیسے بتایا آپ نے؟"

"وہ تو خیر مجھے نمبر بھی یاد تھا مگر میں نے پی۔اے۔ایف اسکول کا کہہ دیا، اس کے پاس ہی تو ہے گھر وہیں پہنچ کر میں نے رکشہ والے سے کہا کہ "بھیا! میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اندر سے بھجوائے دیتی ہوں وہ بولا کوئی بات نہیں اماں۔"

"اماں کہا یا بیٹی؟ آپ کو برقعے میں دیکھ کر آج تک تو کسی نے اماں کہا نہیں۔"

پھوپھی مسکرائیں "میں نے کراچی اسٹیشن پہ ہی نقاب اُلٹ دی تھی کہ لوگ میرے سفید بال دیکھ لیں اور مجھے بچی نہ سمجھیں اور میں نے چپکے سے اپنی چوڑیاں اتار کر دوپٹے کے پلّو میں باندھ بغل میں داب لی تھیں۔ اماں کہا کرے تھیں چور اُچکوں کو سونے کا بڑا لالچ ہووے ہے" اس وقت ان کے چہرے پہ فتح کی وہ سرخی تھی جو کسی جرنل کے چہرے پر کوئی بڑی جنگ جیتنے کے بعد ہوتی ہوگی۔

"ہُرّا۔ چھوٹی پھوپھی! ہپ ہپ ہُرّا۔" ہم لوگوں کے نعروں نے ہمیشہ کی طرح گھر سر پر اُٹھا لیا اور ہمیشہ کی طرح خوب ڈانٹ کھائی۔

اور پھر اس دن ہمیں پتہ چلا کہ پھوپھی اتنی بے وقوف تھیں نہ اتنی ڈرپوک جتنا ہم نے انہیں سمجھ رکھا تھا ساری عمر وہ اس جوکر کا پارٹ ادا کرتی رہیں جسے منہ پہ بھبوت ملے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے، بڑا سا جوتا پھٹپھٹاتے نہ دیکھیں تو مزا نہیں آتا۔ وہ پتے اس لئے بھول جاتی تھیں کہ سب نے طے کر رکھا تھا وہ پتے یاد ہی نہیں رکھ سکتیں۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس لئے نہیں جا سکتی تھیں کہ ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ تنہا کہیں آجا سکتی ہیں۔

ہم نے بغیر آزمائے انہیں ایک چھوٹا سا بچہ سمجھ لیا تھا اور وہ بخوبی اپنا کردار نبھا رہی تھیں۔ وہ وہی کرتی تھیں جس کی توقع ان سے کی جاتی تھی اور ان ہی پر کیا موقوف ہے، ہماری اکثر بڑی بوڑھیوں کے ساتھ یہی رویہ رکھا جاتا تھا یہ طے شدہ امر تھا کہ وہ بھائی یا شوہر کے بغیر آجا نہیں سکتیں، کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ ساری زندگی ہماری چھوٹی پھوپھی کی طرح کھوتی رہتی تھیں اور خوش رہتی تھیں کہ انہیں جو پارٹ دیا گیا ہے وہ اسے بخوبی انجام دے رہی ہیں۔

آج عورت نے اپنے آپ کو اس طرح دریافت کر لیا ہے۔ جس طرح پھوپھی نے خود کو اس گم ہو جانے والے دن پا لیا تھا مگر اس کے بعد بھی زندگی کے باقی دن پھوپھی نے پہلے ہی کی طرح گزارے جس طرح آج بہت سی عورتیں اپنے آپ کو دریافت کر لینے کے بعد بھی زندگی کے دن مردوں کے تحفظ کے سائے میں عافیت و آشتی سے گزارنا چاہتی ہیں اور ظاہر نہیں کرتیں کہ انہیں اپنے گھر کا پتہ خوب یاد ہے انہیں خوب معلوم ہے کہ کون سی گاڑی کس وقت چلتی ہے اور کہاں پہنچاتی ہے۔
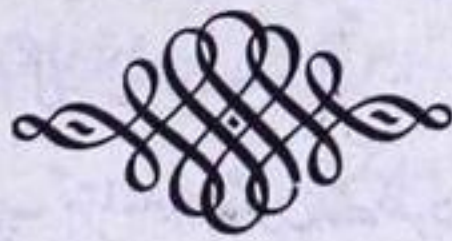
رنگ، کینوس اور نقاد

اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ قلم کر دے۔

آنکھیں بند کرتا تو لمحہ بھر میں مکمل تصویر، ساری لکیروں اور پورے رنگ و آہنگ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے چوکھٹے میں آکر فٹ ہو جاتی۔ چوکھٹا جو بالکل صحیح ناپ کا گولڈن مستطیل ہوتا۔ اس میں کوئی اچھوتا موضوع رنگ اور لکیروں میں ڈھل کر یوں سامنے آتا کہ وہ پھڑک اٹھتا۔ یہ پینٹنگ اگر جوں کی توں بن جائے تو! کبھی آنکھیں بند کرتا تو اس صحیح ناپ کے سنہری مستطیل پر ایسے خوش رنگ لہریئے لہراتے کہ وہ جھوم اٹھتا اور انہیں رنگ بہ رنگ حافظے میں محفوظ کر لیتا۔ پھر آنکھیں کھول کر چاہتا کہ انہیں جوں کا توں پینٹ کر لے۔ مگر جیسے ہی وہ آنکھیں کھولتا۔ سب کچھ فنا ہو جاتا۔ حافظے کی مدد سے وہ پینٹ کرتا مگر بات نہ بنتی پینٹنگ کی روح غائب ہو جاتی صرف رنگ رہ جاتے۔ خدا معلوم اس کے ہاتھ دھوکا دے رہے تھے یا ذہن دھوکا دے رہا تھا۔ اسے غصہ ہاتھوں ہی پر آتا تھا۔ یہی غدار ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جو تصویر اس کی آنکھوں کے پردے پر ابھرتی ہے جوں کی توں منتقل نہ ہو سکے۔

اور ابھی بند آنکھوں اور کھلی آنکھوں کی یہ جنگ جاری تھی کہ اس کی نظر بہت تیزی سے زائل ہونے اور رنگوں کی پہچان کھونے لگی۔ اس کی پریشانی کی حد نہ رہی۔ اس نے تو زندگی میں اور کچھ نہ کیا تھا۔ سوائے رنگوں سے کھیلنے کے۔ اس کا کام بھی یہی تھا۔ اس کی تفریح بھی یہی تھی۔ اگر رنگ اسے دغا دے گئے تو وہ کیا کرے گا۔ وہ دن رات پینٹنگ بنانے لگا۔ وہ وقت سے، خود سے اور خدا سے لڑ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ بینائی ختم ہونے سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ پینٹنگز بنالے اور آنکھوں کو وہ جس قدر اندھا دھند استعمال کر رہا تھا، ان کی روشنی

اسی تیزی سے اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کو مکمل آرام دے اور ان پر بالکل زور نہ ڈالے لیکن جس طرح بلانوش شراب کے آخری گلاس کا آخری قطرہ تک پی جانا چاہتا ہے، وہ اپنی بینائی کی آخری شعاع تک اپنی پینٹنگ میں جذب کر دینا چاہتا تھا۔ اب اس کے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ جو کچھ بنانا چاہتا ہے۔ وہ بن بھی رہا ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کمال کس کو حاصل ہوا ہے۔ اگر اسے کسی حد تک کامیابی ہو جاتی ہے تو یہی بہت ہے۔ اگر لوگ اس کے اسی کام کو سراہتے ہیں تو وہ کیوں بتائے کہ اس کی نظر میں اس کی ہر تصویر ادھوری اور ناکام ہے۔

اور پھر اس نے اپنی آخری نمائش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جس میں اس کی تیس نئی پینٹنگز ہوں گی۔ اس نے تیس کینوس تیار کر کے اپنے اسٹوڈیو میں چاروں طرف رکھ دیئے اور پرانا سارا کاٹھ کباڑ نکال دیا۔ اب وہ دل جمعی سے کام کرے گا۔ اس کا موضوع آنکھیں ہوں گی۔ بصارت اور بصیرت۔ وہ ملٹن کو پینٹ کرے گا۔ آنکھیں جانے سے پہلے اور آنکھیں جانے کے بعد۔ بینائی کھونے سے پہلے بے چین اور مضطرب اور بینائی کھونے کے بعد مطمئن اور پرسکون۔ مگر کیا یہ ممکن ہے۔ نہیں۔ جوں جوں اس کی بصارت زائل ہو رہی تھی، اس پر اضطراب اور خوف کا ایک عجیب عالم طاری ہو رہا تھا۔ اس کی بھوک، پیاس اور راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ کسی صورت چین نہ آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی آسیب اس کی تاک میں ہو۔ وہ رو رو کر دعائیں مانگتا تھا: "یا الٰہی رحم کر۔ میری جان لے لے مگر میری آنکھیں نہ لے۔"

اور اس ساری پریشانی خوف اور آسیبی حملوں سے بچنے کی دوسری صورت یہ تھی کہ وہ پینٹنگ بنائے جائے۔ رونا اور پینٹنگ کرنا دونوں ہی ایسے کام تھے جو اس کی بصارت زائل کرنے میں آسیبوں کی مدد کر رہے تھے۔ وہ آسیب اسے یوں لگتا جیسے فضا میں منڈلا رہے ہوں۔ ان گدھوں کی طرح جو تاک میں رہتے ہیں کہ جیسے ہی زخمی کا دم نکلے اس پر جھپٹ پڑیں۔

جسمانی تھکن، ذہنی کرب اور خوف نے اسے بیمار ڈال دیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ذہنی مریضوں کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں پڑا پڑا وہ چیختا رہتا کہ اسے گھر جانے دیا جائے، وقت کم ہے اور اسے بہت کام نمٹانا ہے۔ یہ ہسپتال والے جاہل اور بے حس لوگ ذرا نہیں جانتے کہ اس کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر کتنا قیمتی سرمایہ مٹی میں ملا رہے ہیں۔ ہسپتال والے خود کو جاہل اور بے حس سن کر مسکراتے اور ہنس کر ٹال جاتے کہ باؤلے مریض اس سے بھی زیادہ سخت سست کہا کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو ہی زہر کے انجکشن لگانے اور کھانے میں زہر ملانے کا الزام ملتا ہے سو ایسے مریضوں کی کیا پروا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہسپتال میں پڑا پڑا ہی وہ بصارت سے محروم ہو گیا۔ چھ دن تو اس نے آسمان سر پر اٹھائے رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ عادی ہونے لگا کہ انسان بڑا سخت جان ہے۔ وہ اس چیز کی کمی کا بھی عادی ہو جاتا ہے جس کے بغیر ایک پل اسے جینا گوارا نہیں ہوتا۔ کچھ اور پر سکون ہوا تو ڈاکٹروں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

گھر آتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے اسٹوڈیو میں گیا۔ سارے کینوس اسی طرح رکھے تھے۔ جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا ایزل اسی طرح موجود تھا جس پر ایک نامکمل پینٹنگ رکھی تھی۔ اس کے رنگ اور برش سب اپنی جگہ موجود تھے۔ جیسے اتنے عرصے سے اس کے منتظر ہوں۔ مگر اب وہ کیا کرے۔ اس نے جھک کر ہاتھ سے رنگوں کی ٹیوب کو چھوا..... سب ٹیوب ایک سی تھیں۔ وہ کیسے اندازہ لگاتے کہ سبز کونسی ہے۔ سرخ کونسی، سیاہ کونسی ہے اور سفید کونسی.... کاش اتنے سال اس نے رنگوں سے مغز مارنے کے بجائے موسیقی میں جان کھپائی ہوتی۔ تو وہ آج بھی اپنی آواز کا جادو جگانے کے قابل ہوتا۔ اگر ان رنگوں کی جگہ ستار کے تار ہوتے تو وہ اس کی انگلیوں کی زبان سمجھتے۔ ہر تار چھوتے ہی بول پڑتا "یہ میں ہوں"۔ اور وہ آنکھیں نہ رکھتے ہوئے بھی انگلیوں کے بل پہ ستار بجا سکتا.... مگر اب

وہ ان اندھی بہری ٹیوبوں اور ان بے حس بے آواز برشوں کا کیا کرے؟ اسے لگا جیسے وہ اندھا نہیں ہوا ہے۔ اس کا پیلیٹ اندھا ہو گیا ہے۔ اسے بے حد غصہ آیا۔ ساری عمر وہ جس پیلیٹ پر اپنے رنگوں کی بارش کرتا رہا۔ جن برشوں کو رنگوں کی زبان سکھاتا رہا۔ انہوں نے اتنی مدت میں کچھ نہ سیکھا۔ اس کی ساری عمر کی محنت رائیگاں گئی۔ آخر اس نے اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کو اپنے ذہن کے خوابوں کا کچھ حصہ تو دیا تھا یا نہیں۔ کیا یہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ یقیناً نہیں۔ جب وہ خود ہی نہیں دیکھ سکتا تو وہ کیا کر سکتے ہیں؟ اس نے دوبارہ ٹیوبوں کو چھوا..... کوئی طریقہ تو ہوگا رنگوں کے علم کا نہیں۔ ساری ٹیوبیں واقعی ایک سی ہیں۔ رنگ اس کے ہاتھوں میں بے بس پرندوں کی طرح چپ چاپ اور سہمے ہوئے تھے۔ غصے میں اس نے اندھا دھند ٹیوبیں کھول کھول پیلیٹ پر رنگوں کے انبار لگا دیئے اور پھر برش کا بنڈل اُٹھا کر ایزل کے پاس پہنچا اور رنگ کینوس پر پھیلانے شروع کر دیئے، پھینکنے شروع کر دیئے۔ کبھی غصے میں انہیں رگڑ ڈالا۔ کبھی پیار سے انہیں اچھال دیا۔ کبھی ہمدردی سے انہیں سہلا دیا۔ ایک کے بعد ایک اس نے سارے کینوس رنگ ڈالے۔ جب پیلیٹ پر رنگ ختم ہو جاتے وہ ٹیوبوں سے پیلیٹ پر رنگ انڈیل دیتا اور برش پھر اپنا کام شروع کر دیتے اور جب اسے معلوم ہوتا کہ کینوس بھر گیا ہے تو وہ دوسرے کینوس کی راہ لیتا۔ دن رات وہ اسی کام میں لگا رہا۔ نہ اسے کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا..... اور جب تیسوں کینوس پورے ہو گئے تو دنیا انہیں دیکھ کر انگشت بہ دنداں رہ گئی، کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ تصویریں کسی اندھے آرٹسٹ نے بنائی ہیں۔ ان میں رنگوں کی جو بصیرت تھی، ہنرمندی کا جو کمال تھا۔ لکیروں میں جو آہنگ تھا اور مکمل پینٹنگ میں جو موسیقی تھی۔ وہ آج تک کسی آنکھوں والے کے کام میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ وہ تمام رنگ۔ جو اس نے بند آنکھوں سے دیکھے تھے اور آنکھیں کھول کر کینوس پر منتقل نہ کر سکا تھا، وہ تمام امنگیں جو اس کے دل میں ڈیرہ ڈالے تھیں، وہ ساری حسرتیں جو پوری نہ ہوئی تھیں اور کچھ کرنے کا عزم جواب کچھ نہ کر سکنے کی اتھاہ مایوسی

میں ڈوب رہا تھا۔ سبھی کچھ تو اس کے کینوس پر منتقل ہو گیا تھا۔

اس کی نمائش میں لوگ امنڈتے چلے آئے تھے۔ نوجوان مصور اس کی انگلیوں کی پوروں کو اپنی آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ شائقین اس کی بے نور آنکھوں کو عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے مائک اس کے آگے دھرے بیٹھے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ میں آرٹسٹ نہیں ہوں۔ میں ایک کینوس ہوں میں نے چالیس برس رنگ پیا ہے اب رنگ خود بخود میرے اندر سے پھوٹ رہے ہیں۔ میں کسی پینٹنگ کی تخلیق نہیں کرتا، وہ تو میری ذات، میری شخصیت اور خود میرے وجود کا حصہ بن گئی ہیں۔ بس میں خوش ہوں کہ میرے پیلیٹ نے، میرے برش نے اور میری انگلیوں نے میرے ساتھ غداری نہیں کی۔۔۔۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ یہ سب میری آنکھوں کے تابع نہیں تھے، میرے تابع تھے۔ میری روح کے۔ یہ آنکھوں کے شاگرد نہیں تھے۔ روح کے شاگرد تھے۔ سچے شاگرد تھے۔"

اور آرٹ کے نقادوں نے لکھا"۔۔۔ وہ ذہنی طور پر پوری طرح صحت یاب نہیں ہوتے ہیں وہ بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے"۔ مثلاً انہوں نے کہا۔ وہ آرٹسٹ نہیں بلکہ ایک کینوس ہیں۔۔۔"

جنم جلی

روزمرہ تو خیر جیسا تھا مگر جس دن ساس کی طبیعت ذرا خراب ہوتی قیامت آجاتی۔
بالکل بچوّں کی طرح وہ واویلا مچاتیں اور اس دن سب سے زیادہ نزلہ بہو پر گرتا اس بات
پر کہ اس نے بیٹے کو برج کھیلنے سے کیوں نہ روکا۔ ماں مر رہی ہے اور بیٹا رات بھر جوا کھیل
رہا ہے مگر قصور کس کا ہے، بہو کا! — اور بہو غریب خاموش رہتی۔ دھیرے سے کہتی —
"انہیں معلوم تھا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔"

"پھر وہ کیوں گیا —" ساس اُبل پڑتیں جیسے اس نے زبردستی بھیجا ہو "تم لوگوں کی
بلا سے ماں مرے یا جیئے —" اور وہ صاف الفاظ میں یہ کبھی نہ کہتی کہ بھلا اس میں میری کیا خطا
بس دل ہی دل میں ہنستی۔ کہیں ایسا بھی سنا ہے کہ ساس اپنی بہو کو اس بات پر ڈانٹے کہ وہ اپنے
میاں سے لڑتی کیوں نہیں۔ وہ جب بھی طعنے دیتیں اسی بات کا۔

"عجیب لڑکی ہے، رات بھر میاں غائب رہے گا صبح آئے گا تو ہمیشہ ہنس کر دروازہ کھولے
گی، کیا مجال جو کبھی پوچھ لے اتنی دیر کہاں رہے۔ اسی لئے تو وہ اتنا سر پھرا ہو گیا ہے۔ سمجھدار
بیویاں شوہروں کو انگوٹھے تلے رکھتی ہیں ہاں نہیں تو —" اب اگر وہ پوچھ لیتی کہ ماں جی آپ
نے جو اپنے سرتاج کو انگوٹھے تلے رکھنے کی کوشش کی تو وہ کون سے دب ہی گئے سوائے
اس کے کہ عمر بھر چائیں چائیں ہوتی رہی، سارے زمانے نے تماشہ دیکھا۔ آپ دونوں
کی زندگی تلخ ہوئی سو الگ اور آپ کے بیٹے کو تب ہی سے گھر سے باہر رہنے کا چسکہ پڑا۔
اب اگر میں ان سے لڑوں تو کیا حاصل ہوگا سوائے اس کے کہ ایک دن وہ گھر چھوڑ کر ایسا جائے
گا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھے گا۔ آپ کے شوہر میں اتنا دم تھا کہ ہر وقت کی جھک جھک کے سامنے

بھی سینہ تان کر گھر آجاتے تھے مگر آپ کا بیٹا اس تماشے سے پہلے ہی اکتا چکا ہے اس نے شادی سے پہلے ہی یہ بات صاف کر دی تھی کہ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر اپنی ماں کی طرح —— ہر وقت بیوی کی ہائے ہائے نہیں سن سکتا۔ اب وہ یہ سب اپنی ساس کو کس طرح بتلائے جو اسے خاموشی سے زیادتی سہہ لینے کے طعنے دیتی تھیں ——

"ہائے —— اگر کسی کو میری فکر ہوتی تو —— نوکر بھیج کر اسے بلوا ہی لیا جاتا ——" ساس تکلیف سے زیادہ اپنی طرف سے گھر والوں کی لاپروائی پر تڑپ کر کہتیں۔

"ماں جی —— بلوا تو لیتے —— مگر معلوم ہی نہیں نا کہ وہ ہوں گے کہاں۔"

"کیوں کلب میں ہوگا اور کہاں ہوگا ——" ساس تڑاخ سے کہتیں۔

"کبھی کلب میں کھیلتے ہیں کبھی کسی کے گھر —— آج شاید کسی کے گھر گئے ہیں ——"

"تو کیا وہ یہ بھی بتا کر نہیں جاتا کہ کہاں جا رہا ہے؟ ——"

"بتایا تو تھا مگر میں نے غور سے نہیں سنا۔"

"ہاں —— تم کیوں غور سے سنتیں، بیٹا کہیں ماں کی میت پر چلا ہی نہ آئے۔"

اب سسر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا وہ کمرے میں جھانک کر کہتے "کہہ دو کہ تم صبح تک مرتی نہیں کہ بیٹے کا منہ نہ دیکھ سکو۔ اور اگر مر ہی گئیں تو کیا ہے —— بیٹا تمہارا منہ دیکھ لے گا ——"

ہزار شکر کہ بڑی بی اونچا سنتی تھیں۔ پھر بھی بھنک پڑ ہی جاتی —— "یہ کیا بڑبڑ کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں، کہہ رہے ہیں صبح تک آپ اچھی ہو جائیں گی۔"

"اور نہ ہوتی تو ان باپ بیٹے کو کیا فرق پڑے گا۔ یہ تو خدا سے چاہ رہے ہیں کہ باپ کٹے بیٹے ہی بے شرم ہوں۔"

اس مرحلے پر سسر تیزی سے آتے اور اپنا تکیہ اور کمبل اٹھا کر اسی تیزی سے باہر نکل جاتے گویا اعلان کر دیتے کہ وہ رات کو ڈرائنگ روم میں یا مہمان کمرے میں سوئیں گے۔

بیمار بیوی کو چھوڑ کر میاں دوسرے کمرے میں پاؤں پھیلا کر سوئے یہ وہ حادثہ تھا کہ اس صدمے سے وہ جاں بحق ہو جاتیں تو بے جا نہ ہوتا مگر طویل ازدواجی زندگی میں یہ حادثہ اتنی بار گزرا تھا کہ اب صدمہ قطعی قابل برداشت ہو گیا تھا، بس اتنا ہوتا کہ رات کا بیشتر حصہ وہ اپنی ساری عمر کی کس مپرسی یاد کر کے تڑپتیں، آہیں بھرتیں اور روتیں — میاں مہمان خانے میں سٹا کر سوتے، بیٹا رات بھر برج کھیلتا جو کچھ گزرتی بے چاری بہو پر —

اور بہو جانے کس کمبخت مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ پورے دنوں سے تھی مگر مجال ہے جو کسی بات پہ نخرے کرے، بیٹے کے کہنے پر مٹکا سا پیٹ اٹھائے پکچر بھی چلی جاتی، بازار بھی اور جہاں جہاں وہ گھسیٹے لئے پھرتا۔ ساس اعتراض کرتیں تو ہنس کر ٹال جاتی کہ کیا کروں وہ نہیں مانتے ورنہ بتلایئے ماں جی اس حلیے میں کسی کا جی چاہتا ہے کہیں جانے کو بعنی الٹا ساس سے ہمدردی وصول کرنے کی فکر کرتی۔ اب اس بدبخت سے کوئی پوچھے کہ وہ کونسا تیرے بے دام کا غلام ہے جو تجھ پر اس کی ہر بات ماننا فرض ہے مگر پتھر میں بھلا کبھی جونک لگی ہے —

یہاں تک کہ جس رات ہسپتال جانے کی ضرورت پڑی تب بھی میاں غائب تھا۔ اس نے ساس سے آکر کہا۔ ضرورت کی چیزیں چند دن پہلے سوٹ کیس میں رکھ لی تھیں وہ تو سسر کو بھی اُٹھانے کو منع کر رہی تھی۔ مگر ساس نے غصے سے کہا "باؤلی ہوئی ہو، کوئی اندر سے دروازہ بھی بند کرے گا یا نہیں"۔ بس ڈرائیور کو ساتھ لیا اور دونوں ساس بہو چلنے لگیں تو ساس نے کہا "جاوید کو تو خبر کر دیتیں —"

"ہمیں پہنچا کر ڈرائیور جا کر اطلاع کر دے گا —" بہو نے اطمینان سے کہا۔

ہسپتال میں اترتے وقت ساس نے بطور خاص ڈرائیور کو سمجھایا کہ صاحب کو فوراً کلب سے جا کر ہسپتال لے آئے — بہو نے دور کھڑے دھیرج سے کہا۔

"تم اطلاع دے دینا ڈرائیور — وہ آنا چاہیں گے تو آ جائیں گے —"

اور وہی ہوا — بہو کو اپنے کمرے میں درد سے تڑپتے دو گھنٹے ہو گئے تھے مگر بیٹے کا

کہیں پتہ نہ تھا۔ اور جس وقت نرس بہو کا ہاتھ پکڑ کر لیبر روم میں لے جانے لگی کہ وقت قریب تھا۔
تب بہو کے صبر و استقلال اور بیٹے کی لاپروائی پر ان کے آنسو نکل آئے اور آج پہلی دفعہ انہیں
بہو پہ سچ مچ پیار نہ آیا ورنہ وہ سدا اس سے جلتی ہی رہیں جیسے وہ اپنے صبر کا مظاہرہ کر کے ان
پر طنز کرتی ہو اور جب کبھی بڑے میاں کہہ دیتے کہ بہو ہی سے سبق لو تو ان کے تن بدن میں
آگ لگ جاتی اور بہو سے سوکن کا سا جلاپا محسوس ہونے لگتا۔ بہت سوچتیں مگر کوئی بات اس کے
خلاف نہ ملتی۔ اگر اس نے دو بیٹے نہ جنے ہوتے تو بیٹوں ہی کا طعنہ دے کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتیں۔
اب لے دے کے یہی شکایت تھی کہ وہ میاں سے کسی بات کی باز پرس کیوں نہیں کرتی اور
وہ بہو سے یہ سب اس لئے کہتی تھیں کہ بیٹے سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ ایسے تابڑ
توڑ جواب دیتا تھا کہ منہ دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ وہ تو ان کا ایسا بیری تھا کہ جب ان کی میاں سے
لڑائی ہوتی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روتیں تو وہ دو لفظ تسلی کے کہنے کے بجائے یہ کہہ کر
کہ سارا قصور آپ کا ہے فوراً گھر چھوڑ کر چلا جاتا۔ آج انہوں نے دوپٹہ پھیلا کر صدقِ دل سے
دعا کی۔ اے خدا میری بہو کو خیریت سے فارغ کر —— ایسی صبر والی بچی ہے کہ کسی سے کچھ
نہیں کہتی۔ شاید تجھی سے کچھ کہتی ہو تو کہتی ہو ——

وہ لیبر روم کے باہر کرسی پر سُن بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں کہ دفعتاً بیٹا گھبرایا ہوا اندر آیا۔

"خیریت؟" اس نے اندر آکر ماں سے کہا۔

"خدا کرے خیریت ہی ہو، ہمیں تو اندر جانے کی اجازت نہیں اور تم بھی اب آئے ہو۔
تمہیں کسی کی بھی جان کی پرواہ ہے ——" وہ طنز سے نہ چوکیں۔

"میں کلب میں نہیں تھا ڈرائیور کو شیخ صاحب کا گھر ڈھونڈتے میں دیر لگی جیسے ہی
مجھے پتہ چلا فوراً آیا ہوں"

اسی وقت نرس اُدھر سے گزری تو ساس نے اس سے کہا "اندر جا کر بتا دینا کہ صاحب
آگئے ہیں۔" انہوں نے سوچا اس قیامت کے وقت میں کچھ تو بہو کو تسلی ہو گی کہ اس کا

لاپرواہ شوہر بھی آ ہی گیا ہے۔ یہ دوران پر یاد تھی بخیر زندگی میں ایک ہی بار گزرا تھا۔ مگر ایک ہی دفعہ میں انہوں نے کیا کیا طوفان نہ اٹھائے تھے۔ پورے نو مہینے سارے گھر کو تگنی کا ناچ نچایا تھا اور آخری دن تو واقعی سب پر قیامت بن کر گزرا تھا۔

نرس گئی اور الٹے قدموں واپس آئی۔

"آپ اندر آجائیے ــــ" اُس نے جاوید سے کہا۔

جاوید حیران حیران سا نرس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد باہر نکلا تو اس کا منہ سوجا ہوا اور سرخ تھا جیسے بھڑوں نے کاٹ لیا ہو۔ کان تک لال انگارہ ہو رہے تھے۔ بغیر کچھ کہے سنے وہ کھڑکی میں جاکر کھڑا ہو گیا اور گم سُم وہیں کھڑا رہا۔

نرس نے آکر تیسرے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع ساس کو دی۔ انہوں نے بیٹے سے بات کرنی چاہی مگر اس کی حالت دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی۔

جس وقت بہو کا اسٹریچر کمرے میں آیا تب بھی جاوید وہیں کھڑکی میں اسی پہلو اسی انداز سے کھڑا تھا جیسے پتھر کا بُت ہو۔ بہو نے پلنگ پر لیٹنے کے بعد پہلی نظر اپنے میاں پر ڈالی اور رسان سے بولی "کیا بات ہے یہ وہاں کیسے کھڑے ہیں؟"

ساس نے سمجھا شاید بہو کو شک ہو رہا ہے کہ میں نے کچھ کہا ہے وہ جلدی سے صفائی میں بولیں "قسم لے لو جو میری اس کی کوئی بات بھی ہوئی ہو۔ جب سے تمہارے پاس سے آیا ہے وہیں چُپ چاپ کھڑا ہے۔ منہ سرخ ہے، نہ کوئی بات کرتا ہے نہ وہاں سے ہٹتا ہے۔"

"جاوید ــــ" بہو کی نرم و نازک آواز ابھری تو جاوید نے پلٹ کر دیکھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے پاس آیا اور اس کے سفید سُتے ہوئے چہرے کو یوں دیکھنے لگا جیسے آج پہلی دفعہ دیکھ رہا ہو۔

"تم آرام کرو بہو ــــ" ماں نے بہو کے اس لاڈ کو قطعی غیر ضروری سمجھا ــــ خود ابھی مر کر آئی ہے اور فکر یہ ہے کہ میاں کیوں منہ تھوتھاتے ہے۔"

" جاوید۔۔۔ سچ کہتی ہوں میں نے ڈاکٹر کو منع کیا تھا کہ تمہیں نہ بلائے مگر نہ معلوم اسے کیا سوجھی کہنے لگی کوئی حرج نہیں دو منٹ کے لئے آجائیں تو۔۔۔۔ اور اتفاق سے اسی وقت۔۔۔"

دفعتاً جاوید نے پلنگ کی پٹی پر سر رکھ دیا اور سسکتے ہوئے بولا "بہت اچھا ہوا کہ اس نے مجھے اندر بلا لیا۔۔۔ کاش مجھے معلوم ہوتا۔۔۔ کاش۔۔۔۔ اب میں ساری عمر تمہارا وہ کربناک چہرہ نہیں بھول سکتا۔ سچ کہتا ہوں میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اتنی تکلیف۔۔۔۔۔ اتنا کرب۔۔۔۔" جاوید کی آواز میں اتنا دکھ اتنا درد تھا کہ لگ نہیں رہا تھا کہ یہ وہی بے پرواہ اور بے حس آدمی ہے۔

یکایک ساس آگے بڑھیں۔ محبت کا وہ سوتا جو کچھ دیر پہلے بہو کے لئے دل میں پھوٹا تھا۔ لمحہ بھر میں سوکھ گیا۔ غصے میں وہ پھنکاریں "اب تو تجھے پتہ چل گیا۔ اب بھی بیوی کے قدموں میں سر رکھ کر رو رہا ہے۔ اس جنم جلی ماں کی گود میں سر رکھ کر نہ رویا جس نے تجھے جنا تھا۔"

پردہ

"یہ کون ہے ؟" میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اس سے بھی نہیں ملتا۔ جو روز مجھے دودھ دیتی ہے، جو مجھے پیار کرتی ہے، جو مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر سلاتی ہے اور منا منا کہتی ہے۔ یہ اس شخص سے بھی نہیں ملتا جو روز ایک خاص وقت آتا ہے۔ مجھے ہوا میں اُچھالتا ہے اور میرے پیٹ میں گدگدیاں کرتا ہے پھر ایک موٹا سا پیار کر کے واپس لٹا دیتا ہے یہ اس سے بھی نہیں ملتا جو روز مجھے گاڑی میں ڈال کر باہر لے جاتا ہے۔ مجھے باغ میں ایک جگہ لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے اور خود اپنے جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ گھاس پر دراز ہو جاتا ہے یا قلابازیاں کھانے لگتا ہے۔ ہاں وہاں دوسری گاڑیوں میں جو لوگ بیٹھے ہوتے ہیں وہ کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول مول سے وہ مجھے اشارے کرتے ہیں، کبھی ہنستے ہیں، کبھی روتے ہیں۔ یہ جو سامنے بیٹھا ہے۔ شاید ان ہی میں سے کوئی ہے مگر وہ اتنی دور کیوں بیٹھا ہے۔ میں اسے پاس بلاؤں تو شاید وہ آجائے۔ میں اسے بلاتا ہوں۔ میں اپنا ہاتھ اُٹھا کر انگلیاں چلاؤں گا تو وہ سمجھ لے گا کہ میں اسے بلا رہا ہوں۔

ہیں یہ کیا ــــ وہ خود مجھے بلا رہا ہے ــــ یہ خوب رہی میں کہتا ہوں تم آؤ تو وہ کہتا ہے، تم آؤ ــــ خیر میں تو ابھی چل ہی نہیں سکتا، پتہ نہیں لوگ چل کیسے لیتے ہیں، مگر دوستی تو دور سے بھی ہو سکتی ہے۔ میں مسکرا کر اسے اپنی دوستی کا یقین دلاتا ہوں۔ اب وہ بھی مسکرا رہا ہے۔

ارے اس کے بھی دو چار ہی دانت ہیں۔ میری طرح۔ مگر کیا میرے دو چار دانت ہیں؟ مجھے کیسے معلوم جب میں انگلی منہ میں ڈالتا ہوں تو کوئی چیز میری انگلی پر لگتی ہے۔ اسی کو تو یہ

بڑے لوگ دانت کہتے ہیں۔ پہلے ایک تھا۔ اب کئی دوسرے بھی نکل آئے۔ جو لوگ چل سکتے ہیں۔ ان کے تو بہت سے دانت ہوتے ہیں مگر ہم جیسے جو کسی چیز پر چڑھ کر باہر نکلتے ہیں۔ ان کے کم کم دانت ہوتے ہیں جیسے اس کے جو سامنے بیٹھا ہے یا جیسے میرے۔ مگر یہ میں کون ہوں؟ میں کوئی ہوں تو جسے ایک ہستی دن میں کئی بار دودھ پلاتی ہے، پیار کرتی ہے، اپنے ساتھ سلاتی ہے اور منا منا کہتی ہے۔ جسے ایک شخص خاص وقت میں آن کر ہوا میں اچھالتا ہے۔ پیٹ میں گدگدیاں کر کے ہنساتا ہے اور پھر ایک موٹا سا پیار کر کے لٹا دیتا ہے تو میں کون ہوں؟ کیسا ہوں؟

میرے سر میں کچھ ہو رہا ہے۔ شاید مجھے ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ مگر مجھے پتہ تو چلنا چاہیئے کہ میں کون ہوں۔ جو سامنے بیٹھا ہے اس سے پوچھوں۔ کیسے پوچھوں کیا کہوں؟ لوگ اپنی بات دوسروں سے کیسے کہتے ہیں ہنس کر یا رو کر دو ہی تو طریقے ہیں۔ اچھا تو میں اس سے رو کر پوچھتا ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کون ہوں کیسا ہوں؟

لو یہ کیا میں رویا تو وہ بھی رونے لگا۔ شاید وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ وہ کون ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی میں ہوں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو یہ ہوں، وہ تو وہ ہے — وہ تو دور ہے۔ میں تو اپنے پاس ہوں۔ مگر میں اپنے پاس کیسے ہو سکتا ہوں۔ جب کہ میں اپنے آپ کو جانتا تک نہیں۔ لیکن میں اپنے ہاتھ پیروں کو تو جانتا ہوں۔ یہ میرے ہاتھ ہیں۔ وہ جو سامنے بیٹھا ہوا ہے وہ بھی اپنے ہاتھ اُٹھا کر بتا رہا ہے کہ اس کے بھی ہاتھ ہیں۔ یہ میرے پیر ہیں۔ وہ بھی اپنا پیر اٹھا رہا ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں۔ وہ بھی وہی کرتا ہے۔ کیا وہ کوئی اور حرکت نہیں کر سکتا؟ یہ کیا بھید ہے؟ یہ کیا طلسم ہے؟ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے رو کر کسی کو مدد کے لئے بلانا چاہیئے۔ میں روؤں گا۔ زور سے خوب زور سے وہ کمبخت بھی رو رہا ہے۔ زور سے خوب زور سے،

وہ لو وہ آگئی جو مجھے دودھ پلاتی ہے اور مجھے پیار کرتی ہے۔ اس نے مجھے اُٹھالیا میں اسے اشارے سے بتاتا ہوں کہ وہاں کوئی بیٹھا ہے۔ مگر یہ کیا۔ اس کو بھی کسی نے اٹھالیا ہے

ارے وہ بھی بالکل ایسی ہی ہے وہ بھی اشارے سے اس کو بتا رہا ہے کہ ادھر کوئی بیٹھا ہے وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے۔میری والی بھی ہنستی ہے۔ وہ مجھے لے جاکر بالکل اس کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔میں اسے غور سے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پلپلا سا، بال بالکل کم ہیں۔ اس کے سر پر، ناک موٹی سی ہے۔جو کچھ میں کرتا ہوں وہ وہی کرتا ہے اور پھر اس کے پاس بھی بالکل ویسی ہی ہستی ہے جو شاید اسے دودھ پلاتی ہو گی، اپنے پاس سلاتی ہو گی اور پیار کرتی ہو گی۔ یہ بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ وہ بھی مجھے بڑا خبیث سا نظر آرہا ہے، مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے، جیسے مجھ سے ناراض ہو، شاید میں اسے پسند نہیں آیا، نہ سہی تو میں کونسا اسے پسند کر رہا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے۔ اس کے بال پکڑ کر خوب زور سے کھینچوں۔ روئے گا تو بڑا مزا آئے گا۔ مگر یہ اس کے بال ہاتھ کیوں نہیں آتے۔ ہاتھ کسی چیز سے ٹکرا کر رک جاتا ہے۔مجھے شروع ہی سے لگ رہا تھا کہ یہ بڑا عجیب سا آدمی ہے۔ پتہ نہیں کون ہے ابھی وہ شخص اندر آیا۔ جو مجھے ہوا میں اچھالتا اور پیٹ میں گدگدیاں کرتا ہے، مجھے دودھ پلانے والی ہستی اس سے کہتی ہے۔

" اطہر منّا اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔" تو کیا یہ میں ہوں!!

اگر یہ منّا ہے تو اس کا مطلب ہے یہ میں ہوں کیونکہ دودھ پلانے والی مجھے منا کہتی ہے اس کا مطلب ہوا میں اور منّا ایک ہی چیز ہیں۔ میں منّا ہوں اور منّا میں ہے۔ ذرا دیکھوں۔ اب میں اسے دیکھ کر خوشی سے ہنس دیتا ہوں۔ وہ بھی ہنس رہا ہے۔ وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے اس کے بال اتنے کم بھی نہیں ہیں اس کی ناک اب اتنی موٹی بھی نہیں ہے اور وہ اچھا خاصا خوش مزاج ہے۔ کتنے پیار سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

"مُنّا۔۔۔" میں کہتا ہوں اور وہ۔ جو مجھے دودھ پلاتی ہے اور وہ۔ جو مجھے ہوا میں اچھالتا ہے۔ دونوں ہنس پڑتے ہیں "مُنّا اپنا نام لے رہا ہے۔ اس نے خود کو پہچان لیا ہے"

اب میں خود کو مُنّا کہتا ہوں "مُنّا دودھ" "مُنّا پانی" "مُنّا بھوک" مُنّا اب بہت اہم ہوتا

جارہا ہے۔ اس عورت سے بھی جو مجھے دودھ پلاتی ہے اور اس مرد سے بھی جو مجھے ہوا میں اچھالتا ہے۔ اب میں اس عورت کو اماں اور اس مرد کو ابّا کہتا ہوں۔"

اور جب میں پاؤں پاؤں چلنے لگا تو سب سے پہلے مُنّے سے ملنے بھاگا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہم دونوں نے مل کر خوب مزے کئے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی ہوئی ساری چیزیں ہوا میں اچھالیں۔ ایک دوسرے کو ماریں کتنے مزے کی بات تھی کہ وہ مجھے مارتا تھا۔ تو میرے چوٹ نہیں لگتی اور میں اسے مارتا تھا تو اس کے نہیں لگتی تھی۔ مگر پھر یکایک ایک بھاری چیز اس کے لگ گئی۔ وہ ٹوٹ گیا، وہ بکھر گیا۔ میں رونے لگا۔ اماں دوڑی آئیں۔

"نہیں کچھ نہیں ہوا، مُنّے کو کچھ نہیں ہوا۔ صرف آئینہ ٹوٹا ہے۔"

میں حیران ہوا۔ میرے سامنے مُنّا ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اس کے چہرے کے ٹکڑے میں نے مختلف ریزوں میں دیکھے اور اماں کہتی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ شاید اماں مجھ سے مُنّے کے ٹوٹنے کو چھپا رہی ہے۔ اسی لئے اس نے وہ ڈریسنگ ٹیبل ہی وہاں سے اٹھوا دی اور تب سے اب تک میں مُنّے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں اپنے ہاتھ پیروں کو دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں تو یہ مُنّا ہے مگر یہ بات میرے جی کو نہیں لگتی۔ میں پورے مُنّے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہنستے ہوئے اور روتے ہوئے۔ پورا مُنّا نظر نہیں آتا اور میں سوچتا ہوں جب مُنّا نہیں ہے تو میں بھی ہوں یا نہیں ہوں۔ اگر ہوں تو کہاں ہوں۔ میں خود کو دیکھ کیوں نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اپنے ہاتھ پیر دیکھ لیتا ہوں۔ بہت کوشش کرتا ہوں تو پیٹھ کا کچھ حصہ نظر آجاتا ہے۔ مگر میں پورے میں کو کیوں نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کیا بات ہے جب میں دوسروں کو دیکھ سکتا ہوں تو تو خود کو کیوں نہیں دیکھ سکتا؟

"تم خود کو آئینے میں دیکھ سکتے ہو۔" لوگ کہتے ہیں۔

"مگر مجھے تو آئینے میں کچھ نظر نہیں آتا۔ آئینہ تو پہلے ہی کرچی کرچی ہو چکا ہے اور جب دنیا میں آئینے نہیں تھے تو؟"

"تو لوگ پانی میں اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔"

"اور کیا وہ خود کو پہچان لیتے تھے؟ پانی اور آئینے یہ تو سب وسیلے ہیں، ان کا کیا بھروسہ؟ لوگ ہر بات کا یقین دلانے کے لئے کہتے ہیں۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر جب انہوں نے خود کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تو اپنی ہستی کا اعتبار کیسے ہوا؟"

میں تو اس بات پر سخت متعجب ہوتا ہوں کہ میں نے آج تک اپنے آپ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا نہ کبھی دیکھ سکوں گا اور جب میں یہ بات سوچتا ہوں تو مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے۔ خدا ہی جانے میں کیسا ہوں؟ اندر جھانکتا ہوں تو بالکل اندھیرا ہے جیسے کنواں ہو کنویں کے اندر پانی ہو تب بھی اپنی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر یہ تو اندھا کنواں ہے۔ پانی ختم ہو چکا ہے شاید سارے کنویں اندھے ہو گئے ہیں اور تمام آئینوں کی آب اتر چکی ہے۔ اب کوئی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ سب دوسروں کو دیکھنے پر مجبور ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں۔" ہم کیسے ہیں؟"

"میرے چہرے پر آئینے کی کرچیوں سے پڑے ہوئے داغ تو نہیں ہیں؟" میں پوچھتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں" نہیں بالکل نہیں، تمہارا چہرہ تو صاف ہے۔" مگر مجھے ان لوگوں کا اعتبار نہیں ہے۔ لوگ چہروں اور شخصیتوں کا تصوّر اپنے رشتوں اور اپنی ضرورتوں سے کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں" آپ ابھی تک بہت ہینڈسم ہیں۔ آپ ابھی تک جوان ہیں۔ آپ کا جسم نہایت عمدہ ہے۔" لیکن جو کسی وجہ سے مجھ سے جلتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں" کیا بات ہے تم کچھ بجھے بجھے سے ہو، رنگ میلا پڑ گیا ہے۔ تم کچھ کمزور لگتے ہو، وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔" ایسے میں، کس کا یقین کروں۔ سب ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ جب آئینے سچ نہ بول سکیں تو انسان کیسے بول سکتے ہیں۔ اگر میں خود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تو شاید مجھے پتہ چل جاتا کہ میں کیسا ہوں کیا یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ آج تک

کسی نے اپنے آپ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں۔

" انسان خود کو نہیں سمجھ سکتا تو دوسروں کو کیسے سمجھ سکتا ہے "، مگر میرے خیال میں دوسروں کو سمجھنا زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ انسان دوسروں کو پورے کا پورا دیکھ سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اور اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر اس کے اندرون کو بھانپ سکتا ہے۔ مگر وہ خود اپنی آنکھوں میں نہیں جھانک سکتا اور اپنے چہرے کے تاثرات نہیں پڑھ سکتا۔ اس طرح خود سے تو وہ سر تا سر چھپا ہوا ہے۔ کیا میں اور میں کے درمیان اس پردے میں کوئی رمز نہیں ہے ؟؟؟

انسان ڈھونڈے تو خدا کو پا سکتا ہے اور جب خدا سامنے ہوگا۔ تو وہ اسے شاید دیکھ بھی لے گا۔ مگر وہ خود کو تو کبھی بھی نہیں دیکھ سکتا اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کبھی بھی نہیں آسکتا۔ وہ ہمیشہ اپنی آنکھوں کے پیچھے ہی رہے گا۔ ایک ایسے عہد میں جب صرف حواسوں کا اعتبار رہے انسان اپنے آپ کو نہ دیکھ سکے تو آخر اپنے ہونے کا اعتبار کیسے کرے۔

" میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں۔ "، عظیم مفکر نے کہا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یوں بھی تو کہہ سکتے ہیں۔

" اگر میں ہوتا تو خود کو نظر آتا، میں خود کو دکھائی نہیں دیتا اس لئے میں نہیں ہوں "

اور بہت ممکن ہے کہ میں واقعی نہ ہوں اور جب میں ہی نہیں ہوں تو مُنّا کیسے ہو سکتا ہے۔ شاید یہ میرا واہمہ تھا کہ مُنّا کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا ہے اور غائب ہو گیا ہے۔ میں نے اسے بھی تو اپنی آنکھوں سے نہیں صرف آیئنے کے وسیلے سے دیکھا تھا۔ میں بھی کتنا بیوقوف ہوں کہ ایک عمر سے اسے ڈھونڈے جا رہا ہوں۔ اگر مُنّا بھی میری تلاش میں اسی طرح سرگرداں ہے تو وہ بھی کم احمق نہیں ہے۔

دفینہ

رحمان کا گھر کیا تھا جیسے بے پٹ کی کھڑکی.... نہ کوئی اوٹ نہ آڑ، نہ حفاظت نہ کچھ۔ جھگی کی حقیقت ہی کیا اور وہ بھی اتنی بوسیدہ۔ دروازہ تو اس کا بس رحمان یا پارو کے دل کے زور سے اٹکا ہوا تھا اور پھر اس کے گھر میں ایسا تھا کیا کہ حفاظت کی ضرورت ہوتی۔ ایک معمولی کباڑی کے گھر میں کیا ہو سکتا ہے سوائے صحیح معنوں میں کاٹھ کباڑ کے جسے وہ چھ دن اپنے گھر میں جمع کرتا اور ساتویں دن کرائے کی گدھا گاڑی میں بھر کر لوتل بازار میں بیچ آتا۔ کوئی آج سے وہ اس جھگی میں تھوڑا ہی رہ رہے تھے، مدتیں گزر گئی تھیں جیسے وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بوڑھے ہو رہے تھے گھر بھی اپنی عمر طبعی کو پہنچ رہا تھا۔

رحمان اور اس کی بیوی پارو کی عمروں اور مزاجوں میں کچھ عجب مضحکہ خیز تفاوت تھا۔ بارہ سال کا فرق ستر اسی کی عمر میں کچھ نہ ہو مگر پندرہ سترہ سال کی عمر میں بہت ہوتا ہے۔ پارو کی شادی ہوئی تو وہ چلبلی اور ہر جگہ آنے جانے کی شوقین۔ ذرا یہ دیکھ لیتے، ذرا وہ کر لیتے اور رحمان اونہہ، وہاں کیا رکھا ہے، یہ کیا بچوں کی سی حرکت ہے کا قائل، پارو نے کہیں برسوں میں جاکر دل مارنا سیکھا۔ کچھ گھر کے کاموں اور بچوں نے سکھایا کچھ رحمان کی رکھائی نے۔ ایک طویل مدت بعد جب رحمان کا کباڑی کا بزنس کچھ چل نکلا تو اس کے دل میں ارمان رینگنے شروع ہوئے باغوں کی سیر اور پکچر دیکھنے کے مگر اب پارو کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ ذہنی اتصال جو میاں بیوی کی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں ہوتا ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی میں کبھی نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اس بات کو کبھی اس طرح نہ سوچا۔ ہاں بس یہ نظر آتا تھا کہ ایک کی رائے پر دوسرے نے کبھی دل سے صاد نہ کیا۔

ہر معاملے میں ان کی رائے مختلف ہی رہی۔ کبھی رحمان کا داؤ چل گیا کبھی پارو کا، کبھی جھگڑا بڑھا تو مار پیٹ اور میکے جانے کی دھمکی تک نوبت پہنچی وہ میکہ جو اصل میں کہیں بھی نہیں تھا ...... وہی سب باتیں جو ہر گھر میں کبھی نہ کبھی ہوتی ہیں یہاں تقریباً روز یا دوسرے تیسرے ہوتیں۔ محلے والے بھی عادی ہو گئے تھے اور میاں بھی۔

میاں کی بے رخی کا بدل عورتیں مختلف صورتوں میں ڈھونڈتی ہیں پارو کے لئے اس کم نگھی کا بدل تھا گھر سے بے اعتنائی اور محلے کی عورتوں سے دوستی رحمان کا کام ایسا تھا کہ صبح کا گیا گیا رات پڑے گھر گھستا۔ پارو سارا دن عورتوں سے گپ بھٹونکتی اور شام کو رحمان کے آنے سے پہلے جلدی جلدی کچھ پکا رندھ لیتی۔ یہ سلسلہ بھی مدت سے چل رہا تھا کہ یکایک رحمان نے شام کو پوچھنا شروع کیا کہ آج کہاں گئی تھی، کس سے ملی، کتنی دیر رہی۔ پارو سچ سچ بتا دیتی مگر رحمان جھلّا اُٹھتا۔

" سارا دن غائب رہتی ہے نواب کی بچی، گھر میں دل ہی نہیں لگتا۔ پاؤں ہی نہیں ٹکتے... عورتیں گھر میں بیٹھ کر ہزار کام کرتی ہیں، یہاں ایک زبان ہے کہ چلی جاتی ہے۔ صبح سے شام تلک۔ میاں گھر گھر ٹوٹے ٹھیکرے اور ردی اخبار جمع کرتا پھرے اور بیگم صاحبہ ہیں۔ کہ گھر بیٹھے بٹھائے کھانے کو۔"

اس پر بات بڑھ جاتی، گالی گلوچ، مار پیٹ، رونا پیٹنا، میکہ ... مگر ہمیشہ بال بکھرائے گیلی آنکھیں پونچھتی پارو چولہے کے پاس وہیں کی وہیں موجود۔

اور پھر ایک اور انوکھی بات ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہوتا تھا کہ جب وہ دونوں بچوں سمیت کہیں باہر جانے لگتے تھے تو پارو اپنے خیال میں قیمتی چیزیں اٹھا کر اندر کوٹھری میں رکھنے لگتی اور رحمان چلاتا۔ "اے کیا کر رہی ہے نکل بھی چک۔"

" ذرا چیزیں اندر رکھ رہی ہوں کہیں کوئی اُٹھا لے۔"

" بڑی ہزار دو ہزار کی چیزیں ہیں تیری ... چل نکل باہر۔"

"اے ہے رہنے دو..... مرغی کو تو نکلے کا گھاؤ ہی بہت ہے۔ کوئی تو اچھا ہی سا ڑا تو دوسرا آنا دو بھر ہو جائے گا۔" اسی تو تو میں میں میں وہ لوٹا، توا، چمٹا، دیگچی، بھگونا الم غلم کوٹھری میں پھینک کر زنگ آلود تالا کنڈی میں پھنسا دیتی اور اب وہ اسے چیزیں اندر رکھتے چپ چاپ دیکھتا رہتا اور جب وہ باہر نکل آتی تو خود اندر جاتا اور اپنے بکس کا تالا کھول کر کوٹھری میں لگاتا۔ کبھی اس سے پہلے ہی اندر کچھ سٹر پٹر کرتا۔

"کیا کر رہے ہو۔؟"

"ذرا چادر بدل رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔" وہ جھنجلا کر جواب دیتا۔

پارو کی یاد میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اندر سے کنڈی بند کر کے کپڑے بدلنے شروع کئے تھے اور کبھی کبھی تو اسے چادر بدلنے میں اتنی دیر ہو جاتی کہ پارہ جھنجلا اٹھتی۔ لیکن کچھ کہتی تو کٹ حجتی شروع ہو جاتی۔

"اچھا پھر نہیں بدلے ساری عمر بند کر کے کپڑے تو اب بدلوں گا تو کیا کرے گی.... تو میری ہر بات کی دروغہ ہے یا یہ بتا اس میں برائی کیا ہے خواہ مخواہ کا اعتراض ہاں نہیں تو۔"

عورت ذات ایسے شبہے کا اظہار کرے بھی تو کس قسم کا۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ رحمان میں کچھ تبدیلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے سختی سے کہہ دیا کہ وہ صبح کو بالکل باہر نہیں جائے گی۔

"کیوں آخر کیوں؟" ساری عمر کی عادت، بے لذت زندگی کا واحد بدل ارمانوں کے جلتے بھڑکتے شعلوں کا نہ سہی دھوئیں کا ایک ہی نکاس وہ بھی بند۔

"بس میری مرضی۔"

"کوئی وجہ بھی؟؟؟؟ میں بد چلن ہوں، آوارہ ہو گئی ہوں، سوتی ہوں کسی کے ساتھ جا کے۔؟"

"بند کر بکواس نہیں تو دوں گا ایک۔"

پارو بڑبڑاتی رہی جس کے نتیجے میں رحمان اُٹھا اور اپنی گھِسی ہوئی جوتی اس کے سر پہ تڑاتڑ برسا دی۔ رونا پیٹنا، گالی گلوچ، میکے جانے کی دھمکی۔ رحمان نے خالی بوری سنبھالی اور باہر نکل گیا۔

دن کا نکلنا بند ہوا تو دماغ نے سوچنا شروع کیا۔ رحمان بدل رہا ہے کسی اور کے ساتھ آنکھ لڑ گئی ہے..... مجھے پریشان کر رہا ہے کہ تنگ آکر بھاگ جاؤں تو اسے فوراً گھر میں ڈال لے... یا سٹھیا گیا ہے کچھ..... ہاں نہیں تو۔ کہیں باہر جانے لگو تو جاتے جاتے تین دفعہ تالے کو کھینچ کر دیکھے گا اور پڑوسی سے کہے گا "بھائی ذرا خیال رکھنا ہم ذرا باہر جارہے ہیں۔ شام تک آئیں گے" اگر جلدی واپس آنا ہو تو دیر میں بتلائے گا اگر دیر میں آنا ہو تو جلدی بتلائے گا..... نہ معلوم اس میں کیا بھید ہے جو باتیں کبھی نہ ہوئی تھیں وہ ہو رہی تھیں۔ آخر ایک دن اس کا دھیان دوسری طرف گیا شاید یہی بات ہو دیکھنا چاہیئے اس دن اس نے بچوں کو کسی بہانے سے باہر نکالا اندر سے کنڈی لگا کر کوٹھری کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخر..... لحاف گدروں کے بڑے ٹرنک کے نیچے کچی زمین کھدی ہوئی تھی۔ گڑھے کا چپن اُٹھایا تو کپڑے کی ایک تھیلی جس میں نوٹ ہی نوٹ.....

ایک دفعہ کو تو اس کا دل دھک سے ہوگیا، سارا خون جمع ہو کر چہرے اور سر میں سما گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کندھوں سے پکڑ کر چکر پھیری دے دی ہو۔ پہلے پہل اسے اُٹھاتے ہوئے یوں ڈری جیسے کپڑے کی تھیلی نہیں سانپ ہو۔ اٹھالی تو کھولنے کی ہمت نہ ہو۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ جب سے اس نے باہر نکلنا کم کیا تھا۔ ہمسایاں اس کے ہاں آجاتی تھیں۔ کھولی تو نوٹ دیکھ کر ایسی چکرائی کہ ہوش و حواس گم ہو گئے۔ لاکھ چاہا کہ گن لے مگر ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ گنے بنا بھی اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ کچھ نہیں تو چار پانچ سو روپیہ ہے، اتنے بہت سے روپوں کو اس نے کبھی یکجا نہ دیکھا تھا کچھ عجیب سی ہیجانی کیفیت اس پہ طاری تھی۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے، چہرے کی جلد کی سنسناہٹ اور کانوں میں سائیں سائیں۔ کہیں رحمان نے کوئی اور کام تو شروع نہیں کر دیا جو اتنا روپیہ جمع کر لیا۔ نہیں تو اس سے چھپایا کیوں۔ لاکھ دونوں میں بے رُخی ہو مگر کسی قسم کا کوئی پردہ نہ تھا۔ یہ پہلی دفعہ اس سے بات چھپانے کا دھچکا بھی۔ ایک

دفعہ تو سوچا تھیلی نکال لے مگر پھر ڈری، رحمان کا غصہ خراب ہے۔ قتل ہی کر ڈالے گا۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔ اگر ایسے میں کوئی ہمسائی آواز دے تو اس سے جواب بھی نہ دیا جائے گا۔ جوں کی توں اس نے تھیلی اسی جگہ رکھی اور سب کچھ اسی طرح جما دیا۔

سارا دن اس کے دل میں گدگدی ہوتی رہی۔ کبھی دل ڈوبے کبھی اچھلے۔ لاکھ چاہا کہ رحمان سے نہ کہے مگر اتنی بڑی بات کیسے ہضم کرتی۔ ڈر بھی رہی تھی نہ معلوم رحمان کیا کرے۔ غل غپاڑہ مچا کر آسمان سر پر اٹھالے، چھلائے چلائے کیا کرے مگر خیر وہ بھی نمٹ لے گی۔ آخر قصور اس کا بھی ہے۔ گھر والوں کو پیسے پیسے کو ترسایا اور چرا چھپا کر جوڑتا رہا۔ اس کی اوڑھنی کے لئے اس کے پاس پیسہ نہیں۔ اس کی جوتی کے لئے اس کے پاس دھیلا نہیں۔ بچوں کے عید کے کپڑے بنانے کو کہا تو کھانے کو دوڑا۔ وہ بھی ایسی سنائے گی کہ یاد کرے گا۔ بلا سے سارا محلہ سنے۔ ذرا انہیں بھی تو پتہ چلے کیا گن بھرے ہیں اس میں جسے وہ سمجھتے ہیں بڑا شریف، بڑا نیک پیسہ پیسہ بیوی کے حوالے کرنے والا میاں ہے۔ ہاں نہیں تو۔

رات کو جب اس نے ڈرتے ڈرتے ذکر کیا تو رحمان کو الٹا سانپ سونگھ گیا پہلے تو چپ جیسے مٹی کا بت .... پھر بڑی دھیرج سے ایسی آواز میں جیسے شاید کبھی پہلی رات کو بولا ہو اسے سمجھانے لگا۔ "دیکھنا گھر کی کیا حالت ہے۔ جھگی بالکل خستہ ہو گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا گھر بنانے کی سوچ رہا ہوں۔ تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہے .... تجھے بتا دیتا تو دیکھنا تیرا ہاتھ کھلا ہوا ہے پھر سو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ بس تو مرد ذات ہوں دل پر جبر کر لیتا ہوں .... دیکھ کسی سے ذکر نہ کرنا .... تیرے ہی بھلے کے لئے کرتا ہوں ورنہ بتا کیا مجھے قبر میں لے جانا ہے۔"

میٹھی باتوں کا سرور ہر چیز سے زیادہ تھا جیسے بہت دنوں بعد خوب میٹھا پلیٹ بھر خوشبودار زردہ کھانے کو مل رہا ہو۔ دوسرے دن بغیر کہے رحمان نے اسے اوڑھنی لا دی۔ کچھ دن بعد چپل بھی لے آیا۔ ایک دن بغیر کہے سنے بچوں کے کپڑوں کے لئے پیسے بھی نکال کر دے دیئے۔ اب رحمان کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ صبح کو باہر نہ جانا۔ پارو کا دل خود گھر میں پڑا رہتا تھا۔

ایک شام سب گھر والوں کو کہیں باہر جانا پڑا تو پارو نے نئے تالے خرید کر کوٹھری میں الگ اور چھوٹے دروازہ میں الگ لگوایا۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اب رحمان پارو کی باتوں کے بعض ایسے کڑوے گھونٹ چپ چاپ پی لیتا جن پر پہلے حشر برپا کر دیتا تھا۔ کبھی وہ کہہ دیتی میں تھکی ہوئی ہوں کھانا نہیں پکایا تو جوتی سنبھالنے کے بجائے چپکے سے بیٹے کو پیسے نکال دے دیتا کہ جا بازار سے روٹی لے آ۔ رحمان نہ صرف خلافِ توقع اس کی بات سہہ لیتا بلکہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کی خوشامد کر رہا ہو۔ بلا ضرورت ہی مٹھائی کی تھیلی اور چوڑی کے ہار شام کو لئے چلا آرہا ہے اور وہ کچھ کہتی تو جواب دیتا "تو کیا ہوا۔ اتنے سے پیسوں میں کمی نہیں آتی۔" بہت سوچنے پر پارو کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ اس کی زبان سے ڈرتا ہے۔ ایک دفعہ غصہ آجائے تو پھر وہ آگے پیچھے کی کچھ نہیں سوچتی۔ ان روپوں کی بابت بھی کچھ نہ کچھ جھک مار ہی دے گی۔ اگر چلو کہہ بھی دے تو آخر اس کا اپنا پیسہ ہے چوری چکاری کا تو نہیں مگر ہاں یہ بھی تو ہے کہ کسی چور اچکے کے کان میں بھنک پڑ گئی تو...... اب وہ اتنی پاگل بھی نہیں...

دن گزرتے رہے۔ پارو کو محسوس ہوا جیسے وہ ذہنی یکجہتی جو ساری عمر نصیب نہیں ہوئی اب بلا کوشش انہیں حاصل ہوگئی ہے۔ کچھ عجیب بات تھی کہ اب اسے بھی رحمان کی باتیں اتنی بری نہیں لگتی تھیں۔ ہمسایوں کے ہاں جانا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ اب ان کا اپنے ہاں آنا بھی کھلنے لگا تھا جیسے وہ کچھ لوٹ لینے آتی ہوں۔ کوٹھری میں ان کا جانا تو اسے زہر ہی لگتا تھا اور وہ یوں ہی اوپری اوپری باتیں کر کے ان کو چلتا کر دیتی تھی۔ واقعی عورت گھر بیٹھے تو گھر کی شکل ہی کچھ اور نکل آتی ہے اور کچھ نہیں تو آنگن ہی لیپ پوت لیا۔ کمر بند ہی بُن لئے۔ پرانے کپڑوں کی کانٹ چھانٹ کر لی۔ خواہ مخواہ وہ اتنے دن وقت ضائع کرتی پھری۔ زبانی جمع خرچ میں رکھا ہی کیا ہے۔

ایک دن خلافِ معمول رحمان زیادہ دیر سے گھر آیا۔ پارو انتظار کر رہی تھی۔ آج مدتوں بعد اس نے آلو بھرے پراٹھے پکائے تھے۔ سوچ رہی تھی۔ ٹھنڈے ہو گئے تو مٹی برابر ہو

جا بیٹھ گئے۔ رحمان کے اندر آتے ہی اس نے ٹھنکا یتا کہا "اے لو آج اتنی دیر کر دی مجھے تو کب سے بھوک لگی ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا" رحمان بھنایا "میں کوئی دفتر تو نہیں جاتا کہ ٹائم ختم ہو تو اٹھ کر چلا آؤں اور نہ تم لاٹ صاحب کی بیوی ہو کہ کھانے کا وقت ایک منٹ اِدھر سے اُدھر نہ ہو، ایسا ہی تھا۔ تو نگل لیتیں میرے بغیر"

"میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ....."

"بس بس رہنے دو میں تمہارا نوکر نہیں ہوں، بہت دنوں سے یہ اکڑ دیکھ رہا ہوں ذرا ایک آدھ گھنٹے کی دیر ہو جائے تو جواب طلبی ہوتی ہے.... بڑی جیسے یہ میری کوتوال...."

"ارے واہ آج تو تمہیں خواہ مخواہ غصہ...."

"کیا کہا؟ مجھے خواہ مخواہ کا غصہ... یعنی جیسے تو نے تو کچھ کہا ہی نہیں... میں پاگل ہوں... جنونی ہوں.... خواہ مخواہ مجھے غصہ آتا ہے.... یہ تو جیسے کچھ کہتی ہی نہیں ہے.... اتنے دن سے مجھے عاجز کر رکھا ہے.... زندگی حرام ہو گئی ہے...." اور رحمان نے پیر سے جوتی نکال کر کھٹا کھٹ اس کے سر پہ بجا دی اور پھر جوتی پہن بھناتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

جب رونا پیٹنا ختم ہوا اور میکے کا خیال دل سے نکلا تو بچے سو چکے تھے اور رحمان پھر بھی گھر نہ آیا تھا۔ کچھ سوچ کر پارو اٹھی، کوٹھری بند کر کے ٹرنک اٹھایا تو دیکھا روپوں والی تھیلی غائب ہے۔

ریت کے باپو
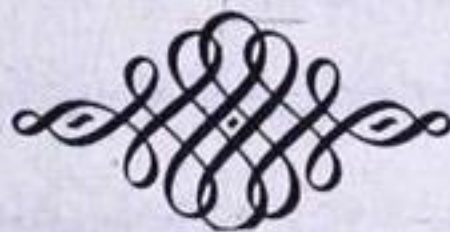
"کہو میرے بچے..... اے مولی! غرور کرنے والے کا سر نیچا کر۔"

ننھے سے بچے نے اپنے ننھے منے سے ہاتھ اوپر اٹھائے، جس میں ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں کی روشنی بھر گئی اور توتلی زبان میں بولا۔ "مولی! غرور کرنے والے کا سر نیچا کر..."

"اور..... اور....."

"بس اور کچھ نہ کہو رشو۔ ہم خود بے حد دکھی ہیں۔ دنیا میں اتنی پریشانیاں ہیں، لوگوں کے لئے مزید دکھ مانگنے سے فائدہ!"

"فائدے اور نقصان کی بات کرتی ہو باجی، یہ سب کچھ جو میں کہتی ہوں وہ تمہارے اور بچوں کے لحاظ کی وجہ سے ورنہ میرے جی سے جو دعائیں نکلتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یا الہی اس شخص کا منہ کالا کر جس نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ــــــ اس کے بیوی بچے بھی اسی طرح تڑپیں اور وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو اور اتنے بے گناہوں کو مارنے کی سزا میں وہ پھانسی چڑھے، تب میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہو۔ ورنہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں کسی دن سوکھے جھاڑ کی طرح بھڑ بھڑ کر کے جلنے لگوں گی اور جلتی ہی جلتی جاؤں گی۔"

"جاؤ منے، ٹیپو اور صائمہ کے ساتھ کھیلو۔" منا سا بچہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور جس نے دعا کے لئے اب تک ہاتھ اٹھا رکھے تھے چپ چاپ اٹھا اور دوسری طرف چلا گیا۔

"منے کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو رشو۔"

"پھر کیسی باتیں کیا کروں باجی۔ میں تو سوچتی ہوں، ہمیں اپنے بچوں کو بتانا چاہیئے کہ ہمارا دشمن کون ہے اور انہیں بڑے ہو کر اُن سے انتقام لینا ہے۔ ہم سے تو ہماری دادیاں

نانیاں بہتر تھیں جو بچوں کو دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے تیار کرتی تھیں۔ میں اپنے بچوں کی تربیت اسی انداز میں کروں گی۔"

"انتقام سے کچھ حاصل نہیں ہوتا راشدہ جان، کوئی صورت ایسی ہونی چاہیے جو اس ملک سے ظلم، ہٹ دھرمی اور جھوٹ کا خاتمہ کر دے۔ انتقام سے ان چیزوں میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"جب تک ظالموں سے حساب نہیں لیا جائے گا اور انہیں دیواروں میں نہیں چنوایا جائے گا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا یا میرے مولیٰ، میں تجھ سے پوچھتی ہوں کیا یہ دعا مانگنی کہ ظالم مارا جائے گناہ ہے؟ کیا یہ دعا مانگنا کہ مغرور کا سر نیچا ہو گناہ ہے؟

"آیئے آپا، آیئے باجی کھانا تیار ہے" تیسری بہن نے دور سے پکار کر کہا۔

"آؤ چلو رشو کھانا کھائیں" ملیحہ نے کہا۔

ملیحہ آگے چلی، راشدہ پیچھے۔ ملیحہ اندر چلی گئی مگر راشدہ سامنے کی گول ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی پچاس فٹ نیچے دریا بہتا چلا جا رہا تھا۔ درمیان میں جگہ جگہ ریت کے ٹاپو اُبھرے ہوئے تھے اور بھرتے پانی میں سے سیاہ چٹانیں جھانک رہی تھیں۔ آسماں سرمئی ہو گیا تھا۔ رات ہو چلی تھی۔ ایک اور سیاہ ڈراؤنی رات کا آغاز تھا۔ صبح پھر وہ اپنے شوہروں سے ملنے جائیں گی۔ وہ چھوٹ جائیں گے یا انہیں سزا ہو جائے گی اگر انہیں سزا ہو گئی تو ان ننھے ننھے بچوں کا کیا ہو گا جو ابھی سزا اور جزا کے معنی بھی نہیں جانتے۔ چودہ سال اگر بچے بغیر باپ کے رہ لیں تو کیا پھر انہیں باپ کی کوئی ضرورت رہ جاتی ہے؟ کیا کوئی عورت چودہ سال بغیر شوہر کے رہ سکتی ہے؟ چودہ سال بغیر سرمد کے، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے شوہر کو سزا ہوئی تو وہ منے کو گود میں لے کر دریا میں کود جائے گی۔ اس خیال سے اسے سکون سا محسوس ہوا۔ اس کے آگے اس نے قطعی نہ سوچا کہ پھر اس بہن اور اس کے بچوں کا کیا ہو گا۔ جس کے شوہر اور اس کے ماں باپ کو بھی سزا ہو گی اور ان چار عدد بوڑھوں کا کیا ہو گا۔ جن کے بیٹے اور داماد جیل میں ہوں گے۔ جن کی بیٹیاں اور بہوئیں، نواسے اور نواسیاں، پوتے

اور پوتیاں ہوا میں جلنے والے چراغوں کی طرح سامنے دھرے ہوں گے۔ اس میں سے ایک بہو اور بیٹی جب اپنے بیٹے کو گود میں لے کر دریا میں کود جائے گی تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ یہ سب کچھ اس نے اس لیئے نہ سوچا کہ جس خیال سے اسے سکون ملا تھا اس کے آگے سوچتی تو سکون تہہ و بالا ہو جاتا۔ ہیں ننھے منے سکون وہ خیالات محض ریت کے ٹاپو ہیں جو ایک دن دریا میں اُبھرتے ہیں اور دوسرے دن کے تیز دھارے میں بہہ کر غائب ہو جاتے ہیں۔

جب بوڑھا خان گل اس سے کھانے کے لیئے کہنے آیا تو راشدہ نے پوچھا "ملنگ بابا کو کھانا بھجوا دیا۔؟"

"بابا تو چلا گیا۔ وہ تو اندھیرا ہوتے ہی چلا جاتا ہے۔"

"تو پھر اندھیرا ہونے سے پہلے کیوں نہیں بھجوایا۔ کتنی مرتبہ کہا ہے اسے کھانا جلدی بھیج دیا کرو، مگر کوئی سنتا ہی نہیں —— بس میں بھی نہیں کھاؤں گی کھانا۔"

خان گل کو معلوم تھا یہ غصّہ، یہ احتجاج کسی ایک پر نہیں تھا۔ نہ بابا پر جو جلدی چلا گیا، نہ اس پر تھا۔ بس یہ غصّہ تو اس بات پہ تھا کہ اس کا شوہر قیدی کیوں تھا اور اس بات پر بھلا کس کا بس تھا، بلیحہ شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں پھر دبے پاؤں گول ستون کے پاس آکھڑی ہوئی "اچھا بی بی نہ کھاؤ —— میں بھی نہیں کھاؤں گی، افروز بھی نہیں کھاتے گی، بچے اور بابا بھی نہیں کھائیں گے۔ آج فاقہ ہی سہی۔" تب راشدہ نے غصّے میں جھنجلاتے ہوئے پلٹ کر بہن کو دیکھا مگر اندھیرے میں دونوں ایک دوسرے کے تاثرات نہ دیکھ سکیں۔ راشدہ پیر پٹختی اندر چلی۔

"اچھا بابا —— یہاں کوئی اپنی مرضی سے بھر کا بھی نہیں رہ سکتا ——"

"یہاں کون مرضی سے کیا کر سکتا ہے رشو جان۔" بلیحہ کے لہجے میں دکھ تھا، مگر صبر و تحمل کے ساتھ ——

کھانا زہر مار کر کے بلیحہ بچوں کو سلانے لے گئی۔ وہ سارے بچوں کو کہانیاں سناتی تھی۔

منا چھوٹا تھا۔ وہ سب سے پہلے سو جاتا تھا۔ راشدہ اس کی طرف سے ویسے بھی بے فکر تھی۔ وہ بلیجہ ہی کئے بچوں کے ساتھ کھاتا، کھیلتا اور سوتا تھا۔ وہ پھر باہر نکل گئی۔ رات کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ دریا کچھ اور سیاہ ہوگیا تھا مگر آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے تارے کہہ رہے تھے۔ ہماری طرف دیکھو جب تک ہم موجود ہیں۔ رات کی تاریکی قطعی اور آخری نہیں ہوسکتی۔ راشدہ پھر گول ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس جگہ وہ پہلے بھی دو تین مرتبہ آئی تھی۔ ایک مرتبہ شادی سے پہلے جب سرمد کا اور اس کا رومان چل رہا تھا تو وہ خاندان کے بہت سے افراد کے ساتھ یہاں آئے تھے اور جب دریا پر سے براہِ راست چٹانوں پر چڑھ کر اوپر پہنچنے کا مقابلہ ہوا تھا تو راشدہ سب سے آگے بھاگ لی تھی اور سرمد بے چارہ جو اس کے جوتے اٹھا کر پیچھے پیچھے آیا تھا۔ سب کے مذاق کا نشانہ بنا تھا۔

اور شادی کے بعد جب وہ کچھ دن رہنے کے لئے یہاں آئے تھے تو انہوں نے کتنی مرتبہ سورج کو ڈوبتے ابھرتے دیکھا تھا۔ دریا کے کتنے مختلف موڈ، چاندنی راتوں کے کیسے کیسے سہانے منظر، پہاڑوں کے کیسے پیارے روپ دیکھے تھے۔ ملکہ نور جہاں کی پرانی سرائے میں، اس خستہ حال کوٹھے میں جو سڑک کے بیچوں بیچ واقع تھا اور اس قلعہ میں جہاں آج سرمد قید تھا وہ کیسے حیران اور خوش باش بچوں کی طرح ہاتھ پکڑے پھرتے تھے۔ پہاڑیوں پر ہری جھاڑیوں کے درمیان طمانیت کے ساتھ گھاس چرتی بکریاں اور وہ دونوں اس سارے منظر کا ایک حصہ ہی تو لگتے تھے۔ قلعہ کے نیچے گہری کھائی، بل کھاتی سڑک اور زوں زوں کرتی گاڑیاں اور ٹرک اور بڑا سا پل اور چھوٹے بڑے پتھر اور دور سے چمکتے سفید سنگِ میل اس وقت ان سب چیزوں کے کچھ اور ہی معنی تھے۔ زندگی سے بھرپور اور حسن سے بھرپور — اور اب یہی سب چیزیں کیسی بے روح اور بیزار کن لگتی تھیں۔ جھاڑیاں سوکھی، پتھر بے جان، کھائی ڈراؤنی اور ملکہ کی سرائے اندھیری ہوگئی تھی۔ خستہ حال کوٹھے بس جیسے بھوت آن کر بس گئے تھے۔ جو راتوں کو تیز ہوا کے شور میں بین کیا کرتے

تھے۔ سنگِ میل جیسے سرِراہ کوئی کسی کے انتظار میں سر نہوڑائے بیٹھا ہو اور ردے یا پتھروں سے سر ٹیکتے تھکتا ہی نہ تھا۔

راشدہ نے گول برآمدے کا پورا چکر کاٹا اور پھر پچھلی طرف آن کر نیچے جھانکا۔ تیز ڈھلان پر نیم دائرہ سا بناتی ہوئی پگڈنڈی جس جگہ جاکر سڑک سے ملتی تھی، وہاں ایک بوڑھا گاڑھے کا سفید کرتہ پہنے سنگِ میل کی طرح بیٹھا رہتا تھا۔ صبح پو پھٹتے وہ آتا تھا اور سورج غروب ہوتے ہی چلا جاتا تھا سانس پھلانے والی چڑھائی پر چڑھتے اور بھاگتی ہوئی ڈھلوان پر اترتے لوگوں نے اسے صرف ایک جملہ کہتے سنا تھا:

"جو اوپر ہیں وہ نیچے آئیں گے —— جو نیچے ہیں وہ اوپر جائیں گے۔" یہ جملہ راشدہ کو بڑا معنی خیز لگا تھا۔ پہلی مرتبہ سن کر اس نے ملیحہ سے کہا تھا۔

"سنا باجی یہ بوڑھا بابا کیا کہہ رہا ہے۔"

ملیحہ نے کوئی اہمیت نہ دی تھی "ظاہر ہے جو چڑھائی پر اوپر گیا ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی نیچے بھی اُترے گا۔"

"تم نہیں سمجھیں باجی، اس کا مطلب ہے جو لوگ اس وقت اوپر ہیں، خدا بنے بیٹھے ہیں وہ جلد نیچے اتریں گے —— اتنے نیچے کہ پاتال سے بھی نیچے۔" ملیحہ ہنس دی تھی۔ ہر بات میں سے اپنے مطلب کی بات نکال لینا کچھ ایسا مشکل نہیں ہوتا۔ راشدہ نے بہت کوشش کی کہ بوڑھا اس جملے کی تفصیل میں کچھ کہے مگر وہ کبھی کچھ نہ کہتا۔ آدمیوں کے آر پار وہ یوں دیکھتا جیسے وہ شیشے کے بنے ہوئے ہوں اور جب کبھی اس کا اپنا جی چاہتا کہے چلا جاتا "اوپر والے نیچے آئیں گے، نیچے والے اوپر جائیں گے۔"

راشدہ اس جملے کی صداقت کی منتظر تھی کہ مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ سرمد کو اور اس کے بھائی کو کہ ملیحہ کا شوہر تھا۔ چودہ چودہ سال کی سزا ہو گئی۔ راشدہ کی خودکشی کا سارا منصوبہ دھرا رہ گیا۔ اس لئے کہ کورٹ میں وہ سزا سن کر گم سی تو کسی چیز کا کوئی تیز کونا اس

کے سر میں کھُب گیا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنی سسرال میں تھی جہاں اس کی بوڑھی ساس کسی ذمہ دار اور حساس نرس کی طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔ سوتے جاتے اسے پیار کرتی تھی اور اس پر سو جان سے فدا تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اپنے جیل جانے والے بیٹے کا سارا پیار دُلار بہو پر نچھاور کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس دکھی کنبے نے اپنے دکھ اور اپنے پیار کچھ عجیب طور بانٹ لئے تھے۔ ملیحہ ماں باپ کے ساتھ چلی گئی تھی اور راشدہ منّے کے ساتھ سسرال میں تھی ــــــ تو کیا چودہ سال وہ اپنی بوڑھی ساس کی بوڑھی باہوں کے سہارے گزارے گی!! یا اللہ کیا ہوگا! چودہ سال، ایک جگ ہے، ایک صدی ہے کیا ہے! اب جو کچھ بھی ہو۔ وہ یہ گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ دکھوں کے بندھن پیار کے بندھنوں کے ساتھ گتھے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے الجھیڑے پڑ گئے تھے، کچھ ایسی گرہیں لگ گئی تھیں جنہیں نہ وہ سلجھا سکتی تھی نہ توڑ سکتی تھی ــــــ بس جینا تھا، ہر حال میں جینا۔

اور جب کبھی اس کے دل کے سلگتے کونے لودے اٹھتے یا وہ کوئی نئی جی جلانے والی خبر پڑھتی یا سنتی تو کہتی ”مولیٰ غرور کرنے والے کا سر نیچا کر۔“ اور کبھی وہ ملنگ بابا کی طرح بُڑ بُڑانے لگتی ”اوپر والے کب نیچے آئیں گے، نیچے والے کب اوپر جائیں گے۔“ اور کبھی وہ کہتی ”لوگوں کو کیوں اتنا شوق ہے اس چھتر کے سائے میں بیٹھنے کا حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ جو کوئی اس چھتر کے سائے میں بیٹھا ہے اس کے دن گنے گئے ہیں۔“

گھر میں اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ گھر کے سنکی بوڑھوں کی طرح اس کی بے تکی باتیں برداشت کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر اس کی بوڑھی ساس اُٹھ کر اسے گلے سے لگا کر اس کے بالوں پہ پیار کر لیتی تھی اور تب وہ شرم سے غصّے سے اور دکھ سے بلک کر رو پڑتی تھی ــــــ اور پھر جب شام کا سورج

ڈوبتا تھا اور وہ اپنے منّے کے ساتھ باغ میں ٹہلتی تھی تو اس کے منّے منّے ہاتھ دعا کے لئے اٹھواتی تھی، جس میں ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں بھر جاتی تھیں اور کہتا تھا۔ ”اللہ میاں، غرور کرنے والے کا سر نیچا کر۔“ اور تب راشدہ کو دور افتادہ بستی کا وہ ملنگ بابا یاد آتا تھا جو کہا کرتا تھا ”اوپر والے نیچے آ جائیں گے اور نیچے والے اوپر جائیں گے۔“

اور جس دن راشدہ نے خبر سنی کہ غرور کرنے والے کا سر نیچے ہوا تو اس نے اسی وقت دور افتادہ بستی میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ کم ہی کسی چیز کی فرمائش کرتی تھی اور جب وہ کسی چیز کی خواہش کر بیٹھتی تھی تو خواہ وہ بھول جائے لیکن ساس سسر اسے پورا کرنا اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ خود اسے لے کر وہاں گئے۔ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ ملنگ بابا اس وقت نہیں تھا۔ راشدہ اوپر کھڑی دریا کو تکتی رہی۔ خنکی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ ساس نے چپکے سے آن کر اس کے کندھوں پر شال ڈالی اور واپس چلی گئیں۔ دریا کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ ریت کے سارے ٹاپو اور سیاہ چٹانوں کے تیز کونے پانی میں چھپ گئے تھے۔ پانی جو کبھی کبھی بہت دور سے چمکا کرتا تھا۔ آج پہاڑی کے قدموں کو چھو رہا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ پانی کے شور اور گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں ایک خوف سا تھا۔ وہ جو اس سارے علاقے میں راتوں کو بے خوف و خطر گھوما کرتی تھی دل ہی دل میں کانپتی اندر چلی آئی۔

صبح پو پھٹے وہ اٹھی، باہر نکل کر پچھلے حصّے کی طرف گئی۔ ملنگ بابا ابھی نہیں آیا تھا واپس آ کر وہ منّے کے پاس لیٹ گئی۔ جب دن چڑھ آیا تو ناشتے کے بعد وہ منّے کو لے کر باہر نکلی۔ بابا اب بھی وہاں نہیں تھا۔ چوکیدار باہر کھڑا مرغیوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔

”یہاں جو بابا بیٹھا رہتا تھا وہ کہاں گیا؟“ اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

”اسے پکڑ کر لے گئے۔“

”کیوں؟“

"بس جی ـــــ کچھ ایسی ہی بات تھی۔" وہ پراسراریت سے بولا۔

"کیا وہ کوئی غلط آدمی تھا؟" راشدہ کو اچانک یاد آیا کہ ایسا حلیہ عموماً جاسوسوں کے ساتھ وابستہ سمجھا جاتا ہے۔

"نہیں جی، وہ تو ملنگ آدمی ہیں" چوکیدار بولا "ہم تو بچپن سے انہیں جانتے ہیں۔"

"تو پھر؟"

"جی وہ میں نے کہا نا کچھ ایسی ہی بات تھی۔"

"آخر ایسی کیا بات تھی؟" راشدہ کے لہجے میں تلخی دیکھ کر چوکیدار کسمسایا۔

"جی وہ دراصل ملنگ بابا پائجامہ نہیں پہنتے تھے ـــــ صرف ایک کرتہ پہنے رہتے تھے۔" چوکیدار نے منہ پھیر لیا۔ جیسے وہ کسی عورت کے سامنے یہ بات کہنا نہ چاہتا ہو۔ مگر مجبوراً کہہ رہا ہو۔

"امی وہ بابا ہر وقت کیا کہا کرتے تھے؟" منّے نے پوچھا۔

"وہ کہا کرتے تھے ـــــ اوپر والے نیچے آئیں گے اور نیچے والے اوپر جائیں گے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے امی؟"

"ایک بات کے بہت مطلب ہوتے ہیں بیٹے۔ میں تمہیں کیا سمجھاؤں ـــــ وقت الفاظ کے پرت کھولتا ہے۔ لوگوں کے پرت کھولتا ہے، تاریخ کے پرت کھولتا ہے، چھپی ہوئی چیزوں کے، زندگی اور موت کے اور جانے کس کس کے ـــــ"

"جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو اس کا مطلب سمجھ جاؤں گا نا امی؟" منّے نے پُر امید لہجے میں کہا۔

"تم بڑے ہو گے تو اس جملے کا مطلب کیا ہوگا، کون جانے بیٹے" راشدہ نے منّے کی حیران آنکھیں چوم لیں۔

بڑِّماں

وہ بڑی اماں سے کب بڑِّماں بنیں۔ کسی کو یاد نہیں۔ ان کی عمر کا بھی کسی کو اندازہ نہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا وہ لاکھوں لاکھ تو نہیں مگر ہاں صحت کی اچھی تھیں اور پھر برسوں ان میں ذرا سی تبدیلی بھی نہ آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسی ہیں سدا ایسی ہی رہیں گی۔ سالہا سال سے وہ کسی تاریخی عمارت کی طرح قائم و دائم تھیں جس کے نہ ہونے کا کبھی کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔

آنکھوں دیکھی نہیں کانوں سُنی ہے کہ جب اولاد نہ ہونے کے بہانے میاں نے دوسری شادی کی تو یہ ماتھے پر بل نہ لائیں۔ سوکن کی ساری اولاد کو یہ پیدائش کے بعد یوں سمیٹ لیتیں جیسے قدرت نے یہ تقسیم کار کر رکھی ہو کہ وہ جنیں اور یہ پالیں۔ چھوٹی کے سارے بچے انہیں بڑِّماں کہتے اور یوں چمٹے رہتے جیسے گُڑ پہ چیونٹیاں۔ ریڈیو پہ فلمی گانوں کی فرمائش کی طرح ان کی فرمائشوں کا کوئی اختتام نہ تھا۔ ہاتھوں کا میل اتارنے کے انداز میں روٹیاں مل مل کر بڑِّماں ملیدہ بناتیں اور خوب شکر گھی ڈال کر ان کو ٹھونساتیں۔ میدہ بھون کر اس میں آم اور چینی ملا کر گُڑمبا پکتا۔ بچے بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ اسی ہبڑ دبڑ میں چھوٹی کو خبر ہو جاتی۔ وہ آن کر بڑبڑاتیں۔

”اے بڑی کیا ہو گیا ہے تمہیں مہینے کا گھی دو دن میں لنڈھا دو گی، اے واہ روز حلوے روز پراٹھے۔“

بڑی جل کر کہتیں ”اے رہنے دو، تمہیں گھی بچوں سے پیارا ہو گا ہوا۔ کون سے حلوے پکے ہیں، ایک ذرا لپٹا بنا کر دے دیا تو قیامت آ گئی۔ جاؤ تمہارا کیا کام ہے۔ اپنے میاں کے کولہے سے لگ کر بیٹھو۔ میں جانوں میرے بچے۔“

یہ سب یوں ہوتا جیسے دو بہنوں میں لاگ لپیٹ ہو رہی ہو۔ میاں آ جاتے تو کہتے۔

"ہاں ہاں بچے ہیں۔ کھانے دو، بڑی ہمیں بھی چکھانا"

"اے خاک، یہ مِٹا حلوہ ہے؟ نہ خشک میوہ، نہ کیوڑہ نہ الائچی۔ یوں ہی بچوں کو بہلانے کو بنا دیا ہے۔ تمہارے حلق سے کہاں اُترے گا"

میاں ہنستے، چھوٹی بڑبڑاتی چلی جاتیں اور بڑی آں فخر سے بچوں کو بلا بلا کر دیتیں "لے چنو تو اور لے لے، اے ٹکن تو بھی چکھ"۔ بچوں کے درد سر سے الگ رہ کر چھوٹی کو کتنا سکون تھا۔ اور چھوٹی سے بچوں کو چھین کر اپنا لینے میں بڑی کے جذبہ رقابت کو کتنی تسکین ملی تھی، یہ تو وہ جانیں یا اُن کا خدا مگر یہ ضرور ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ رات کو کبھی بڑی آں اُٹھتیں اور میاں کے شبستان کا دروازہ بند پاتیں تو دل پر گھونسہ سا پڑتا مگر جلد ہی وہ جی بہلانے کو بچوں میں گم ہو جاتیں۔ کبھی کبھی میاں جگنو بنے ان کی اندھیری کوٹھری کو جگمگانے بھی آتے مگر اب انہیں خود ہی سیجیں سجانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ دل کے نازک شیشے پر بال تو پڑ ہی چکا تھا۔ "اونہہ ہٹاؤ ـــ یہ کیا بڑھپس ہے۔ دائیں بائیں بچے سو رہے ہیں" وہ عذر پیش کرتیں۔

خدا ایک در بند کرتا ہے تو ستر در کھول دیتا ہے۔ بڑی آں پر محبت کا ایک در بند ہوا تھا تو واقعی ستر در کھل گئے تھے۔ جس کو دیکھو مارے محبت اور مروت کے بچھا جا رہا ہے۔ خاندان میں کوئی شادی بڑی آں کے انتظام کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔ کتنی ہی شادیاں بڑی آں کی بیماریوں کی وجہ سے ٹل ٹل گئی تھیں "نہ بھیا، بڑی آں ہمارے خاندان کی بزرگ ہیں، ان کی شرکت کے بغیر یہ شادی نہ ہو گی۔ وہ چلنے پھرنے لگیں۔ تو تاریخ مقرر ہو"

شادیوں میں وہ کئی کئی رول ادا کرتیں، شادی کا حساب کتاب، کھانے کا انتظام اور پل پل پر ضرورت پڑنے والی ہر چیز کا خیال "اے فلانے بازار جا رہے ہو تو دلہن کی نتھ کے لئے دو مومی موتی اور ایک پچی لیتے آنا"۔ "یہ چیزیں دولہا کے گھر کی ہووے ہیں" موقع پڑتا تو جا کر سمدھیانے سے بھی بھڑ لیتیں "اے تم دلی والوں کے ہاں یہ رواج ہو گا۔ ہمارے ہاں

یہ دستور نہیں۔" غرضیکہ بڑی ماں کیا تھیں اچھی خاصی اکسیر تھیں کہ سر میں درد ہو تو ماتھے پر تھوپ لو۔ پیٹ میں درد ہو تو پانی میں ڈال کر پی لو۔ الٹیاں ہوں تو چینی میں دو قطرے ڈال کر چٹا دو۔

دیور کے ہاں جاپا ہونے لگتا تو وہ دہلیز کی مٹی لے ڈالتے۔ بھابی کے بجائے وہ بھی بڑی ماں ہی کہتے "ارے چلو بڑی ماں تمہاری دلہن تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔ کچھ دن تو وہ ٹالتیں۔ پھر آخر بارے مروت کے اپنی پوٹلی میں اٹرم سٹرم باندھتیں۔ ادھر دو چار چھوٹی منجھلی لونڈیاں چھوٹی کی ناں ناں کرتے ان کے ساتھ ہولیتیں۔ "اے جانے دو تم سے باقی ہی نہ سنبھلیں گے۔ وہ چھوٹی کے پھوہڑپن کا علی الاعلان تذکرہ کرتیں۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ یہ تو وہاں جا کر نوزائیدہ کے پوتڑے کھولنے باندھنے اور اٹھوارے سٹھوارے میں لگ جاتیں، یہاں باقی بچے چھوٹی اماں کو ناک چنے چبوا دیتے۔ بچے جن جن کر کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ یہ جان لیوا کام اب اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا تھا مگر بڑی کے جانے کے بعد اتنی جانوں کو سمیٹنا اور ان کی ہٹیں پوری کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ ان کو گئے دو چار دن ہوتے کہ یہ ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتیں۔ مشکل سے کچھ دن اور صبر کرتیں۔ پھر ڈولی لے کر پہنچ جاتیں "اے ہے تم تو آکر بیٹھ رہیں کچھ گھر کی بھی خبر ہے۔ بچوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔"

"لو اور سنو، ابھی کچی کو چھوڑ کر کیسے آجاؤں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں مجھے آئے۔"

"میں کیا جانوں، منجھلے کو کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ کھانس کھانس کر دم دیئے دے رہے ہے۔"

"اے ہے یہ کیا ہوا۔ میں تو اچھا بھلا چھوڑ کے آئی تھی۔ شہتوت کے پتے اور شہد چٹایا؟"

"سب کچھ کر لیا۔" چھوٹی یوں کہتیں جیسے اب دواؤں سے گزر کے دعا کی کسر رہ گئی ہو۔

"لو بوا سنبھالو اپنا ٹلوہ، میں چلی۔ جانے میرے بچے کو کیا کر دیا اے۔ لاکھ کوئی روکے وہ نہ رکیں گی۔ گھر آکر دم لیں گی اور منجھلے کی پٹی سے پٹی لگا کر رات رات بھر جاگیں گی۔ بھولی میں

الا بلا بھون کر اسے دیں گی اور چھوٹی یوں الگ ہو جائیں گی جیسے کسی کو امانت لوٹا کر مطمئن ہو گئی ہوں۔

بھابیوں کے گھر کوئی بیمار ہو، بچہ ہونے والا ہو یا کسی بچے کی روزہ کشائی ہو، کوئی نہ کوئی بڑتاں کو لینے آپہنچتا۔ وہ تھوڑا بہت عذر کرتیں، پھر اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیتیں۔ بھابیوں کی ضرورت پر ان کا جانا بھی ضرور اور چھوٹی کا یہ کہنا بھی "اب جا کر بیٹھ نہ رہنا۔ جلدی آجانا تمہارے پیچھے یہ بچے مجھے کھا جائیں گے۔ تمہارے لاڈ نے دو کوڑی کا کر دیا ہے انہیں۔"

"ہاں ہاں میں نے تو سب کو بگاڑا ہے چلو تم اچھی ہو کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں" اور یہ سچ تھا کہ کوئی بچہ بیمار ہو، چوٹ لگ جائے یا جل جائے، روتا چھینکتا سیدھا بڑتاں کے پاس آتا۔ چھوٹی مارے مامتا کے درمیان میں کہتی رہ جاتیں "ارے کیا ہوا، ادھر آ میں دیکھوں"، بچہ پلٹ کے دیکھے بغیر سیدھا اس اندھیری کوٹھڑی میں پہنچتا۔ جو بڑتاں کا ٹھکانہ تھا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں سارا زمانہ سو جاتا۔ نہ سوتیں تو بڑتاں اور ان کے چیلے چانٹے۔ وہ بیٹھی چھوٹی چھوٹی ریشمی کترنوں سے بٹوے سیتی رہتیں اور بچے لڑتے رہتے "یہ میرا ہے"۔

"واہ تمہارا کہاں سے آگیا۔ اُس دن بھی تم نے لیا تھا۔ یہ میرا ہے ہے نا بڑتاں؟" وہ بڑتاں کو مسکوٹ میں ملاتا۔

"اے ہے بننے تو دو۔ پہلے ہی ہائے ہائے ڈال دی۔ لے بڈھا کا پکڑ"، دھاگے پٹتے، بٹوے اور تنلے دانیاں بنتیں اور بٹتیں۔ قرآن شریف کے کونے غلاف گوٹے لچکے لگ کر تیار ہوتے۔ اس سے دل اُکتا تا یا بچے فرمائش کر بیٹھتے تو جلتی دوپہر یا میں چولہے کے پاس جا بیٹھتیں اور منڈ کلیاں شروع ہو جاتیں۔

ایک دیور جانے کہاں کالے کوسوں رہتے تھے۔ بیوی کے بچہ ہونے لگا تو انہوں نے بڑتاں کو بلا بھیجا۔ چھوٹا سا قصبہ جہاں کوس بھر پر کوئی بڈھی بھڈی دائی رہتی تھی اس کا

سہارا تھا۔ ہونی شدنی عین وقت پر برابر کے گاؤں میں میت ہو گئی۔ وہ پرسے میں چلی گئی۔ ایسے وقت میں خدا نے بڑماں کو ہمت دی کہ انہوں نے باورچی خانے کی کٹھل چھری سے نال کاٹا گرم پانی کر کے بچے کو نہلایا اور جیسے تیسے زچہ کو سنبھال لیا — دائی اپنا حق چھینے جانے پر دل ہی دل میں عرصے تک پیچ وتاب کھاتی رہی۔

انہیں کے ہاتھوں ایک اور بچی نے ریلوے ٹرین میں جنم لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب بچے خدا کی دین ہوا کرتے تھے۔ ہر سال نہیں تو دوسرے سال ہر گھر میں ایک نئی روح کا آنا گویا فرض تھا۔ اسی لئے ہر گھر میں بڑی کا پھیرا لگتا ہی رہتا۔ سینکڑوں بچے دائی اور نرس کے ہاتھ سے سیدھے بڑماں کے ہاتھوں میں آتے تھے۔ ان کے ہاتھ سے گھٹی پینے والے بچوں کی گنتی ہی نہ تھی اور تو اور خاندان کی دو ایک بوڑھی عورتوں کو قبر میں پہنچانے سے پہلے غسل دینے کا کام بھی کر چکی تھیں۔ غرض کوئی ایسا کام نہ تھا جسے کوئی عورت کر سکے اور بڑماں نہ کر سکیں۔ احسان ماننے والے جس طرح دامے درمے بن پڑتا ان کا احسان اتارنے کی کوشش بھی کرتے۔ چلتے وقت کسی نے بنارسی ریشمی جوڑا بنا دیا، کسی نے نئی رضائی دے دی۔ اس طرح ان کا پٹارا ٹرنک ریشمی کپڑوں سے پر رہتا۔ پہنتی تو کم ہی تھیں، موج میں آتیں تو بھانجی بھتیجیوں کو بانٹ دیتیں۔

ایسے ہی کسی کام سے گھر سے کوسوں دور تھیں کہ میاں کی بیماری کا تار پہنچا۔ ہوائی جہاز ان دنوں تھے مگر صرف آسمان پر اڑتے نظر آتے تھے۔ ان میں سفر کرتے کسی کو نہ سنا تھا۔ لے دے کر ریل گاڑیاں تھیں جو کھڑ پڑ کر تین دن رات چلتیں تو دو تین دن میں لمبے سفر بھی طے ہو ہی جاتے۔ بڑماں گھر پہنچیں تو میاں کو زمین کے نیچے سوئے بھی دیر ہو چکی تھی۔ باہر ٹوپی اوڑھے مرد چنے پڑھنے میں مصروف تھے۔ اندر دوپٹوں سے سر ڈھانکے عورتیں مل کر قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ خود تو عرصے سے بیواؤں کی طرح رہتی تھیں مگر سوکن کا سفید دوپٹہ اور سر کنڈے سے ہاتھ دیکھ کر دل پہ گھونسا سا پڑا اور وہیں دہلیز پر گر پڑیں۔ پھر جب ہوش

بس آئیں تو سارا گھر پہلے کی طرح سنبھال لیا۔ چھوٹی سے وہ پہلے بھی نہیں جلتی تھیں۔ اب تو وہ قابل رحم تھی۔ اس کے پاس ایک میاں تھا وہ بھی نہ رہا۔ ان کے بچے ماشاء اللہ سب جیات تھے، پھل پھول رہے تھے۔ جس طرح مالی اپنی پھولتی پھلتی کیاری کو دیکھ کر خوش ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح بڑماں اپنے پوتوں اور نواسوں کی فوج کو دیکھ کر نہال ہوتیں۔ بچے بھی سب بڑماں کو برابر یاد رکھتے۔ آخر ان کے گھروں میں بھی روز بیماریاں، تقریبیں اور بچے ہوتے تھے۔

بڑماں پر دوسرا بڑا صدمہ چھوٹی کی موت تھی جس نے ان کی کمر توڑ دی۔ ایک دو نہیں۔ تیس بتیس سال کا ساتھ۔ پھر اس نے خدمت بھی تو نہیں کروائی۔ اس کا بھی انہیں غم تھا۔ بس بیٹھے بٹھائے چل کھڑی ہوئی جیسے میاں کے پاس جانے کو ادھار کھائے بیٹھی تھی بڑماں کو یوں لگا جیسے کوئی برسوں کی تھامی ہوئی لاٹھی ہاتھ سے چھین کر بھاگ گیا ہو۔ اچانک دنیا کیسی خالی خالی لگنے لگی۔ اس زندگی میں کیا خاک رکھا ہے جس میں چھوٹی اور میاں نہ ہو۔ ان کے بچے جیات تھے۔ مگر اصل میں یہ تھے تو اسی بیل کے بیج جو آج اچانک سوکھ گئی تھی۔ چھوٹی کسی گھناؤنی سی بیماری میں مبتلا ہوتیں، بیماری طول کھینچتی، کچھ دل پر میل آتا تو اور بات ہوتی مگر ان کے یوں چل دینے میں تو سوائے احساسِ محرومی کے کچھ نہ تھا۔ بڑماں اس چھت کی طرح بیٹھ گئیں جس کے نیچے سے اچانک ستون کھینچ لیا گیا ہو۔ اس بڑی سی حویلی میں جہاں کبھی بند دروازے دل پر دھوکے دیتے تھے، گھومنے پھرنے کا کچھ مزا نہ رہا، آج بھائیں بھائیں کرتے کھلے دروازے کھانے کو آتے تھے۔ حلوے بنانے میں کوئی سواد نہ تھا۔ جب گھی پر کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ بچوں کے ساتھ چاؤ چونچلوں میں بھی جب ہی سکھ تھا کہ چھوٹی مقابلے پر تھی۔ اب تو وہ پالے کے اس مرغ کی طرح تھیں جس کے سارے مقابل مر کھپ گئے ہوں۔ ایسی جیت اور شاہی کس کام کی!!

پھر وہ دور آیا جو اب تک بہت سے دلوں میں ناسور بن کر پل رہا ہے جس نے تخت والوں کو تحت الثریٰ میں پہنچایا اور بوریا نشینوں کو بادشاہی دی۔ ۱۹۴۷ء میں

سارا کنبہ ریزہ ریزہ خون سے چھینٹم چھانٹ بے گھر، بے در اس سرزمین میں پہنچا جسے کہتے ہیں پاکستان اور پورے ملک میں جس کو جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی بیٹھ گیا۔ اس افراتفری میں کیا کھویا کیا پایا یہ حساب کتاب کرنے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی۔ نفسا نفسی کا ایک دور تھا، آیا اور چلا گیا مگر وہ بات پھر پیدا نہ ہو سکی، اکھڑے دل پھر نہ جمے۔ جمنے کی کوشش میں لوگوں نے چاہا اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔ کھودنا ہی ہے تو کیوں نہ ذرا گہرائی تک کھودیں۔ سب اسی کھودنے اور جمنے کی تگ و دو میں پڑ گئے اور کسی نے نہیں دیکھا کہ بڑماں اس بوڑھے درخت کی طرح جس کی ایک آدھ ہی جڑ جم پائی ہو، آہستہ آہستہ سوکھ رہی ہیں۔ اس حادثہ دارو گیر میں ان کا پرانا بدرنگ بدھ تک تو صحیح سلامت پہنچ گیا مگر وہ خود آدھی آپائیں نہیں۔ ان کے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا جس کا احساس ایک دم نہیں دھیرے دھیرے ہوا۔ کام کرنے کی وہ بے پناہ دھن اب نہیں رہی تھی کسی نے کہہ دیا تو کر لیا ورنہ بس ٹہلے جاتیں، جیسے پاؤں میں پہیے لگ گئے ہوں یا کسی نے چابی دے کر چھوڑ دیا ہو۔

بڑماں اب بس کرو تھک جاؤ گی۔" لو بیٹھ کر یہ سبزی بنا دو"، وہ سبزی بنا دیتیں اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتیں۔ چلتے چلتے خود ہی بڑبڑاتی رہتیں۔ کوئی غور سے سنتا تو بڑبڑاہٹ کا موضوع کوئی ایسی بات ہوتی جو انہیں بری لگی ہو چاہے وہ آج ہوتی ہو یا مہینوں برسوں پہلے۔

"بڑماں کس سے باتیں کر رہی ہو؟"، کوئی پوچھتا تو وہ چڑ جاتیں۔

"اے واہ کس سے باتیں کر رہی ہوں۔ خواہ مخواہ مجھے تنگ نہ کیا کرو"، اور ٹہلے جاتیں، ٹہلے جاتیں۔ اسی وجہ سے انہیں بھوک زیادہ لگتی ہر وقت وہ باورچی خانہ ٹٹولتیں۔ اب وہ اتنا کام بھی نہ کرتی تھیں کہ گھر کے بچوں سے بڑھ کے انہیں کھلایا جائے۔

"اے ہے بڑماں۔ تم نے تو بچوں کو مات کیا۔ ہم نے تو تم سے ابھی پہلے ناشتہ

کیا ہے۔''

''بھوک لگی ہے''، وہ لجاجت سے کہتیں۔ پھر جو کچی کچی روٹی۔ باسی سالن اور پڑا پڑا یا دودھ نظر آتا پی ڈالتیں۔ کھا پی کر وہ پھر ٹہلنا اور بڑبڑانا شروع کر دیتیں۔

یہ چہل قدمی اتنی بڑھی کہ کمروں اور دالان کا چکر لگا کر انہوں نے گھر والوں کو گھن چکر بنا دیا۔ ہر وقت کی بھوک نے گھر والوں کو کھا لیا اور بڑبڑاہٹ کا یہ عالم ہوا کہ وہ چلتی ہوا سے لڑنے لگیں۔ چڑیا بولتی تو جھنجھلا جاتیں ''اے واہ، جا اپنا کام کر، کیوں دماغ چاٹ رہی ہے۔ مار چوں چوں چوں چوں کوئی اور کام نہیں ہے تجھے''، مرغی کڑکڑاتی تو چلاتیں ''ہاں ہاں بیگم صاحبہ، سن لیا، انڈا دیا ہے تم نے۔ بس اب زیادہ مت اتراؤ سارے زمانے کی مرغیاں انڈے دیتی ہیں، ایک تم ہی نرالی نہیں ہو۔'' بچے سن لیتے تو تماشا بنا لیتے۔ وہ اور جھنجھلاتیں۔ بچوں کو سناتیں تو وہ اور چھیڑتے۔ غرض گھر میں یہ ہنگامہ چڑچڑی عورتوں کو اور بدمزہ کر دیتا۔ وہ بچوں کو مارنے کی دھمکی کے ساتھ بڑی ماں کو بھی باتیں سناتیں کہ خواہ مخواہ بچوں میں بچی بن رہی ہیں۔ فوراً شریر بچوں کی طرح انہیں کسی کام میں پھنسا دیا جاتا جسے وہ الٹا سیدھا کر کے پھر محاذ پر آ پہنچتیں۔ یوں معلوم ہوتا کہ اپنی جن دلی خواہشات کو ایک زمانے میں وہ کام کر کر کے بھولی تھیں۔ اب انہوں نے دوسری آسان راہیں ڈھونڈ لی تھیں۔ کام میں اب ان کا دل نہ لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے رسیاں تڑا رہی ہوں۔ آٹا، جسے وہ کسی زمانے میں بڑے پیار سے سہج سہج گھنٹوں بکیاں مار مار کر گوندھا کرتی تھیں۔ اب منٹوں میں گجول کر رکھ آتیں۔ روٹیاں پکاتیں تو کبھی جلی، کبھی کچی۔ ہانڈی بھونتیں تو چراند رہ جاتی۔ برتن دھوتیں تو مار چکنے اور چپکٹے کہ ایک ایک برتن دوبارہ دھونا پڑتا۔ گھر کی عورتیں بہتیرا جتاتیں اور سنا سنا کر کہتیں مگر ایک کان سے سن کر دوسرے سے صفا اڑا دیتیں۔

اب لوگوں کا معیارِ زندگی بھی اونچا ہو رہا تھا۔ چھوٹے سے گھر میں چاہے گھر والوں

کے بیٹھنے کی جگہ نہ ہو مگر مہمانوں کے لئے سستے سے صوفے ضرور ہوں ۔ رات کو بچے ایک پلنگ
پر چار چار سوئیں مگر نیلام سے خریدی ہوئی کھانے کی میز اور کرسیوں کو جگہ ضرور ملے بچے بھی
اب گھروں کے بجائے ہسپتال میں پیدا ہونے لگے تھے ۔ شادیوں میں اب ایسے "ایٹ ہوم"
ہونے لگے تھے جن میں بڑی اماؤں کی ضرورت ذرا کم ہی پڑتی ہے ایک تو جہز کی مانگ پہلے ہی
کم ہو اور پھر اس کی کوالٹی خراب ہو جائے تو اس کو کون دھارے گا ۔ بڑی اماں بھی بقول ایک
انگریزی داں پوتے کے "نیوسنس" ہو گئی تھیں ۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں تو ان کا قطعی
ٹھکانہ نہ تھا ۔ ہاں پرانے دُھرانے گھروں میں ٹوٹی چارپائی کی طرح کونے میں پڑی رہتیں ۔
مگر چند دن گھر رہتے تو کسی نہ کسی بہانے سے ان کی بیٹی دوسرے گھر روانہ کر دی جاتی ۔ جہاں
گھر میں کوئی بیمار ہوا یا مہمان آئے تو سب سے پہلا کام یہ کیا جاتا کہ بڑی اماں کو رکشہ میں بٹھا
کر کسی دوسرے نواسے یا پوتے کے ہاں چلتا کیا جاتا ۔ وہاں دو ایک دن ان کی کچھ آؤ بھگت
ہوتی ۔ پھر ردی اخبار کی طرح اِدھر اُدھر رُلتی پھرتیں ۔ ان کی بھوک اور بڑبڑاہٹیں جب
زیادہ پریشان کرتیں تو کوئی بہانہ ڈھونڈ کر انہیں تیسرے گھر بھیج دیا جاتا ۔ گھر کی لڑکیاں
کسی نہ کسی طرح ان کے ٹرنک کے کپڑے اُڑانے کی فکر میں رہتیں ۔ ان کی بدقسمتی سے تنگ
پاجامے کا فیشن لوٹ رہا تھا اور پرانے زمانے کی سی ساٹن اور مٹھی میں بند ہو جانے والے
دوپٹے اب کہاں ملتے تھے ۔ محبت کی بھوکی بڑی اماں کے جب لڑکیاں مکھن لگاتیں تو
وہ خوش ہو کر فوراً جوڑے کے جوڑے ان کی نذر کر دیتیں ۔

اب بڑی اماں پر جو کچھ خرچ ہوتا اس کا حساب ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا تاکہ موقع
موقع پر دوسرے رشتے داروں کو سنایا جا سکے ۔ ایک وہ بڑی اماں تھیں جن کو ہر گھر میں ہاتھوں
ہاتھ لیا جاتا تھا ۔ اب ٹانگ برابر کی چھوکریاں کہتی تھیں " کام کی نہ کاج کی ، سیر بھر اناج کی "
جب دیکھو باورچی خانے میں کچھ نہ کچھ ٹٹول رہی ہیں ۔ بچے بچے کو پتہ تھا کہ یہ ہماری سگی نانی
دادی نہیں ہیں ، بے اولاد ہیں بے چاری ۔ ہم نہ رکھیں گے تو اور کون رکھے گا ۔

"اے ہے یہ رات کا قیمہ ہے چھپا دے نہیں تو" وہ "نگل ییں گی --- ان کے بارے میں ایسی باتیں اب عام ہو گئی تھیں۔ بھوک کی شدت اور تسکین کی کمی نے جنون کو ایک اور راہ سجھائی۔ ٹہلتی ٹہلتی آتیں اور ناک ہوا میں دے کے کہتیں "اے ہے سیب کی خوشبو آرہی ہے۔ ہے نا، کہاں ہیں منی، اے ایک ٹکڑا ہمیں بھی دے نا ---" منی جسے خود سیب سونگھے ہوئے برسوں ہو گئے ہوتے، جل کر کہتی "سیب نہ کچھ اور --- پاگل ہو گئی ہو بڑی اماں تم تو۔" مگر وہ اس وقت تک سیب سیب کی رٹ لگائے رکھتیں جب تک انہیں کسی دوسرے کمرے میں امرود یا کیلے کی خوشبو نہ آجاتی۔ کسی نئے گھر میں جا کر جب انہیں یہ خوشبو آتی گھر کا کوئی شریف بچہ یا نفسیات کا ادھ کچرا طالب علم انہیں یہ چیزیں لا دیتا کہ شاید اسی طرح ان کا دل بھر جائے مگر ان باتوں کا الٹا اثر ہوتا۔ پھر تو ان کی ناک راہ ہی دیکھ لیتی۔ کبھی قورمے کی خوشبو چلی آرہی ہے۔ کبھی تنجن، کبھی بریانی۔ اتنا حوصلہ کوئی کہاں سے لاتا۔ دوسرے ہی دن سے تو تو میں میں شروع ہو جاتی۔ خالی پیٹ کب تک ان مرغن کھانوں کا ذکر اور خوشبو برداشت کرتے۔ کام وام "اب" وہ نہیں کرتی تھیں۔ اول اس لئے کہ ان کو سجھائی کم دیتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے کہنے کے مطابق پاؤں میں جان ڈال لی تھی۔ ذرا سی دیر میں دال کا دلیہ کر دیتیں۔ کچھ دن بعد ان کے جنون نے ایک اور رنگ پکڑا۔ انہیں یہ خیال ہو گیا کہ لوگ انہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ سارا دن گھبرا گھبرا کر کہتیں "ارے کہاں جا رہے ہو مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

ہر نئی بات کچھ دن تو مذاق رہتی پھر جی کا جلاپا بن جاتی۔ اچھا بھلا آدمی گھر میں بیٹھا ہے دوسرا اس کے سر ہو رہا ہے کہ بول تو کہاں جا رہا ہے، تو وہ آپ ہی مرکھنا بیل بن جائے گا۔ جوں جوں ان کی آنکھیں کمزور ہو رہی تھیں توں توں یہ وہم بڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا گھر میں خاموشی ہوئی اور وہ "برائیں"، "ارے کہاں چلے گئے سب، مجھے چھوڑ گئے۔ ہائے میں اکیلی رہ گئی۔ کہاں چلے گئے سب۔

"مر گئے۔" جل کر کوئی کہتا تو وہ کھل اُٹھتیں "ہو اللہ یہ میں سمجھی سب چلے گئے۔"

یہ مرض بڑھا تو وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر میاں بیویوں کے پلنگ ٹٹولنے لگیں سوتے سے چونک کر کوئی چلا اُٹھتا "کون؟" تو وہ بڑی معصومیت سے کہتیں "سو رہے ہو؟ میں سمجھی چلے گئے۔"

ایک دفعہ کسی شخص کو جھک جھک کر چلتے دیکھ کر کوئی بچہ ڈر کر چیخ اُٹھا۔ سارے گھر میں چور چور کا شور مچ گیا محلے والے جاگ اُٹھے اور آخر میں نکلا کون؟ بڑھ ماں — یہ باتیں برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر آتے گئے کو سُناتی جاتیں تاکہ ان کے سہارے موقع پاتے ہی انہیں کسی اور گھر روانہ کیا جائے کہاں تو وہ سالوں رہتی تھیں تو لوگ اور رہنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اب مہینے میں چار گھر گھوم لیتیں۔ ریشمی کپڑے بٹ بٹا گئے تھے اور ان کی جگہ ملے ہوئے سوتی کپڑے پھٹ پھٹا کر ختم ہو چکے تھے۔ بستر بھی بوسیدہ اور خراب تھا۔ مگر اب ان کو کھلانا ہی دو بھر تھا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں ان کے لئے جوڑے اور گھوڑے بھی ہوتے۔

گھر میں تقریب ہوتی تو بڑھ ماں کو چھپا دیا جاتا یا دوسرے گھر بھیج دیا جاتا، ہاں نہیں تو پڑ جاتی پھر بس گی سارے میں۔ اصل ڈر اس بات کا تھا کہ کسی نے پوچھ لیا کون ہیں تو کچھ کہتے بن نہ پڑے گی۔ اپنا گھٹنا کھولو آپ ہی لاجوں مرو۔ اب ان کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ انہیں کسی کے سامنے فخریہ پیش کیا جا سکے اور جان بوجھ کر ٹکی کرانے کا فائدہ؟ فیشن ایبل گھرانے ہاتھ جوڑتے کہ ہمارے ہاں باہر کے لوگوں کا کھلا آنا جانا ہے۔ ہمارے ہاں انہیں نہ بھیجو البتہ کھانے پینے کا خرچ لے لو۔ مگر خرچ لینے کی بدنامی کون سہتا۔

دن گزرتے رہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلتا۔ باہر والا کوئی بہت دن بعد دیکھتا تو کہتا کہ بڑھ ماں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا ہے۔ گھر والے بتاتے کہ کوئی خاص بیماری نہیں ہے۔ بس، ہوکا ہو گیا ہے۔ اس لئے پیٹ سدا خراب رہتا ہے یا پیٹ میں

کیڑوں کا بسیرا ہے کہ ہر وقت کھانے کو مانگتے ہیں۔ آنکھیں بھی اس رفتار سے روشنی کھو رہی تھیں۔ کہ پاس رہنے والوں کو اندازہ نہیں تھا، یا پھر ان کی حرکتوں نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ کوئی ان کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا اور گھر کے ہزار رگڑے جھگڑے تھے کہ گھر میں پڑی ہوتی بڑی بی کے پیچھے لوگ خوار ہوتے پھرتے۔ اچھے بھلے آدمی کام کرتے کرتے تھکے جا رہے تھے۔ ایک صبح کے گھر سے نکلے ہوتے کہیں اندھیرے میں گھر لوٹنا نصیب ہوتا۔ کراچی کی زندگی تھی کہ سانس لینے کا موقع نہ دیتی تھی۔ مکان، دوکانیں، سڑکیں ہر چیز ٹھساٹھس تھی۔ جگہ اور وقت کی کمی کی بات کوئی کراچی والوں سے پوچھے۔ گھر کے سینکڑوں ضروری کام برسوں ٹلتے رہتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو یہ سوچ کر جان نکلتی کہ کون گھنٹوں جا کر دوا کے لئے قطار میں کھڑا ہو۔ عطاروں اور نیم حکیموں کی چاندی ہو رہی تھی۔ بیماری کے اسپیشلسٹوں تک رسائی بادشاہوں کے درباروں کی رسائی ہو گئی تھی۔ ایسے میں کون انہیں ہسپتال لے جانے کی مہم کا ذمہ لیتا اور لینا بھی تو کس سے یہ ہفت خواں سر ہوتا۔

دن یوں ہی گزر جاتے اگر بات اور نہ بڑھتی، مگر کون چیز اس دنیا میں ہے جو ایک حالت میں ہے جسے تغیّر نہیں۔ ہر آدمی، ہر شے بہتر یا بدتر صورت میں بدلتی رہتی ہے۔ بڑماں کی حالت کو بہتری کی کیا امید تھی۔ بس روز بروز بگڑ رہی تھی۔ جب تک وہ خود چل پھر لیتی تھیں۔ ان کی باتوں کو رو بھر کر برداشت کر لیا جاتا تھا مگر جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ غسل خانے لے جانا ہو تو ہاتھ پکڑ کر لے جاؤ تو بڑی مشکل آئی۔ وہ چلاتی رہتیں اور "ابھی آئی ذرا تو صبر کرو تم تو بچوں سے بھی گئی گزری ہو گئیں" وغیرہ آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہتیں۔ اگر وہ صبر کرتی رہتیں تو اس صبر کی کوئی میعاد نہ تھی، چنانچہ وہ ٹٹول کر اٹھتیں اور جس جگہ کو غسل خانہ سمجھ لیتیں وہیں بیٹھ جاتیں۔ بعد میں بڑی ہائے ہو مچتی۔ کراچی کی بھنگنیں ہر وقت ہاتھ نہیں آتیں اور اب تو جب سے گھروں میں فلش عام ہو گئے تھے۔ انہیں گندے کام کرتے ہوئے اڑیاں آنے لگیں تھیں۔ ایسی حالت میں جب گھر والوں کو ان کی بے جا حرکتیں سمیٹنا پڑتیں تو ان پر

کوسنے کاٹنے نہیں تو کیا پھول برستے۔ اب وہ باتوں ان باتوں سے بالا ہو چکی تھیں یا سن کر انجان بننے میں مہارت ہو گئی تھی کہ ذرہ بھر پروانہ کرتیں، بس تکیے سے سر لگائے، گردن آگے جھکائے، آنکھیں بند کئے، ہونٹ بچوں کی طرح بسورے غنودگی کے جانے کون سے عالم میں کھوئی رہتیں۔ دن رات ان کے لئے ایک ہو چکے تھے جس وقت اس بے ہوشی سے چونکتیں، سب سے پہلے کھانا مانگتیں چاہے اس وقت رات کے دو بجے ہوں یا صبح کے چار لوگوں نے اب ان کا نوٹس لینا چھوڑ دیا تھا۔ کھانا اس وقت دیا جاتا جب کھانے کا وقت ہوتا۔ بس ان کی موجودگی کا احساس اس وقت ہوتا جب وہ ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتیں۔ ان حرکتوں میں اضافہ ہوا تو انہیں گھر سے باہر ایک ایسے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ جی چاہے اور جہاں جی چاہے کرتی رہیں۔ دوسری صبح بھنگن ناک پر کپڑا باندھ کر کمرہ دھو جاتی۔ اس دھلائی اور خراب ہو جانے والے کپڑوں کے پیسے وہ الگ لیتی۔ بڑی ماں کے کمرے میں سے مرغیوں کے ڈربے جیسی گھراند آتی۔ ان کو کھانا دینے جانے والا بھی سانس روک کر بمشکل چند منٹ وہاں ٹھہرتا۔

زندگی کسی کے لئے رکتی تو نہیں۔ دن اور راتیں ریس کے گھوڑوں کی طرح بھاگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے لڑکیوں کے چہرے پر حیا اور لڑکوں کے گلوں پہ بال پھوٹ آتے ہیں، شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ پھر ان کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اسی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ بڑی ماں کے پوتے بھی آل اولاد والے ہو گئے۔ ایک پڑپوتے اور ایک پڑنواسی کی شادی ٹھہر گئی تھی۔ جیسا کہ کراچی کا دستور ہے بڑی محنت سے "بڑے" گھرانے ڈھونڈے گئے تھے۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ بڑے گھرانوں سے ٹکر لینے نے سارے گھر کا پلیتھن نکال دیا تھا۔ پھر بھی بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ ایسے ہی ایک دن جب گھر میں لیا جب جوڑے ٹانکے جا رہے تھے۔ بڑی ماں چپکے سے چل بسیں۔ صبح کو کوئی ناشتہ دے کر گیا تو دیکھا ختم ہو چکی ہیں۔ ان میں تھا ہی کیا، ایک سانس چل رہا تھا۔ وہ کسی وقت خاموشی سے بند ہو گیا جیسے کسی نے سوئچ آف کر دیا ہو۔ فوراً انہیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا۔

ہر طرف سناٹا سا دوڑ گیا۔ کسی طرف سے آہ و بکا کی آواز بلند نہ ہوئی۔ لڑکیوں نے چپکے چپکے دو چار آنسو بہائے۔ بڑی ماں کی موت پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی زیادتیاں یا نالائقیاں یاد کر کے۔ خاندان والوں کو اطلاع دی گئی۔ بڑی ماں کا خاندان برگد کے درخت کی طرح پھیل کر کہیں کا کہیں جا پہنچا تھا۔ لوگ آتے جاتے تھے، چپ چاپ بیٹھتے جاتے تھے۔ ان کے سارے آخری کام بڑے سکون سے ہوئے اور وہ ایسی خاموشی سے وداع کر دی گئیں۔ جیسے کسی بیوہ عورت کی رخصتی ہو۔

اس کے بعد کا مرحلہ زیادہ دشوار کن تھا۔ ایک شادی میں چار اور دوسری میں پانچ دن تھے۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ قبر میں بڑی بی کا جسم بھی ٹھنڈا نہ ہوا ہوگا کہ بیٹے پوتے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ لاکھ کچھ ہو دین سے دنیا رکھنی بھاری ہے شادی کی تاریخیں ٹالنی پڑیں گی۔ مگر شادی کی تاریخیں بدلنا بھی مشکل تھا۔ کہاں کہاں سے لوگ آئے بیٹھے تھے۔ ایک بھائی انگلینڈ جانے کو پابہ رکاب بیٹھا تھا۔ دولہا چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ پھر جانے کب چھٹی ملے اور لڑکیوں کی شادی میں آج کل دیر دار ذرا مناسب نہیں۔ کب دام میں آیا ہوا پنچھی پر پھڑ پھڑا کے اڑ جائے۔ ہاں نہیں تو جن کے گھر والوں میں شادیاں تھیں۔ وہ ہرگز انہیں ٹالنا نہ چاہتے تھے۔ صرف کنبے برادری کا ڈر تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ صبح سے شام تک بحث ہوتی مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچا جاتا۔ وقت اتنا کم تھا۔ کہ مزید بحث کی گنجائش بھی نہ رہی۔ تاریخ بڑھانی ہے تو فوراً بڑھاؤ کہ آنے والوں کو بر وقت اطلاع تو دی جا سکے۔ مگر بڑی ماں کے ایک سمجھدار بیٹے نے آخر اس مشکل کا حل ڈھونڈ ھ لیا۔ "دیکھو یہ موقع اچھا ہے۔ شادی تو کرو مگر دھوم دھڑکا نہ کرو۔ کھانے کے بجائے معمولی سی چائے ہو جائے۔ مہمان بھی کم بلائے جائیں کہ بس شرعی رسم کر رہے ہیں۔ بہانہ ہمارے پاس ہے ہی کہ ہمارے ہاں کی ایک بزرگ خاتون کا انتقال ہو گیا ہے، ہم دھوم دھام نہیں کر سکتے ــــــ یاد رکھو یہ موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔"

چنانچہ یہی ہوا۔ بڑی ماں مرتے مرتے بھی ایک کام کر گئیں۔ جن تقریبوں پر ہزاروں خرچ کرنے کے بعد بھی الاہنے کا دھڑکا تھا۔ انہیں سینکڑوں پر نمٹا گئیں اور کسی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ سچ ہے نیک آدمیوں کی موت بھی نیک ہوتی ہے۔

کام

"اندر آنے کی اجازت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آیئے۔" اندر سے آواز آئی ——

"یا اللہ! یہ کیسا اُجالا ہے۔ ساری قبر جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔"

"آپ کے ساتھ کیا خصوصیت ہے، آپ کی قبر میں یہ روشنی کیسی ہے؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"قبر! کیا میں کسی قبر میں ہوں۔" اُن کی آواز میں مجھ سے بھی زیادہ حیرت تھی۔

"تو کیا آپ کو یہ خبر نہیں کہ آپ کہاں ہیں؟" میں نے اور بھی تعجب سے پوچھا۔

"قسم اللہ کی، مجھے بالکل خبر نہیں کہ یہ قبر ہے۔"

"تو آپ کے روز و شب کیسے گذرتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم، کیا روز و شب اب بھی ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ تو بہت پرانی بات ہے صدیوں پرانی۔"

میری حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ کو یہ نہیں معلوم کہ آپ کہاں ہیں، آپ کو یہ نہیں معلوم کہ شب و روز اب بھی ہوتے ہیں تو اپنے خیال میں آپ کہاں ہیں اور آپ کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے ——؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"تو آپ نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی" ——؟

"نہیں.... مجھے فرصت ہی نہیں تھی۔"

"کس چیز سے ۔۔۔؟"

"اپنے کام سے ۔۔۔"

"آپ کا کام کیا ہے"۔۔۔؟

"آپ نے کہا تھا نا کہ آپ کی قبر میں روشنی کیسی ہے، بس یہی دیواروں کو چمکانا میرا کام ہے ۔۔۔" انھوں نے کہا۔ "مگر میں نے جب یہ کام شروع کیا تھا تو وہ قبر کی دیواریں نہیں تھیں ۔۔۔"

"وہ کس چیز کی دیواریں تھیں ۔۔۔؟"

"وہ ایک قید خانہ تھا، چھوٹا سا چوکور سا جس کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور بہت اونچائی پر چھوٹا سا ایک روشن دان تھا۔ میرا دل بہت گھبراتا تھا۔ ہر وقت نظر روشن دان پر رہتی تھی جہاں سے نظر کچھ نہ آتا تھا صرف دن کی روشنی میں وہ ذرا سا جلتا تھا اور رات کو بجھ جاتا تھا۔ بہت دن کی پریشانی کے بعد میں نے ایک کام ڈھونڈ لیا۔ قید خانے کے فرش میں ننھے ننھے پتھر کٹے ہوئے تھے، میں نے ان پتھروں کو گننا شروع کر دیا۔ صبح سے پتھروں کی گنتی شروع ہوتی اور رات جب تک نظر آتا رہتا گنتی جاری رہتی۔ اس کے بعد نیند آجاتی اور دوسرے دن پھر یہی کام شروع ہو جاتا۔ اس طرح وقت قدرے بہتر گزرنے لگا۔ کٹے ہوئے پتھر بہت زیادہ تھے اور اُن کی گنتی میری عمر بھر کو کافی تھی۔ مگر چھوٹے کمرے میں دم اب بھی گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور رات دن کی فکر اب بھی رہتی تھی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں دیواروں کو پینٹ کرنا شروع کر دوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ آئینہ وسعت کا احساس دلاتا ہے۔ اگر ایک دیوار میں آئینہ ہو اور اس میں وہ سب کچھ نظر آرہا ہو جو کمرے میں موجود ہے تو کمرہ دگنا بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ دیوار میں ایک در بنائیں اور اس میں ایک اور در، پھر اس میں ایک اور در، تو کمرے میں لامحدودیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے پتھروں کو گننے کا کام چھوڑا۔ قید خانے میں پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ سے ایک

برش اور پینٹ بنائے اور دیواروں کو پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ میں دیواروں پہ آئینے بناتا اور پھر آئینوں میں آئینے بناتا اور پھر ان آئینوں میں آئینے، اس طرح وہ چار دیواریں اور ان میں پڑی ہوئی گنتی کی چیزیں لامحدود ہوتی گئیں اور میں اس کام میں اتنا محو ہوا کہ دن اور رات کی کوئی قید نہ رہی۔ دروازے کے نیچے سے کب کھانا آتا اور کب جاتا مجھے کچھ پتہ نہ چلتا۔ دیوار کا روزن کب بجھتا مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ اپنے قد تک کا کام ہو گیا تو میں نے اسی کاٹھ کباڑ پر چڑھ کر دیواروں کے بالائی حصوں پہ آئینے بنانا شروع کر دیئے۔ نہ مجھے وقت کا احساس تھا نہ کبھی کوئی میرے پاس آیا کہ مجھے وقت کا احساس دلائے۔ رفتہ رفتہ میں بھی ساری صورتیں، ساری رفاقتیں، ساری کہانیاں بھول گیا اور اب مجھے دیواریں پینٹ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ اب مجھے دیواریں چمکانے کا ہنر آ گیا ہے۔ دیواریں چمک اُٹھتی ہیں تو تمام چیزوں کا عکس اس میں خود جھلملانے لگتا ہے ـــ

"کبھی آپ باہر نکل کر بھی تو دیکھیے۔ قبرستان کی بھی ایک فضا ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"اچھا..... مگر میں حیران ہوں کہ مجھے قید سے آزادی کب ملی۔ یہ کب ہوا کہ وہ دیواریں ہٹ گئیں اور یہ دیواریں آ گئیں۔"

"دیکھیے آپ کا دروازہ کھُلا ہے، آپ قید نہیں ہیں۔ آپ جب چاہیں باہر جا سکتے ہیں۔"

"اچھا، مگر میرا کام ابھی باقی ہے، کام ختم کر لوں تو نکلوں ـــ"

"مجھے لگا ان کا کام کبھی ختم نہیں ہوگا۔" وہ جھک کر گویا ہوئے ـــ

"آپ کی بات سے میرے ذہن میں ایک نہایت عمدہ خیال آیا ہے، کیوں نہ میں ان دیواروں کو اتنا باریک اور شفاف کر لوں کہ اس کے پار دیکھ سکوں۔ پھر مجھے باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہیں سے سب کچھ دیکھ سکوں گا۔"

اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں وہ اپنے کام میں مصروف ہو چکے تھے ــــــ

" اچھا میں چلوں، خدا حافظ ــــــ "

قبر کی جگمگاہٹ دروازہ بند کرتے ہی بند ہو گئی اور اس کے ساتھ وہ بھی جنہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کون آیا اور کون گیا ــــــ

بھرم

ایک مریضہ کو دیکھ کر لوٹی تو ملازم نے مٹھائی کی ایک بڑی سی پلیٹ سامنے کر دی۔

"یہ ملک نواز صاحب کے گھر سے آئی ہے۔ ان کے ہاں پوتا ہوا ہے ـــ"

"پوتا؟" میرے لہجہ میں بے یقینی کا کچھ ایسا عنصر تھا۔ کہ ملازم بھی پاگلوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔

"اچھا، رکھ دو اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ ـــ" میں نے بات بنائی۔

اس کے جانے کے بعد میں جوتوں سمیت صوفہ پر نیم دراز ہو گئی۔ اور اس انہونی پر غور کرنے لگی۔ ملک نواز کے گھر پوتا ہو گیا۔ واقعی کیا یہ ممکن ہے؟

"عزیز ابھی کلینک سے نہیں آئے تھے اور جیسے ہی وہ آئے میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے بولی۔ سنتے ہو عزیز، ملک نواز کے بیٹے جمال کے ہاں لڑکا ہوا ہے ـــ"

عزیز نے شک سے مجھے دیکھا، پھر کروشیا کے پوش سے ڈھکی ہوئی پلیٹ پر نظر کی۔ ان کے چہرے پر کچھ عجیب و غریب تاثرات اُبھرے جیسے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ وہ اس خبر پر ہنسیں یا روئیں اور پھر وہ بغیر کچھ کہے سنے ٹائی کھولتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

طبی اخلاق جو کچھ بھی کہتا ہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ مرض اور مریض ڈاکٹروں کی کمزوری ہوتے ہیں۔ کوئی نئی، پیچیدہ سی، نایاب سی بیماری ہو تو اب کیسے کسی کو نہ بتائی جاتے خواہ وہ ہمارا تبلانے والے کا مشترکہ دوست ہی کیوں نہ ہو۔ میاں بیوی تو یوں بھی ایک دوسرے کا پردہ ہوتے ہیں اور پھر ڈاکٹر میاں بیوی ـــ اور یہ تو بات بھی کچھ

ایسی نہ تھی۔ بس ایک دن کلینک سے واپسی پر عزیز نے کہا۔ "آج جمال نواز میرے پاس آیا تھا۔"

"کیوں خیریت۔؟" میں نے یونہی رواروی میں پوچھا۔

"وہی بچے وچے کے چکر میں۔"

"اچھا ۔۔۔؟ بڑے دن بعد ہم یاد آئے۔"

ساری دنیا کو معلوم تھا کہ ملک نواز کے اکلوتے بیٹے جمال کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا اور اب تو یہ بات اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ ہاں یہ ضرور سنا تھا کہ علاج معالجہ ٹونے ٹوٹکے اب تک جاری ہیں۔ ملک نواز پوتے کے دیدار سے پہلے مرنے کو کسی طرح تیار نہ تھے۔ ان کی بیوی بڑے چاؤ سے اپنے بیٹے کے لئے بہن کی بیٹی بیاہ کر لائی تھیں مگر ایک عمر گزر جانے کے بعد بھی اس ٹھونٹھ سے کونپل نہ پھوٹی تھی اور ماں باپ کو کمی محسوس ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو دادا دادی تو جیسے مرے ہی جا رہے تھے پوتے کے بغیر ۔۔۔ اصل بات وہی ہوگی جو عموماً جاگیردار گھرانوں میں ہوتی ہے۔ یعنی جائیداد کا وارث کوئی نہ تھا۔ جمال کے بعد ۔۔۔ خدا جانے اللہ میاں کو ان بڑے لوگوں سے بیر ہے یا یہ لوگ ہی وقت پر بیج ایسی بیدردی سے جگہ بے جگہ لٹا دیتے ہیں کہ اپنے گھر کے باغیچے بے برگ و بار ہی رہ جاتے ہیں یا یہ محض اتفاق تھا کہ ہمارے علاقہ کے جتنے بڑے زمیندار تھے۔ سب کے یہاں یا تو لڑکیاں تھیں یا سرے سے اولاد ہی نہیں تھی۔ بہر حال برسوں سے ہم سُن رہے تھے کہ ملک نواز کی بیگم پوتے کے لئے منتیں مان رہی ہیں۔ ٹونے ٹوٹکے ہو رہے ہیں۔ ملک کا شاید ہی کوئی مرا یا جیتا بزرگ انہوں نے چھوڑا ہو جس کے در پہ جبہ سائی نہ کی ہو، اس کے علاوہ بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ہاں بھی چکر لگتے رہے۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ یوں تو ہمارا اُن کا ملاپ برسوں پرانا تھا جیسا کہ ایک ہی شہر میں رہنے والے لوگوں کا ہوا کرتا ہے مگر اس معاملے میں انہوں نے ہم سے رائے۔ لینی کچھ مناسب نہ سمجھی تھی۔ اب اتنے دن بعد، ہم نہ معلوم کیسے یاد آ گئے۔

"پھر؟" میں نے عزیز سے پوچھا۔

"معلوم نہیں وہ اب تک کسی ڈاکٹر کے پاس گیا تھا یا نہیں، مجھ سے تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ میرے پاس آیا ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں — میں نے ٹیسٹ کروایا اور وہی بات نکلی — نو اسپرم —"

"مجھے تو پہلے ہی خیال تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں معلوم ہوتا مگر یہ ستم تو دیکھو کہ بیویوں کے سینکڑوں علاج معالجوں کے بعد ان کم بخت مردوں کو خیال آتا ہے کہ ذرا اپنا بھی معائنہ کروائیں اور ماں ہیں کہ لے ہوگی دوادارو، جھاڑ پھونک۔ یہ نہیں کہ پوچھیں بیٹے تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔"

"وہ تو اب بھی جھاڑ پھونک میں لگی رہیں گی کیونکہ بیٹا انہیں یہ بات بتانے سے رہا۔"

"بتا دینی چاہیئے، ماں کو نہ بتائے باپ کو تو بتا دے یا کسی اور سے کہلوا دے۔"

"پاگل ہوئی ہو — ان لوگوں کی مردانگی پر ایسی زبردست آنچ آتی ہے کہ حد نہیں، مرنا گوارا مگر یہ ننگ گوارا نہیں — مجھے بھی حضرت تڑی دے رہے تھے کہ کسی کو اس بات کی خبر ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔ میں نے ڈانٹ کر کہہ دیا کہ ملک صاحب ہمارے پیشے کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ ہمارے ذاتی اصول بھی ہوتے ہیں — مگر یاد رکھئے آئندہ کسی ڈاکٹر کو نہ دھمکائیے گا، دھمکانے کا اثر اکثر الٹا ہوتا ہے۔ بس ممیانے لگے، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ تو ہمارے پرانے جاننے والوں میں سے ہیں لیکن یہ ایسی نازک صورتِ حال ہے کہ انسان خواہ مخواہ محسوس کرتا ہے وغیرہ۔ بہر حال میں نے اپنی طرف سے انہیں یقین دلایا اور وہ چلے گئے —"

"عجیب بے وقوفی ہے،" میں نے کہا "قدرت سے کون لڑ سکتا ہے۔ اسے یہ بات اپنی بیوی اور ماں باپ کو صاف بتا دینی چاہیئے۔ ایک مرتبہ صبر آجائے گا بے چاروں کو۔"

اس بات کو بھی دو چار ماہ گزر گئے تو ایک دن ملک نواز کی بیگم کا فون آیا۔ وہ اپنی بہو کو مجھے دکھانا چاہتی تھیں۔ کس سلسلے میں، اب فون پر کیا پوچھتی میں نے کہا لے آیئے۔ لائیں تو وہی چکمہ۔ میں اپنی بھانجی کو بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھی مگر اس کے اولاد نہیں ہوتی۔ لوگوں نے میرے بیٹے کو بہکا دیا ہے وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ ملک صاحب بھی کہتے ہیں کہ ہاں ہم بغیر پوتے پوتی کے نہیں رہ سکتے۔ اب میں اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں گی ——— آپ اس کا کچھ علاج کیجیے ——— آپ کی بڑی تعریف سُنی ہے ——۔"

مجھے ہنسی آئی۔ یہ بڑی بی کچھ سٹھیا گئی ہیں، ملک کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد میرے پاس لائی ہیں اور پھر بیٹا اس بہانے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ حد ہے ان لوگوں کی چالاکیوں کی۔ میں بہو کو معائنہ کے کمرے میں لے گئی عجب بھٹس سی عورت تھی۔ ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہ بولی۔ اس کو معائنہ کے کمرے میں چھوڑ کر میں ساس کے پاس آئی اور میں نے کہا "بیگم صاحبہ آپ بڑا مانیں یا بھلا میں آپ کو صاف بتا دیتی ہوں۔ کہ آپ کے بیٹے میرے میاں کے پاس آئے تھے انہوں نے اچھی طرح ٹیسٹ کر لیا ہے وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ سمجھیں آپ! اگر وہ اس بہانے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔" یہ خبر ان کے لئے کتنی افسوسناک ہو سکتی ہے اس کا مجھے اندازہ تھا۔ جس مرض کو قابلِ علاج سمجھ کر ہزاروں روپیہ خرچ کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں وہ ناقابلِ علاج ہے اور اس حد تک۔ مگر میں کہہ گزری۔ کیونکہ جس بات کو صحیح سمجھوں اسے ہر قیمت پر کر گزرنا میری عادت ہے میرا خیال تھا کہ بیگم نواز یہ بات سن کر سفید پڑ جائیں گی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ صرف میری طرف دیکھتی رہیں، ان کی کسی بات سے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ یہ اندوہناک خبر وہ پہلی مرتبہ سن رہی ہیں۔ چند لمحے میری طرف دیکھنے اور شاید دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کرنے کے بعد بولیں۔

"اس بات کو آپ جانے دیں۔ آپ صرف ثریا کا علاج کریں۔"

میں ان کا منہ تکنے لگی۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"مطلب یہ کہ ــ آپ ــ اس کا علاج کریں ۔ کچھ دوا دے دیں ۔ ٹیکے لگا دیں اور سب کو یہ بتائیں کہ آپ اس سلسلے میں اس کا علاج کر رہی ہیں۔"

"مگر اس سے ہوگا کیا؟" میں زچ ہوگئی۔

"ہوگا یہ ــ" ان کے لہجے میں بھی جھلاہٹ تھی جیسے وہ میری کوڑ مغزی پر کڑھ رہی ہوں۔ "کہ جب میری بہو کے بچہ ہوگا تو لوگ کہیں گے کہ آپ کے علاج سے اسے فائدہ ہوا۔ اور اللہ نے چاہا تو میں کیس بھی آپ ہی سے کراؤں گی ــ"

"مگر بچہ ہوگا کیسے؟" میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان کی بے وقوفی پر روؤں۔

"یہ ہمارا اپنا بندوبست ہے، اس کی آپ فکر نہ کریں ــ" انہوں نے کرسی سے اپنی سفید چادر اٹھائی اور اوڑھنے لگیں۔ پھر بولیں "اس کام کے میں آپ کو دو ہزار روپے دے دوں گی۔"

جب ہوش میں آئی تو میں نے کہا "روپیہ لے کر اس سے بھی بدتر کام کرنے والیاں آپ کو مل جائیں گی مجھے معاف رکھئے ــ" اور جا کر معائنہ کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

وہ اپنی بہو کو لے کر باہر چلی گئیں اور جب بہو پردہ لگی لمبی سی کار میں بیٹھ گئی تو وہ واپس آکر سرگوشی میں مجھ سے بولیں "سوچ لو، میں پانچ ہزار دے دوں گی ــ کوئی ایسا بڑا کام نہیں ہے۔ نہ قانون کے خلاف ہے، صرف لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ تم اس کا علاج کر رہی ہو۔ اور تمہیں یقین ہے کہ اس سے فائدہ ہوگا۔ اس سے تمہاری بھی شہرت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اپنے میاں سے یہ وعدہ لے لینا کہ کوئی پوچھے بھی تو اسے جمال کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔"

"معاف کیجئے میں یہ کام نہیں کر سکتی۔" میں نے کہا۔ "اور آپ بھی ایک اہم بات بھول رہی ہیں۔ وہ یہ کہ آپ کے بیٹے کو اپنی نااہلی کا علم ہے اب اس کی بیوی کے بچہ ہوا تو ....."

"رہنے دو ـــ" وہ میری بات ختم ہونے سے پہلے جھلا کر بولیں۔ "بڑی آئیں مجھے پڑھانے والی، ایک ذرا سا کام تو ہوتا نہیں اور عقل دینے چلی ہیں، ہم لوگوں کو ہزار علم ہو نا اہلی کا تو کیا ہوتا ہے۔ اپنی عزت کا بھرم تو رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے باپ کو کیا علم نہیں تھا!!! ـــ"

وہ غصے میں پیر پٹختی باہر چلی گئیں ـــ

اور مٹھائی کی پلیٹ سامنے رکھے میں سوچ رہی ہوں کہ ہم دونوں میاں بیوی جنہیں لوگ بڑا سمجھدار، دنیادار اور تجربہ کار سمجھتے ہیں۔ اس پیچیدہ دنیا کو سمجھنے اور انسانی نفسیات کو پرکھنے میں کتنے پھسڈی ہیں۔

قبر کا رشتہ

قبرستان کے آخری کونے میں دیوار کے نزدیک ایک سایہ ساکھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سلام کیا۔

"میری قبر یہاں سے خاصی دور ہے" اس نے کہا "میں نے آج پہلی مرتبہ اتنی دور آنے کی ہمت کی ہے۔ پہلی مرتبہ خود کو بتانے کہ آج میں آزاد ہوں آزادی کا یہ مطلب ہے ناکہ آدمی جہاں چاہے جاسکے۔"

"آپ بہت رنجیدہ ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی مایوسی پاکر پوچھا۔

"رنجیدہ؟ نہیں آج تو میں بہت خوش ہوں۔ آج میری وہ خواہش پوری ہوگئی جس کی تمنا برسوں سے تھی۔ نہ جانے کب سے۔ اب تو یہ بات بھی ذہن سے نکل گئی۔" اس نے ہنس کر بھی دکھایا لیکن اس کی ہنسی میں کوئی شگفتگی نہ تھی۔

"اچھا۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"آپ کو میری بات کا یقین نہیں۔ آپ اجنبی ہیں اور میرے پاس وقت ہے۔ میرا خیال ہے میں آپ کو اپنی کہانی سنا دوں ــــ اگر آپ سننا چاہیں۔" بعد میں اس نے آخری جملے کا اضافہ کیا۔

"نہیں میرے پاس وقت نہیں ہے۔ پھر کبھی سہی" میں نے کہا۔

"اچھا تو آپ ابھی اسی منزل میں ہیں" اس کی ہنسی میں تلخی کم، دکھ زیادہ تھا۔

"کس منزل میں؟" میں نے پوچھا۔

" اوہ ــــ کچھ نہیں - ہر ایک کو اپنے ہی ترازو میں تولنے کی عادت بھی کتنی غلط ہے۔ مجھ میں بھی خرابی ہے ــــ ظاہر ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزری، ضروری نہیں کہ وہ سب پر گزرے۔"

" آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔" میں نے کہا۔

" وہ ــــ ہمارے ہاں ایک ایک قبر میں دو دو مردے دفن کرنے کا دستور ہے نا، اور ان کے درمیان ایک بندھن بھی باندھا جاتا ہے، تو نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال ہو گیا کہ یہ بندھن اور اس کا طریق کار سب کے لئے یکساں ہو گا۔ غلط بات ہے نا؟"

" ذرا کھل کر کہیئے۔"

" بات یہ ہے کہ میں اور ساتھی جو ایک قبر میں تھے ایک عجیب و غریب رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ رشتہ دھاگے کو کہتے ہیں نا۔ وہ دھاگا نہیں تھا ایک ٹیوب تھی جو ایک سرے پر میرے جسم میں پیوست تھی اور دوسرا اس کے بدن میں تھا۔ اس میں قدرتی طور پر ایک محلول سا بنتا رہتا تھا جو شیریں ہوتا تھا مگر جب وہ زیادہ شیریں ہو جاتا تھا تو ایک دم تلخ ہو جاتا تھا۔ زہر کی طرح ــــ نہیں وہ زہر ہی ہو جاتا تھا۔ وہ زہر میرے اور اس کے جسم میں گردش کرتا رہتا تھا اس کے جسم کا زہر اپنی گردش ختم کر کے میرے بدن میں اور میرے جسم کا زہر اس کے بدن میں داخل ہو جاتا تھا۔ ایک وقت ایسا آتا تھا کہ اس کی کڑواہٹ واقعی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھی کی التدعا ہوتی تھی " خدا کے لئے اس نلکی کو کاٹ دو، اس بندھن کو کاٹ دو تاکہ یہ زہر نکل جائے اور ہم سکون کا سانس لے سکیں "۔ تم خود کاٹ دو ــــ مجھ ہی پر حکم کیوں۔" ہم دونوں نفرت سے منہ پھیر لیتے، زہر کے اثر سے نیلے ہو جاتے۔ اتنی ہمت بھی نہیں رہتی کہ اس نلکی کو واقعی کاٹ دیں۔ دل تاویلیں ڈھالتا ابھی اس نلکی کو کاٹنا ٹھیک نہیں۔ اس میں زہر ہے۔ اگر سرا ملنے پر نکل بھی گیا تب بھی ممکن ہے کچھ بدن کے اندر رہ جائے۔ جس وقت محلول شیریں ہو گا اس وقت کاٹنا مناسب رہے گا۔ اگر کچھ رہ بھی گیا تو جسم کو پھونکے گا تو نہیں جلائے گا تو نہیں۔ وقت گزر جاتا۔ محلول شیریں ہو جاتا تو نلکی کاٹنے کی بات بھی

ذہن سے نکل جاتی اور جب تلخ ہو جاتا تو اتنی سکت نہ رہتی —— آخر ایک دن ساتھی نے ہی ہمت کی۔ جانے کہاں سے کلہاڑی حاصل کر کے اس نے نلکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "سوچ لو" میں نے کہا "اس کے بعد، ہم ایک قبر میں نہیں رہ سکتے"۔ "مجھے معلوم ہے" اس نے جواب دیا۔ "تو یوں کہو کہ تم نے کسی قبر کا بندوبست کر لیا ہے —— شاید کوئی اور بھی اسی کلہاڑی سے اپنے بندھن کاٹ چکا ہوگا" —— یہ سنتے ہی کلہاڑی اس کے ہاتھ سے گر گئی مگر اس کا رنگ اتنا گہرا نیلا ہو گیا کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوا تھا —— اس کے بعد سے اس نے وہ کلہاڑی پھر کبھی نہ اٹھائی۔ زہر کے پشتارے بنے ہم اسی طرح پڑے رہے۔ برسوں گزر گئے۔ لگتا تھا جیسے ہم اس زہر کے عادی ہو گئے ہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ زہر کا عادی ہونا ممکن نہیں ہے پھر پتہ ہے آج صبح اچانک کیا ہوا؟ ہم خود بخود الگ ہو گئے۔ قدرتی طور پر۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ نلکی سوکھ رہی ہے۔ میں اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔ مگر آج صبح وہ بڑی آسانی سے جھڑ گئی۔ اس نے ہم دونوں کو آزاد کر دیا۔ کتنی عجیب بات ہے مگر اس سے عجیب بات یہ تھی کہ ہم خوشی سے نہ ناچے نہ کودے، نہ دیوانے ہوتے۔ بس شرمندگی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ ہو رہے۔ میں نے سوچا۔ آج تنہا گھومنا پھرنا، آزادی سے ہر جگہ جانا اور ہر ایک سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگے گا۔ لیکن مجھے کوئی بھی نہ ملا۔ شاید سب اپنے اپنے زہر بھرے بندھنوں میں بندھے قبروں میں پڑے تھے۔ آپ کو دیکھا تو میرا دل خوشی سے کھل اٹھا کہ اب خوب باتیں ہوں گی۔ مگر آپ کو شاید جلدی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"پھر بھی میری تسلی کے لئے اتنا تو بتا دیجئے کہ کیا سب کے ساتھ یوں ہی ہوتا ہے؟ کیا سب اسی رشتے سے بندھے ہوتے ہیں جس سے ہم بندھے تھے؟ کیا سب کے رشتے اسی طرح خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں ——؟"

"یہ باتیں کہنے سننے کی نہیں ہوتیں۔" میں نے کہا "رشتوں کی اپنی تقدیس ہوتی ہے اور یہ

رشتہ تو بے حد مقدس ہے۔ یہ خود بخود کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ بڑا مہمان رشتہ ہے، قبر کا رشتہ تو۔"

"اچھا۔" اس نے میری طرف تذبذب سے دیکھا۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔ "پھر میں چلوں۔"

جاتے ہوئے اس کے قدم سست تھے۔ میں نے سوچا دیکھوں تو اس کی منزل کہاں ہے۔ میں نے اس کے نقشِ قدم پکڑ لئے۔ وہ سایہ بہت دیر تک ایک قبر کے آس پاس منڈلانے کے بعد اندر غائب ہو گیا۔ میں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہ کی۔

"تم ۔۔۔؟" اندر اندھیرے میں کوئی اس سے مخاطب تھا۔

"ہاں، مجھے تو آنا ہی تھا، یہ قبر میری ہے۔ اس پر میرے نام کا کتبہ ہے ۔۔۔ مگر تم ابھی تک یہاں کیسے ہو۔۔۔؟"

"میں ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں نے ابھی تک کسی دوسری قبر کا انتظام نہیں کیا۔" آواز میں شرمندگی تھی۔

"اوہ ۔۔۔ تو پھر تم یہیں رہو۔"

"بغیر کسی رشتے کے؟"

"نہیں، یہ رشتہ خود بخود ٹوٹ نہیں سکتا ۔۔۔ مجھے ابھی ابھی ایک دانشمند نے بتایا ہے کہ یہ رشتے ٹوٹ ہی نہیں سکتے۔ یہ بہت مقدس ہوتے ہیں، بڑے مہمان ہوتے ہیں۔"

میں نے چاہا پکار کر کہوں۔ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ تم اس بات پر کوئی دھیان نہ دو۔ زندگی میں آزادی سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔"

مگر نہ جانے کیا ہوا کہ آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

بازیافت

ٹاور آف لندن کی سنگین عمارت اور اس کے باغیوں کے گیٹ سے نکل کر سیلی ہوئی پتھریلی سڑک پر چلتی ہوئی میں ٹیمز کے اوپر بنے ہوئے ٹاور برج پر چلی گئی۔ ٹیمز کے گدلے پانی میں کوئی چیز ابھر اور ڈوب رہی تھی۔ میرا دل اس کے ساتھ ابھرنے اور ڈوبنے لگا۔ میں بڑے ذوق و شوق سے انگلینڈ آئی تھی، اس لئے نہیں کہ یہ انگریزوں کا ملک تھا جنہوں نے ہم پر صدیوں حکومت کی تھی، بلکہ اس لئے کہ مجھے دنیا کی سیاحت کا شوق تھا اور انگریزوں کو میں نے انگریزی ناولوں کے ذریعہ بہت بچپن سے جانا پہچانا تھا۔ لندن کے جانے پہچانے نام مجھے اپنے بچپن کے خوابوں کی طرح عزیز تھے، مگر جب میں یہاں آئی تو یہاں کے لوگ اس نازک رشتے کو نہ سمجھ سکے۔ وہ صرف یہ سمجھے کہ میں ان کے وطن میں ان کے کسی ہم وطن کا حق سلب کرنے آئی ہوں اور اب کبھی اپنے ملک واپس نہیں جاؤں گی۔ ان کے نزدیک میں اور میرے ہم وطن ایسی جونکیں ہیں جو اپنے ملک سے ان کا خون چوستے یہاں آتی ہیں۔ وہ ہمیں پسند نہیں کرتے اور اس بات کو چھپانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ کیا یہ ان کا احساس جرم ہے۔ کیا انہیں اپنا خون چوسنا یاد آتا ہے؟ کیا وہ نسلی تعصب ہے جس کی جڑیں نسلوں پرانی ہیں؟ کیا یہ احساس برتری ہے، معاشی یا ثقافتی برتری؟ یا پھر اس میں ہمارا کچھ قصور ہے؟ میں نے دور مغرب کی طرف دیکھا۔ نیشنل آرٹ گیلری کے رومن ستونوں کے پیچھے بادلوں میں بارش سے بھیگا ہوا سورج بڑی کس مپرسی کے عالم میں ڈوب رہا تھا۔ جیسے اپنے ہی خون میں نہا رہا ہو۔

شاید یہی وقت ہوگا جب ایک صدی پہلے افریقہ میں بچے دریائے نارنج کے کنارے

حسبِ معمول کھیل رہے تھے۔ دریا کے دونوں طرف دور دور تک پتھریلے کنارے تھے، جہاں ہر رنگ ہر شکل کا ڈھلا ڈھلایا پتھر موجود تھا۔ دریا سے ذرا دور چراگاہیں شروع ہوتی تھیں جو میلوں میل تک چلی گئی تھیں۔ لمبی گھاس ہوا میں یوں لہراتی جیسے سبز سمندر میں لہریں اُٹھتی چلی جا رہی ہوں۔ دور افق پر پہاڑوں کا سلسلہ تھا جہاں گھنے جنگلات کا ڈیرہ تھا اور ہر وقت چھما چھم بارش ہوتی تھی۔ اس بارش میں بھیگے درخت سر جھکائے انکساری سے کھڑے رہتے تھے۔ یہ انکساری اور سر نیہوڑا بھی ان کی عادت بن گئی تھی۔ یہاں کے بچوں کے سیاہ ننگے بدنوں پر بہتی ہوئی بوندیں ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے دریا کے کنارے کھیلنا، تیرنا اور چپٹے پتھر پانی میں اس طرح پھینکنا کہ وہ پانی کی سطح سے چھوتے ہوئے دور تک جائیں ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

"بتونگ"، قبیلے کے ایک لڑکے نے پتھر پھینکتے پھینکتے ہاتھ روک لیا اور پتھر کو غور سے دیکھنے لگا۔ دوسرے بچوں نے بھی اسے حیرت سے دیکھا۔ طرح طرح کی شکلوں اور رنگوں والے پتھروں سے بالکل مختلف وہ پتھر ڈوبتے سورج کی شعاعوں میں عجیب غیر معمولی انداز سے چمک رہا تھا۔ ڈچ کالونی کے ایک "بور" نے لڑکے کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ہوتے ہوتے یہ پتھر یورپ پہنچا تو ہیرے ہیرے کی پکار سے سارا یورپ لرز اٹھا۔ تب تک چند اسی طرح کے پتھر دریائے وال کے کنارے دستیاب ہو چکے تھے۔ ۱۸۷۱ء میں کیمبرلے کے علاقے میں معلوم ہوا کہ زمین کا ایک خاصا وسیع ٹکڑا ہیروں سے ٹپا پڑا ہے۔ یہ زمین دو علاقوں کے بیچ میں تھی ایک اورینج فری اسٹیٹ دوسری گریکوینڈ۔ دراصل زمین ایک غریب آدمی کی تھی جو ڈچ نو آبادکاروں میں سے تھا اور جس کا نام نکلس واٹربور تھا۔ دوسرے یورپی ملک ابھی اس معاملے پر سوچ ہی رہے تھے کہ انگریزوں نے تربت اس مفلس کا ہاتھ تھاما اور زمین اس سے خرید لی اورینج فری اسٹیٹ اور ٹرانسوال والے لاکھ چلائے کہ ہمارا حق ہے لیکن انگریزوں نے کہا "کیسا حق، یہ سارا علاقہ تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں ہے۔"

ان دنوں برطانیہ میں چھوٹی موٹی سی ملکہ وکٹوریہ راج کر رہی تھی کہ جس کی سلطنت افریقہ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہندوستان اور کینیڈا تک پھیلی ہوئی تھی اور برطانوی جہاں کہیں بھی تھا ملکہ کا دل دادہ اور وفادار تھا اور ہر اس چیز کو جو قیمتی معلوم ہوتا جدار برطانیہ تک پہنچانا اپنا فرض جانتا تھا۔ چنانچہ جتنے علاقے دنیا میں جہاں کہیں ہیرے، موتی، سونا، تیل یا تیل اگلتے تھے وہ سب تاج برطانیہ کے زیر نگیں تھے اور سارے ہیرے چاہے وہ افریقہ کے اورینج یا وال دریا کے کنارے ملیں، یا جنوبی ہندوستان کے کسی کسان کے کھیت میں وہ کسی تخت میں جڑے ہوں یا تاج میں بالآخر ان پر حق کس کا تھا؟ تاج برطانیہ کا کیونکہ اس کے ہر باشندے نے تہیہ کر رکھا تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں چاند، سورج، ہیرے، موتی، تیل پھلیل ملے گا وہ اپنی ملکہ کے قدموں میں رکھ دیں گے اور ان سب چیزوں کے بدلے انہیں ہمیشہ انعام ہی نہیں ملا۔ مقدمے بھی چلے رسوائی بھی ہوئی، دار پہ بھی چڑھے، مگر وہ یہی کہتے رہے ؎

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے	تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا	رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اور ان دنوں برطانیہ کی ملکہ مٹی میں ہاتھ ڈالتی تھی تو وہ سونا بن جاتی تھی۔ اپنے گھر میں فیکٹریاں سونا اُگل رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے غریب انگلستان امیر ہو رہا تھا۔ متوسط طبقہ صنعتی انقلاب میں پیسہ کما کر رئیس ہو گیا تھا۔ مزدور طبقہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ دھڑا دھڑ ریلیں بن رہی تھیں اور چل رہی تھیں۔ تیل کے بجائے گیس کے ہنڈے جل رہے تھے اور جوہڑوں اور دریاؤں کے پانی کی جگہ گھر گھر نلکے لگ رہے تھے۔ کھانے کا سامان دوسرے ملکوں سے برائے نام قیمت پر اور بعض اوقات تو مفت آ جاتا تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی اپنے ہاں زمینیں جوتنے کی۔ لوگ جوق در جوق کھیت کھلیان چھوڑ شہروں کا رخ کر رہے تھے اور لارڈوں کے محلات اور باغات میں بھیک کے ٹھیکرے دھرے تھے۔

جن پر لکھا تھا کہ ان کی دیکھ دیکھ اور مرمت کے لئے کچھ عطا ہو تو بڑی عنایت ہو۔ جن کے پاس پیسہ تھا وہ زمین کوڑیوں کے مول خرید کر اپنے لئے محلات شکارگاہیں اور باغات تعمیر کر رہے تھے۔ ہر طرف پیسے اور خوشحالی کی ریل پیل تھی۔ اس وقت بھی برطانیہ میں ایسے سر پھرے تھے، جو کہتے تھے بادشاہی ختم کر دو یہ مہنگا سودا ہے، اس پر بہت خرچ آتا ہے۔ مگر برطانیہ کی نوجوان ملکہ اپنے جرمن نژاد شہزادے میاں کے ساتھ دنیا میں چوکھونٹ راج کرتی رہی اور ایک ایک وقت میں سولہ سولہ کورس کے ڈنر کھا کر اپنا وزن اور بچے بڑھاتی رہی۔

یہ وہ وقت تھا کہ انگریز دنیا میں جو چاہے کرے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اگر کوئی پوچھتا تو منہ کی کھاتا۔ روس نے ذرا ہاتھ پاؤں نکالے، انگریزوں نے کریمیا میں جا دبایا۔ ہندوستانیوں نے میرٹھ اور دلی میں سر اٹھایا تو ایسا کچلا کہ صدیوں تک سانس نہ آیا اور پورا ہندوستان مع کوہ نور ہیرے کے ملکہ کی گود میں آ گیا۔ اس زمانے میں شاید منکر نکیر بھی انگریزوں سے حساب کتاب لیتے ہوئے ڈرتے ہوں۔ رہی ببلیکن کی کیا حقیقت، جو کہتے تھے کہ کالونیوں سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا دفع کرو انہیں۔ ہمارے لئے اپنا "چھوٹا انگلینڈ" ہی بہت ہے۔ مگر چھوٹے انگلینڈ کی بات کون سنتا جب انگلینڈ تو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جنوبی افریقہ میں، ہندوستان میں پہاڑوں پر، سمندروں میں، سوئز نہر بے چارے، مفلس، مقروض مصر کے گورنر نے کوڑیوں کے مول انگریزوں کے ہاتھ بیچ دی۔ ادھر افریقہ کے مغربی ساحل پر سفید فام آبادی بڑھتی جا رہی تھی، حالانکہ ان میں سے آدھے غریب ملیریا کا شکار ہو کر جاں بحق ہو رہے تھے۔ غرضیکہ یہ وقت تھا جب سورج برطانوی راج کے کسی نہ کسی حصے میں چمکتا رہتا تھا اور غروب ہونا نہیں جانتا تھا۔

ایسے میں ملکہ اور اس کے دانا وزیروں نے سوچا کہ اپنے امیر کبیر ملک، اور کبھی سورج غروب نہ ہونے والی سلطنت کے ٹھاٹھ دکھانے کے لئے ایک کی نمائش کی جائے اس

کام کا ذمہ ملکہ کے خوبرو شوہر البرٹ نے لیا۔ فوراً ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا کہ "عظیم نمائش" کے لئے ایک عمارت کا ڈیزائن درکار ہے۔ ایک باغبان زادہ نقشہ تیار کر کے لایا۔ لوہے کے فریم میں شیشے جڑے ہوئے کمرے جیسے وہ اپنے لارڈ کے باغات میں پودوں کی نشو و نما کے لئے بنایا کرتا تھا۔ یہ نقشہ انہی کمروں سے مماثلت رکھتا تھا۔ یہ نقشہ منظور ہوا اور ہائڈ پارک میں لوہے اور شیشے کی یہ عظیم عمارت بننی شروع ہوئی۔ لوگ ہنستے تھے کہ کبھی شیشے کے گھر بھی بنے ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ بارش میں یک بیک ہی ڈھے جائے گا۔ کوئی کہتا تھا کہ دھوپ اور گرمی سے پگھل جائے گا۔ کوئی کہتا تھا کہ طوفان میں اُڑ جائے گا، مگر ان دنوں برطانیہ کے لئے کوئی کام ناممکن نہیں تھا۔ عمارت بنی اور لوگوں نے دیکھا کہ شیشے کا یہ محل کوئی چھوٹی موٹی عمارت نہیں تھی، بلکہ اٹھارہ سو اکیاون فٹ لمبی، چار سو فٹ چوڑی اور چونسٹھ فٹ اونچی یہ ایک ایسی عمارت تھی جس کے اندر تین قد آور درخت سما گئے تھے۔

نمائش کے لئے اس میں لوہے کی بڑی بڑی مشینیں، ریلوے انجن، گرم ممالک کے انوکھے پودے اور سلطنت برطانیہ کی انمول چیزیں تھیں، جن میں کوہ نور ہیرا بھی تھا۔ ملکہ وکٹوریہ بڑی شان کے ساتھ ایک لمبے جلوس کی قیادت کرتی ہوئی بکنگھم پیلس سے جہاں وارد ہوئی تھیں۔ ہزارہا لوگ ہائیڈ پارک میں یہ تماشہ دیکھنے اکٹھے ہوئے تھے۔ ملکہ ایک اونچے پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے تخت پر بیٹھی تھی۔ سر پہ ریشمی چھتر سایہ فگن تھا جس پہ یونین جیک لہرا رہا تھا۔ پرنس البرٹ نے تقریر کی۔ گانے گائے گئے جس کے بعد ملکہ اور خواص نے گھوم پھر کر ساری نمائش دیکھی۔ شاہی مہمانوں کے بعد عوام کے لئے اس کے دروازے کھول دیئے گئے۔ پہلے ہی دن پچیس ہزار افراد نے یہ نمائش دیکھی۔ ایک سو اڑتیس دن تک یہ نمائش چلی؛ جسے دیکھنے دور دراز سے لاکھوں افراد آئے۔ انگلینڈ کے دور پار کے علاقوں سے لوگ باگ زندگی میں پہلی بار اپنے گھروں سے نکلے تھے۔

مگر اب میں جب ہائیڈ پارک کو دیکھ کر آ رہی تھی، وہاں کوئی شیش محل نہیں تھا۔ "وہ

تو مدت ہوئی نذر آتش ہو گیا،" کسی نے مجھے بتایا۔ اب اس کی یادگار چند چھوٹے چھوٹے پگوڈا تھے۔ جن میں سبز بیلیں لگی ہوئی تھیں اور جو ایک ریستوران کی زینت تھے۔ ہکہ ٹیمز کے کنارے ٹاور محل میں کوہ نور اب تک موجود تھا جو پانچ ہزار سال پہلے ہند کی سرزمین سے برآمد ہوا تھا اور جس کا وزن ۸۰۰ قیراط تھا اور اب کاٹنے چھانٹنے کے بعد اس کا وزن صرف ۱۰۹ قیراط رہ گیا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ہیرا تاج برطانیہ میں جڑا ہوا ہے گو برطانیہ کی موجودہ ملکہ نے اس تاج کو آج تک سر پر نہیں دھرا۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے سورج ڈوب گیا۔ اب نہ اندھیرا ہے نہ اُجالا۔ یہ کیفیت یہاں تا دیر رہے گی۔ ٹاور برج پر ہوا تیز اور ٹھنڈی تھی۔ میں نیچے اُتر آئی۔ اس وقت تک ٹاور کا "باغیوں کا گیٹ" خطرناک حد تک سنسان اور ڈراؤنا ہو چکا تھا۔ ٹاور کی سنگین عمارت اور مضبوط جنگلے سے لگی ہوئی پتلی سیاہ سڑک کچھ اور سیاہ ہو رہی تھی۔ میرا دل بوجھل سا تھا۔ اب تو سورج غروب ہو گیا۔ اب تو سب کی زمینیں واپس ہو گئیں، نہریں لوٹا دی گئیں۔ نیل واپس ہو گیا۔ کیوں نہ میں بکنگھم پیلس جا کر کہوں ——" اب مجھے میری چیزیں لوٹا دو۔ میرے شاعروں کے دیوان.... بہادر شاہ کے مقدمے کے فائل، کوہ نور ہیرا اور ہاں میرا کھویا ہوا وقار بھی تو.....""

میں نے پلٹ کر غور سے دیکھا۔ دریائے ٹیمز میں جو چیز بہت دیر سے تیر رہی تھی، کبھی ڈوبتی تھی، کبھی اُبھرتی تھی، وہ تو انگلش پاؤنڈ تھا اور سورج کو ڈوبے دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت نہ اجالا تھا نہ اندھیرا۔ یہ کیفیت ابھی یہاں تا دیر رہے گی۔

کونج

اگر دیکھا جائے تو یہ لڑکی ایک عدد کالے، سفید اور گلابی رنگ پر مشتمل ہے۔ مگر اس کی شخصیت میں کیسی رنگا رنگی ہے۔ ان تین رنگوں میں کیسی کشش ہے کہ کھلے منہ پھرنے والی ساری لڑکیاں بے دُھلے لٹھے کی طرح بے کیف نظر آتی ہیں۔ پھر اس کالے برقع میں چُھپے ہوئے اس کے سر میں بھی کچھ ضرور ہے جو وہ اتنی اچھی انگریزی لکھ لیتی ہے اور ہر وہ بات اس کے دماغ میں سما جاتی ہے جو ان دیہاتی لڑکوں کی ذہنی سطح کو صرف چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ جب پوری کلاس سے وہ کوئی بات پوچھتا ہے اور سب کورے رہ جاتے ہیں تو آخر میں بڑے اعتماد سے وہ کہتا ہے "مس رضا"، یوں جیسے اب وہ خود جواب دینے والا ہو اور وہ دھیمے لہجے میں اس سوال کا جواب دے دیتی ہے اور وہ "ویری گڈ" کہہ کر اس کا جواب دہراتا ہے اور جب اسے کوئی بات پوچھنی ہوتی ہے تو وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ پرا باندھے کار کے پاس کھڑی اس کا انتظار کرتی ہے وہ آتا ہے تو آگے بڑھ کر اس سے سوال پوچھتی ہے اور ایک ہاتھ سے برقع کو ناک پر تھامے رکھتی ہے۔ کار کے اوپر چیڑ کا سایہ ہوتا ہے۔ سامنے پرنسپل کے گھر کی نیلی چقیں ہوتی ہیں۔ یہاں سے وہاں تک گملوں میں للی کھلی ہوتی ہے۔ فضا میں سرسبز گھاس اور پانی کی طراوت ہوتی ہے اور وہ اپنی کار کے ہڈ پر کتاب رکھ کر ان لڑکیوں کو سمجھاتا ہے اور سوال سمجھانے کے بعد ادھر اُدھر کی کوئی بات چھیڑ دیتا ہے اور اس وقت باڑ کے اس پار گزرنے والے لڑکے اسے دیکھ کر مسکراتے اور پروفیسر جل بھن جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لڑکیاں اس کے پڑھانے کے انداز پر نہیں اس کی سفید چمڑی اور لمبی کار پر مرتی ہیں۔ اس کی باتوں کے جواب زیادہ تر وہی دیتی ٹھہر ٹھہر

کے سنبھل سنبھل کے۔ کیونکہ جس زناٹے کی انگریزی وہ لکھتی ہے، اس فراٹے سے بول نہیں سکتی۔
اسی لئے اس کی باتوں میں بہت سی باتیں نہ کہہ سکنے کا تاثر رہ جاتا ہے۔ یہی تشنگی تھی یا کچھ اور
کہ کبھی کبھی جم کو یوں لگتا جیسے اس کا کوئی ٹکڑا ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے اب وہ اسے کہاں ڈھونڈے۔
اسے بڑی کوفت سی ہوتی۔ ادھورے پن کا احساس کانٹا بن کر چُبھے جاتا اور یہ بھی تو پتہ نہیں کہ
جو حصہ ٹوٹ کر گر گیا ہے کہاں کا تھا، کیسے ٹوٹا کہاں گیا۔"

جوں جوں فائنل ایئر ختم پہ آ رہا تھا اس احساس میں شدت آ رہی تھی اور اس قسم کے دردوں
میں اضافہ ہو رہا تھا۔ رات کو بلا وجہ آنکھ کھل جاتی اور نیند نہ آتی۔ پچھلے صحن میں کونج کی رفاقت
اس کے احساسِ تنہائی کو اور بھی بڑھاتی، یہ بے چارہ چھوٹی سی جگہ میں قید ہے اور میں ملک
ملک پھرنے کو آزاد مگر جہاں تک تنہائی کا تعلق ہے، ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ جو سارے
سال کبھی ایک دن کا ناغہ کرتا تھا، کبھی ایک منٹ کی دیر نہ کرتا تھا۔ روز لیٹ ہو جاتا اور اب
کلاس میں بھی اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہونے لگیں۔ یہ خیال کہ جو کچھ اب میرے نزدیک
ہے ہمیشہ نہیں رہے گا۔ ذہن کے کسی گوشہ میں چھپا رہتا۔ کلاس ختم ہو جاتی، دوسرا لیکچرار دروازے
کے باہر آ کھڑا ہوتا اور وہ پڑھائے جاتا، پڑھائے جاتا جیسے آج کلاس سے جانا جان سے جانا ہے۔
اور پھر ایک دن حسبِ معمول بہت سے لڑکے لڑکیوں کے پاس کتابیں نہیں تھیں۔ چھوٹے
سے اس شہر میں ایم۔ اے کی کلاسیں مقامی کالج میں نئی نئی کھلی تھیں اور یونیورسٹی کی پڑھائی
اِدھر اُدھر کے گاؤں سے آنے والے دیہاتی لڑکوں کے لئے کچھ اسکول ہی کے انداز کی ہوتی
تھی۔ کتاب اس کے پاس بھی نہیں تھی جو عموماً سب سے پہلے کتاب خرید تی تھی۔ پڑھاتے
پڑھاتے یکایک وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور بڑی کھوکھلی آواز میں جیسے کوئی پہاڑی کوا
"گگرایا"، ہو کہا۔ "ہم دونوں اس کتاب میں ساجھا کر لیتے ہیں۔" اس نے کتاب ڈیسک پر رکھ
دی اور جب وہ انگلی رکھ کر عبارت کی نشاندہی کر رہا تھا اور باقی کلاس کو سمجھا رہا تھا۔ تو
یکایک اسے احساس ہوا کہ سب سے آگے بیٹھی مس رضا کے ساتھ کتاب کا ساجھا کرنے سے ساری

کلاس کی طرف اس کی پیٹھ ہو گئی ہے اور یہ عجیب مضحکہ خیز حرکت اس نے کی ہے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے اور سارا زمانہ اس پر ہنس رہا ہے۔ تب اس نے کتاب آہستہ سے وہاں سے اٹھا لی تھی۔ منہ موڑ کر کلاس کی طرف کر لیا تھا اور حسبِ معمول ڈائس کے پیچھے ذرا سا بائیں طرف کو کھڑے ہوتے کہ کبھی کبھی پنکھے کی ہوا سے پھڑ پھڑاتا برقع اس کے بدن سے ہلکا سا مس ہو جائے۔ کلاس کو سمجھانے لگا مگر کیا! اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے تھے اور ان میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اب ایسی غلطیاں اکثر ہونے لگی تھیں اور ان کا احساس ہمیشہ کر چکنے کے بعد ہوتا تھا جیسے ایک دن اس نے نئی کتاب شروع کر دینے سے پہلے کہا تھا "میں یہ کتاب خریدنے جا رہا ہوں۔ دوکاندار نے کہا تھا آج پہنچ جائیں گی، جتنی بھی ملیں لیتا آؤں؟"

"یس سر" بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

"آؤ، لڑکیو تم بھی میرے ساتھ چلو بازار نزدیک ہی تو ہے" سر کے اس کی طرف دیکھنے پر وہ شرم سے سرخ پڑ گئی تھی اور آہستہ سے معذرت کر دی تھی۔ کیونکہ وہ ایک مولوی گھرانے کی لڑکی تھی اور یہ شہر اتنا چھوٹا تھا کہ سب اسے اور اس کے خاندان والوں کو جانتے تھے، ویسے ہی ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لئے ان لڑکیوں کو بغاوت کی حد تک ضد کرنی پڑی تھی۔ اس کے منع پر باقی لڑکیوں نے بھی بڑی حسرت سے اس موقع کو کھوتے دیکھا تھا۔ مگر کسی کی ساتھ جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ہاں اگر وہ راضی ہو جاتی تو شاید...... اس روز جو وہ کتاب لینے گیا تو پھر سارا دن کالج نہ لوٹا تھا۔

اور پھر فائنل کا آخری دن آ پہنچا تھا۔ اس کے بعد امتحان کی تیاری کے لئے ان کو چھٹی دی جا رہی تھی اس دن ٹٹوریل تھا جو اس نے لائبریری میں لیا تھا۔ اسٹاف کم ہونے کی وجہ سے پریوسس اور فائنل کی کلاسیں اکٹھی ہوتی تھیں مگر ٹٹوریل میں صرف فائنل کلاس ہوتی تھی۔ اس دن لائبریری کے ایک علیحدہ سنسان کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کا دل کچھ عجیب طور سے بھرا آ رہا تھا۔ لڑکیاں اس کے بالکل سامنے بڑی سی میز کے دوسری طرف بیٹھی تھیں، لڑکے

اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔ جم نے اس سے اپنا تازہ مقالہ پڑھنے کو کہا۔ اس کی مدھم، مدھر آواز کو سنتے ہوئے اس کی لمبی پتلی انگلیوں کے گلابی ناخونوں کو دیکھتے ہوئے اس کی کالی گھری آنکھوں کی طرف تکتے ہوئے کتنی ہی مرتبہ اس کا دل چاہا کہ میز کو زور کی ٹھوکر مارے اور کھڑکی سے کود کر بھاگ جائے یا پھر...... اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لے اور سب کے سامنے اتنا چومے کہ ہالی وڈ کے پکچر بات ہو جائیں یا پھر...... یا پھر...... وہ کیا پڑھ رہی تھی۔ اس نے تو کچھ نہ سنا تھا اور یکایک لڑکے لڑکیوں نے دیکھا کہ اس کا چشمہ بھیگ گیا ہے جیسے موسلا دھار بارش کی بوچھاڑ میں گھروں کے شیشے بھیگ جاتے ہیں۔ اس نے چشمہ اتار لیا اور ٹپ ٹپ آنسو سامنے رکھی ہوئی کتاب کی جلد پر گرے۔ اس کے آنسو گویا بارش کے پہلے قطرے تھے۔ فوراً ہی لڑکیاں یوں رونے لگیں۔ جیسے وہ باقاعدہ رونے کا پروگرام بنا کر آئی ہوں۔ آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر کر اس کے مقالے کو بھگونے لگے۔ پھر اس نے اپنے بازو کا چھٹا میز پر بچھایا اور اس پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی۔ باقی لڑکیاں بھی رونے میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ دو ایک کی تو باقاعدہ چیخیں نکلیں۔ ماحول ایسا گھمبیر ہو گیا تھا کہ لڑکے تک افسردہ ہو گئے۔ جم نے رومال سے اپنا چشمہ صاف کیا، کتاب اٹھائی۔ اور بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گیا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے چلے گئے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے گلے مل کر دیر تک کہرام مچایا کیں۔ اور پھر جم نے سنا کہ وہ کالج کے ایک ایک درخت سے لپٹ کر روئی اتنا کہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ایک لڑکے نے آن کر اطلاع دی "مسز جم نے کہلوایا ہے کہ گو کالج کی چھٹیاں ہو رہی ہیں لیکن اگر لڑکے لڑکیاں ان سے پڑھنا چاہیں تو علی الصبح ان کے گھر پہ آ جایا کریں۔ لڑکوں نے تو اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا مگر لڑکیوں نے مل کر کھچڑی پکائی اور دو ایک لڑکیوں کو چھوڑ کر جن کے گھر بہت دور تھے یا جن کے ماں باپ کالج کے علاوہ ان کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سب علی الصبح اس کے مکان پہ آنے لگیں۔ اس کے پاس

ایک بڑا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں سونے کے لئے پلنگ بھی تھا۔ بیٹھنے کے لئے صوفے بھی تھے، کھانے کی میز بھی تھی اور کتابوں کی شیلف بھی تھی ہر چیز ایک خاص مردانہ وجاہت اور نفاست لئے ہوتے تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس کمرے کی صفائی اور سجاوٹ میں صنفِ نازک کا ہاتھ نہیں۔ وہ سب صوفوں اور کرسیوں پر ایک بکھرے سے نیم دائرے میں بیٹھ جاتیں اور پڑھتی رہتیں۔ پڑھتے پڑھاتے اس کے کالج جانے کا وقت ہو جاتا مگر وہ نظر انداز کر دیتا۔ پھر لڑکیوں کے شدید احتجاج کے باوجود چائے آجاتی۔ جم اس سے درخواست کرتا کہ سب کو چائے بنا کر دے۔ یہ چائے کا سارا کھڑاگ اس ایک لمحے ہی کے لئے تو تھا جب وہ اپنی پتلی انگلیوں اور گلابی ناخنوں سے پیالی اس کی طرف بڑھائے۔ دوسری لڑکیاں اس کی مدد کرتیں اور کبھی کبھی کوئی اور لڑکی اس کی طرف پیالی بڑھاتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے سارا کیا کرایا مٹی میں مل گیا۔ چائے کے بعد وہ پھر پڑھانے بیٹھ جاتا۔ حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ کالج شروع ہو چکا ہوگا۔ پریویس کے چھوٹے چھوٹے کھڑے بالوں والے دہقانی لڑکے اس کے منتظر ہوں گے اور لڑکیاں چہ می گوئیاں کر رہی ہوں گی کہ جب سے فائنل ائر گیا ہے۔ سر نے ان کا نوٹس لینا چھوڑ ہی دیا ہے اور چند ہی دن جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں اس سے باز پرس ہو گی۔ دل کو یہ سب سمجھاتے سمجھاتے جب دیر ہو جاتی تو آخر ہمت کر کے وہ پڑھائی کے خاتمہ کا اعلان کر دیتا۔ لڑکیاں چلی جاتیں تو وہ بڑی بے دلی سے کالج کے لئے روانہ ہو جاتا۔ پہنچتا تو دو ایک پیریڈ نکل چکے ہوتے۔

پھر ایک دن اس نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ کل نہ آئیں اسے کہیں جانا ہے۔ رخصت سے پہلے اس نے بک شیلف میں سے ایک کتاب نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

"مس رضا تم اسے ضرور پڑھو،" کتابیں وہ اکثر لڑکے لڑکیوں کو پڑھنے کے لئے دیا کرتا تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ گھر آکر جب اس نے کتاب کھولی تو پہلے ہی صفحے پر پن کے ساتھ ایک پرچہ لگا ہوا تھا جس پر اس کے مخصوص بڑے بڑے خط میں لکھا تھا کل میں کہیں نہیں جا رہا،

تمہارا انتظار کروں گا،، اور اب وہ آئے گی یا نہیں . . . . یہ تھا وہ سوال جو جم رات بھر اپنے آپ سے کرتا رہا تھا۔ کروٹ بدل بدل کے، پچھلے لان میں ٹہل ٹہل کے جہاں اس کے ساتھ تنہائی اور بریا کے دکھ کا مارا ایک کونج بھی اسی طرح بے چینی سے ٹہلا کرتا تھا۔ جس دن سے اس کا ساتھی ہمت کر کے پچھلی دیوار پھاند گیا تھا۔ یہ دن رات بس ٹہلے جاتا جیسے حبسِ دوام کا کوئی قیدی، گلابی منہ، سفید اور کالے پر، سوکھی لکڑی کی سی پتلی پتلی ٹانگیں، سنبھل سنبھل کر رکھتے ہوئے وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگائے جاتا جیسے اپنے ساتھی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اس افسردہ پرندے نے اس کے دل کے بھائیں بھائیں کرتے سناٹے کو اور گہرا کر دیا۔ رات کی تاریکی اور تنہائی بے خوابی بن کر اس کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ مگر دراصل یہ سب ایک دن میں نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے پورے ایک سال کے تین سو پینسٹھ دنوں کا ہاتھ تھا اور کچھ اس کم بخت ماحول کا بھی۔ اگر کالج کے گرجے کے سائے میں اتنا زبردست سبزہ نہ ہوتا۔ اگر اس سپاٹ میدان میں وہ اکلوتا چیڑ کا درخت نہ جھکا ہوتا، اگر گھاس کے قطعوں میں یوں لبالب پانی نہ بھرا رہا کرتا اور سرخ برش کے سے پھول اس پہ نہ جھکے ہوتے۔ پرنسپل کے بنگلے میں سفید للی کے گملوں کی اس قدر بہتات نہ ہوتی۔ اس کے لمبے برآمدے میں یہ نیلی چقیں نہ ہوتیں، یہ سبز بنچیں نہ ہوتیں اور ان کے جھکے درختوں کے درمیان وہ اس کی کار کے پاس کھڑی اسے روک کر اپنی "مشکلات،، نہ پوچھا کرتی تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

جب کوئی لڑکا اس سے کوئی بات پوچھنا چاہتا تو وہ کلاس کے بعد ٹھہر جاتا اور باقی لڑکے لڑکیوں کو جانے کی اجازت ہوتی۔ اس وقت جب وہ اپنے گلابی ناخنوں کے درمیان کوئی کتاب پکڑے برقعہ کی نقاب گرائے باہر نکلتی وہ اس کا سراپا ضرور دیکھتا اور سوچتا پیچھے سے اس کی کمر اتنی پتلی ہے کہ اس کے دونوں چوڑے چکلے ہاتھوں کے ملقے میں سما جائے۔ برقعہ کے تکون کی جھالر بھی عین کمر پہ پھڑ پھڑاتی رہتی ہے۔ برقعہ گھٹنے سے ذرا ہی نیچا ہے۔ اسی لئے اس کی سفید براق شلوار، رنگین چپلوں سے جھانکتے ہوئے سفید پیر اور گلابی ناخن کیسے اچھے

لگتے ہیں۔ گلابی نیل پالش، گلابی رنگ کی لمبی انگوٹھی، گھڑی کا گلابی پٹہ، یہ چیزیں کبھی تو زندہ رہنے کی شدید خواہش پیدا کرتی ہیں اور کبھی مر جانے کی۔ رنگ بدل بھی جاتے ہیں۔ مگر احساس وہی رہتا ہے۔ لمبے نگ والی انگوٹھی اور پٹے کا رنگ بدلتا ہے۔ ضرور قمیص کے رنگ کے ساتھ بدلتا ہوگا۔ چپل کا رنگ بھی بدل جاتا ہے۔ مگر پاؤں کے لمبے لمبے ناخون اور ہاتھ کے لمبے لمبے ناخون ہمیشہ گلابی رہتے ہیں۔ وہ کیسے ناخون ہیں۔ پتلی پتلی نازک انگلیوں کے لمبے ناخون، کتنی مرتبہ دل چاہا ہے کہ ان پتلی انگلیوں کو ہاتھ میں لے کر کیا کرے؟؟؟ ہاں کچھ دل چاہا ضرور ہے مگر پڑھانے میں اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ آدمی اپنی خواہشوں کا تجزیہ کرتا پھرے۔ انگوٹھی اور گھڑی کے پٹے کے رنگ سے اس کی قمیص کے رنگ کا بھی تو اندازہ لگانا ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ سے برابر برقع کو اس طرح تھامے رکھتی ہے کہ ناک اور ٹھوڑی کا حصہ چھپا رہے۔ اس کی آنکھیں بڑی نہیں ہیں۔ ترچھی ترچھی ہیں۔ آنکھوں میں دبیلے دار دھاریاں، زیتونی چہرے پر سیاہ بھنویں، نہ بے حد نیکھی نہ بہت سیدھی، سیاہ ہالے میں چھپے ہوئے چہرے میں بس یہی اس کی دید کا حصہ ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کی آنکھوں کے کونے میں عجیب خوبصورت چھوٹی چھوٹی جھریاں سی پڑتی ہیں اور اس کی آنکھوں میں موتی سے ٹوٹتے ہیں اور کالے برقعہ میں سے اس کی میٹھی جھرنے ایسی ہنسی گرتی ہے وہ ایک خاص ادا سے کھینچ کر ناک پر سے پھسلتے ہوئے برقعے کو دوبارہ اسی جگہ رکھ لیتی ہے اور اس کی لمبی لمبی انگلیاں گلابی ناخنوں سمیت اس کے ذہن میں کھب جاتی ہیں۔

چکر لگا لگا کر تھک جاتا تو اپنے بستر پر لیٹ جاتا اور لیٹے لیٹے تھک جاتا تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ صبح ہوئی تو روز کی طرح وہ تیار ہوا، ناشتہ کیا اور صوفہ پر بیٹھ کر پڑھنے لگا، پڑھتا گیا، سطریں نگلتا رہا۔ جس کا ایک لفظ بھی آنکھوں کی راہ اس کے ذہن میں نہ پہنچا۔

دروازہ پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ جم کے "کم اِن" کہنے پر وہ اندر آئی۔ اسی طرح کالے برقع میں لپٹی ہوئی سفید براق شلوار، گلابی انگوٹھی، گھڑی کا گلابی پٹہ اور گلابی چپل، وہ کچھ گھبراتی

ہوئی تھی مگر جھجک کو چھپاتے ہوئے وہ قطعی نارمل بننے کی کوشش کر رہی تھی جیسے آج کا دن دوسرے دنوں سے ذرا بھی مختلف نہ ہو۔ اس نے روز کی طرح اسے سلام کیا، اپنی مخصوص جگہ بیٹھ کر یہ پوچھنے کے بجائے کہ اسے کیوں بلایا ہے ایلیٹ کی "پروفراک" کھول لی جیسے وہ ایک بار اور سمجھنے کی فرمائش پہلے بھی کر چکی تھی۔ وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گیا جیسے ابھی اس کو پڑھانا شروع کر دے گا۔ مگر ایکا ایکی اس نے انگوٹھی والا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے حلق سے آواز یوں نکلی جیسے باغ میں ہوا سنسنا رہی ہو۔ "آئی لو یو... آئی لو یو..."

وہ خاموش بیٹھی رہی اور اسی سنسناتی ہوئی آواز میں جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔ اس نے ساری دنیا کی خاک چھانی تھی مگر وہ کبھی اس طرح دیوانہ نہیں ہوا۔ اس نے آکسفورڈ میں پڑھتے ہوئے کبھی لڑکیوں کو گھاس نہیں ڈالی۔ اس نے آسٹریلیا اور تھیلینڈ کی لڑکیوں کو بھی پڑھایا ہے اور سعودی عرب کی ان فیشن ایبل لڑکیوں کو بھی جو فراک پر منی چُغہ پہن کر اور فل میک اَپ کر کے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھیں اور جن کی زبان بھی وہ جانتا تھا۔ ان سب جگہوں کو چھوڑتے وقت اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا تھا۔ مگر اب... نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ آخر میں اس نے اپنی جھکی ہوئی پلکیں اُٹھا کر کہا "تم ہی مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔"

وہ کانپنے لگی، وہ رونے لگی۔ وہ اتنی روانی سے انگریزی نہیں بول سکتی تھی کہ فرفر اپنے گھر کے حالات اور دل کی واردات بتاتی چلی جاتی اور پھر اس وقت تو کیفیت ہی دوسری تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا "میں کچھ نہیں کہہ سکتی، میں مجبور ہوں۔"

"کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے،" جم نے اسی سرگوشیانہ لہجے میں کہا "میں کسی کام کا نہیں رہا، میں کالج نہیں جا سکتا، میں پڑھا نہیں سکتا۔ تمہاری غیر موجودگی میں اس کلاس میں جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جہاں جاتے ہی سب سے پہلے تمہیں دیکھتا تھا۔ تمہاری انگوٹھی کو اور گھڑی کے پٹے کو اور یہ اندازہ کرتا تھا کہ آج تمہاری قمیص کا رنگ

کیا ہے" پھر وہ خاموش ہوگیا اور وہ بھی چپ رہی۔ اس کی نظریں کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ جم نہ جانے کدھر دیکھ رہا تھا۔ نامعلوم کتنا وقت گزر گیا۔ کے جگ بیت گئے۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ کب تک بیٹھی رہے گی۔ آخر اسے جانا ہے۔ جانا ہے اور ہمیشہ کے لئے۔ اب اس کمرے کی دہلیز پار کرنے کے بعد وہ دوبارہ یہاں نہ آسکے گی۔ اس نے خاموشی سے اپنی انگوٹھی اتار کر میز پر رکھ دی۔ پھر گھڑی کا پٹہ کھول کر اس کے نزدیک رکھ دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی "میں جا رہی ہوں" اس نے کہا۔

جم بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ آہستہ چلتا وہ اس کے نزدیک آیا اور اس کے برقع کے پہلے بٹن کو ہاتھ لگایا وہ بھڑک کر پیچھے ہٹی۔

"میں تمہیں ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں بغیر برقعے کے، ایک بار اور آخری بار..... اپنے تصور میں یہ تصویر سجانے کے لئے، اس احساس کے ساتھ کہ جس طرح میں نے تمہیں دیکھا ہے کسی اور مرد نے نہیں دیکھا۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنے برقع کے بٹن کھول دیئے۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ جو برقع اتارنے کے لئے مخصوص ہے اپنے برقع کا نچلا حصہ پلنگ پر ڈال دیا۔ پھر آہستہ سے اس نے اپنے سر کا بند کھولا اور برقع کا اوپری حصہ بھی اتار دیا۔ پھر وہ یوں لجا کر کھڑی ہوگئی جیسے کسی غیر مرد کے سامنے ننگی ہوگئی ہو۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ اس کی قمیض گلابی ہی تھی۔ اس کا دوپٹہ سفید تھا۔ اس کے بال بہت اونچے بنے ہوئے تھے جو ہمیشہ برقع میں چھپے رہتے تھے۔ اس کی ٹھوڑی بہت لمبی تھی وہ بھی ہمیشہ برقعے میں چھپی رہتی تھی..... وہ اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور یکایک اسے یہ احساس ہوا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ جسے اس نے اپنے دل میں سجا رکھا تھا، نہیں، یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ اس لڑکی کو اتنے اونچے بے ڈھنگے بالوں، اس لمبی نکونی ٹھوڑی اور اس سپاٹ سینہ سے کیا واسطہ۔ لپک کے اس نے پلنگ سے برقع اٹھایا اور اُسے پہنا دیا۔ پھر اوپر کا حصہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جسے اس نے اسی پُر اسرار طریقے سے

باندھ کر سر پر اوڑھ لیا اور اسی مخصوص انداز میں لمبی پتلی انگلیوں سے کھینچ کر اپنی ٹھوڑی چھپالی۔
اب اس کے ماتھے پر دو کالی محرابیں رہ گئیں، ایک ننھی سی ناک اور بولتی ہوئی ترچھی آنکھیں
...... جم نے گھڑی کا پیٹ اٹھا کر اس کی کلائی پر باندھ دیا اور انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا
دی۔ پھر اس نے ایک اور عجیب حرکت کی۔ اس کے سر سے نقاب گرا کر نقاب کے اوپر سے
اس کی پیشانی چومی اور کہا "گاڈ بلیس یو۔"

"خدا حافظ" اس نے کہا اور برقع کی نقاب کے پیچھے چھم چھم آنسو بہاتی کمرے سے نکل گئی۔

کالج کے بعد چپڑاسی پرنسپل کا رقعہ لے کر جم کے پاس آیا۔ جس میں لکھا تھا "مجھے افسوس
سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کل تم بہت غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہو۔ مانا کہ تم ہمارے تنخواہ دار
ملازم نہیں ہو۔ مگر ہمارے تمہارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ اپنی جگہ قائم ہے اور ہم نے
کوئی ایسی بات نہیں کی جو تمہیں اس سلوک پر اکسائے۔ براہِ کرم اپنے اس رویّے کا خاطر خواہ
جواز پیش کرو۔"

مگر اس رقعہ کو وصول کرنے والا مع سارے سامان کے جا چکا تھا۔ مالی نے بتایا وہ جاتے
جاتے پچھلے لان سے کوچ کو بھی اپنی بغل میں دبا کر لے گیا۔

دوزخ کا ایندھن

بہت سے سروے کر لینے کے بعد اب مجھے سروے کرنے کا ایک خاص ڈھب آگیا ہے، یعنی میں جانتا ہوں کہ فیشن ایبل علاقوں کے ان در بستہ گھروں کی بیگمات تک کسی ایسے گھر میں سروے کے لئے جانا جہاں چوبیس گھنٹے باہر دربانوں کا اور اندر کتوں کا پہرہ رہتا ہے اور یہ کہ کسی ایسے گھر میں سروے کے لئے جانا جہاں کسی دعوت کا انتظام ہو، شامیانے لگائے جا رہے ہوں یا برتن کھڑک رہے ہوں اپنی شامت کو دعوت دینا ہے مجھے خوب معلوم ہے کہ کن کن علاقوں میں لوگ اپنی آمدنی جلد اور عمر دیر سے بتاتے ہیں۔ کونسی بستیاں ہیں، جہاں ہر سروے کرنے والے کو فیملی پلاننگ سے وابستہ سمجھا جاتا ہے اور لوگ اپنی عمر بتاتے ہوئے اتنا نہیں ہچکچاتے جتنا بچوں کی تعداد اور آمدنی بتاتے ہوئے گھبراتے ہیں کس قسم کے لوگ ہمارے سوال نامے کو نظر انداز کر کے یہ جاننے کی پھیر میں رہتے ہیں کہ آخر ہمیں یہ معلوم کر کے کہ ایک گدھے کی ہتھیلی پر کتنی مکھیاں بیٹھتی ہیں یا چھلنی میں کتنے سوراخ ہوتے ہیں، کے رکعت کا ثواب ہوگا۔ ہم انہیں لاکھ سمجھاتے ہیں کہ بھئی سروے سراسر ترقی یافتہ ہونے کی دلیل ہے جس ملک میں بات بات پر سروے اور سیمینار ہوتے ہیں اس کی ترقی میں کوئی کافر بھی ننک نہیں کر سکتا، مگر یہ تمام باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم حتی الامکان ایسے لوگوں سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب ان دنوں جو سروے ہم کر رہے تھے وہ یہ معلوم کرنے کے لئے تھا کہ ملک میں مرغی کھانے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ ہمارے ملک میں مرغی کا شمار مہنگے بلکہ بہت مہنگے کھانے میں ہوتا ہے۔ تقریباً بیس روپے کی ایک مرغی ملتی ہے، جس میں ایک بڑا کنبہ بمشکل

ایک وقت کا کھانا کھا سکتا ہے اس لئے یہ دعوتوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ اگر کسی
دعوت میں مرغی ہے تو وہ اصل دعوت ہے ورنہ بس چل چلاؤ ہے مگر ایسے بھی گھر ہوں
گے جہاں بغیر دعوتوں کے مرغی کھائی جاتی ہوگی، ایسے گھروں کی تعداد کتنی ہے؟ یہی تو ہمیں
معلوم کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو، ہم نے ایسے علاقے کا رُخ کیا جہاں ہمارے خیال میں ہر
دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے گھروں میں دن رات مرغی
ہی کھائی جاتی ہوگی۔ مگر ہمیں سخت ناامیدی ہوئی جب اس علاقے میں بھی ایسے گھر کم نکلے
جہاں روز مرغی پکتی ہو، انہوں نے اقرار کیا کہ گوشت کے ناغے سے بھی انہیں کوئی فرق نہیں
پڑتا کیونکہ گوشت اُن کے ہاں ریفریجریٹرز کے سرد خانوں میں بھرا رہتا ہے۔ وقت بے وقت
کے لئے مرغی بھی رہتی ہے اور بے وقت سے اُن کی مراد بن بلائے مہمانوں سے تھی۔

سخت نااُمیدی کے عالم میں ہم نے سوچا کہ اب دوسرے علاقوں کا رُخ کیا جائے۔
یا نہیں۔ کیونکہ غربت زدہ علاقوں کے سروے کے بعد ظاہر ہے کہ یہ اوسط کم ہی ہوتی جائے
گی۔ ممکن ہے یہ تعداد کم ہوتے ہوتے ہزار دو ہزار میں ایک مرغی کھانے والا یا دس یا پچہزار
میں ایک مرغی خور رہ جائے۔ میرے ساتھی کا بھی خیال تھا کہ زیادہ دل بڑا کرنے کی ضرورت
نہیں، اب ہمیں سروے روک کر رپورٹ دے دینی چاہیئے، مگر میں نے رائے دی کہ کم از کم
ایک غریب علاقے کا دورہ کر لیا جائے اس کے بعد جب دھوپ تیز ہو جائے گی تو باقی
کا حساب کتاب آرام سے پنکھے کے نیچے بیٹھ کر کر لیں گے۔ آخر اللہ میاں نے عقل دی ہے
تو اسی لئے دی ہے کہ اسے کام میں لایا جائے اور جہاں تک ہماری عقل کام کرتی تھی یہ کوئی ایسا
مسئلہ نہ تھا کہ جس سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا ور جو ملک ناقابلِ تلافی
نقصانات کا بھی عادی ہو گیا ہو اس کے لئے مُرغی کھانے والوں کی صحیح تعداد کا معلوم نہ
ہو سکنا کوئی ایسا المیہ نہیں ہے جس کے لئے گرمی کی سڑی دوپہر میں لوگوں کو بے آرام
کیا جائے۔

چنانچہ سروے کرنے والوں کے حرج پر ایک ٹھنڈی بوتل پینے کے بعد ہم نے نجت آباد کے سروے کا فیصلہ کر لیا، جس وقت ہم ایک دکان کے آگے کھڑے کوکا کولا کی بوتلیں پی رہے تھے تو ہمارے سامنے کی دکان کے مختصر سے سائے میں کھڑا ایک آٹھ دس سالہ لڑکا ہماری طرف عجیب حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا تھا، اس کی پیاسی نظروں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اب ہمیں اس بات کا بھی سروے کرنا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں کتنے فیصد لوگ ٹھنڈی بوتلیں پیتے ہیں، میں نے لڑکے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

"تو نے آخری ٹھنڈی بوتل کب پی تھی؟" اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کہا۔

"ابھی تو نہیں پی۔"

"ابھی تک تو نے آخری ٹھنڈی بوتل نہیں پی، اچھا یہ بتا پہلی کب پی تھی؟"

"ابھی تک تو پہلی بھی نہیں پی۔"

"یعنی کبھی تو نے ۔۔۔۔ ٹھنڈی بوتل کو منہ نہیں لگایا، اپنی زندگی میں۔!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے تو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

"اوہ! اچھا لے، میری بوتل کو ہاتھ لگا لے۔ کم از کم قسم کھانے کو تو ہوگا"، مگر لڑکے نے بوتل کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ تب میں نے اپنی بوتل جو چوتھائی خالی ہو چکی تھی ایک بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد اُسے دے دی اور کہا "لے یہ پی لے اور کبھی کوئی سروے کرنے والا آئے اور پوچھے کہ تو نے کبھی ٹھنڈی بوتل پی ہے تو دیکھ انکار نہ کرنا، ورنہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔"

"ہاں۔" میرے ساتھی نے ایک جھاگ بھری ڈکار لے کر کہا "سن لے کہ جھوٹ بولنے والے کی بڑی سزا ہے۔"

"اب چلیں۔؟" میں نے کہا۔

"یار ذرا تو زلفوں کے سائے میں دم لو۔" میرا ساتھی گانے کا بہت شوقین ہے کوئی موقع گانا گانے اور آرام کرنے کا نہیں چھوڑتا، چنانچہ وہ زلفوں کے سائے تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ گانا گانے لگا اور دکان کے چھجے کے نیچے پڑی ہوئی دھوپ سے جلتی ہوئی چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔

وہ لڑکا ابھی تک خالی بوتل ہاتھ میں اتنے پیار سے لئے کھڑا تھا جیسے کوئی باپ بڑھاپے کی اکلوتی اولاد کو گود میں لئے کھڑا ہو۔

"ادھر لا بے!" دوکاندار لڑکے نے اسے جھڑک کر اس کے ہاتھ سے بوتل چھین لی، اس کی آنکھوں میں محرومی کا دکھ مجھ سے نہ دیکھا گیا، اور میں نے اُسے باتوں میں بہلانا چاہا۔

"یار کبھی مرغی بھی کھائی ہے؟" میں نے اس سے مذاق میں پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی منڈیا ہلا دی۔

"آخری مرغی کب کھائی تھی۔؟"

"کل۔"

"اور اب کب کھائے گا؟"

"آج۔"

"یار تو روز مرغی کھاتا ہے۔ا میں نے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" لڑکے نے پُراعتماد لہجہ میں جواب دیا۔

"جھوٹ بولنے والا دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا۔" میرے ساتھی نے گانا چھوڑ کر کہا جیسے ریڈیو پر فلمی گانا روک کر ضروری اعلان کیا جاتا ہے اور دوبارہ گانا شروع کر دیا۔

"یار ذرا گپ کم کرو۔" میں نے لڑکے سے کہا۔

"خدا کی قسم ہمارے ہاں روز مرغی پکتی ہے۔" میں نے ایک بار پھر اُسے سر سے

پیر تک دیکھا۔

"چل بے..... روز مرغی کھانے والوں کی یہی شکل ہوتی ہے۔" دوکاندار لونڈے نے پیلے بڑے بڑے دانت نکال کر کہا۔

"عزیز ٹھہرو..... سروے کا تقاضہ ہے اور انصاف کا بھی کہ اس کی پوری بات دھیان سے سُنی جائے۔ ہاں تو لڑکے تیرے ہاں جو روز مرغی پکتی ہے وہ کہاں سے آتی ہے؟"

"ماں لاتی ہے"

"ماں کس جگہ کام کرتی ہے؟"

"کہیں نہیں۔"

تب بات کچھ میری سمجھ میں آنے لگی، اس کی ماں کہیں کام نہیں کرتی اور روز مرغی لاتی ہے تو ضرور دال میں کالا ہے، میرے رومانی خیالات کو میرے ساتھی نے جھٹ توڑ دیا۔

"کیا چوری کر کے لاتی ہے؟" اس نے اکھڑ پن سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو پھر کہاں سے لاتی ہے؟"

"ایک جگہ سے۔"

"مفت۔؟"

"ہاں مفت۔"

"جھوٹ بولتا ہے" میرے ساتھی نے قطعیت سے کہا۔

"نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔" لڑکے نے اصرار کیا۔

"تجھے پتہ ہے وہ کہاں سے لاتی ہے؟"

"ہاں۔"

"ہمیں بتائے گا؟"

لڑکے نے ہمیں بے یقینی سے دیکھا جیسے ہم اس کا بھانڈا پھوڑ دیں گے یا پھر خود بھی اسی جگہ سے مرغی لے جانا شروع کر دیں گے۔

"میں کیا کہہ رہا تھا کہ جھوٹ بولتا ہے اب کیسی میا ماری گئی۔"

"اچھا آؤ بتاتا ہوں۔" لڑکے نے جیسے چیلنج قبول کر لیا "دور سے دیکھ لینا۔"

میں جھٹ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

"تجسس میں بلّی ماری جاتی ہے بھیا۔" میرے ساتھی نے ہانک لگائی۔

"پڑا رہ کچھ دیر اور یہ بھی تو سروے ہی ہے۔ اتنی دیر بعد تو ایک مرغی کھانے والا ملا ہے۔"

"چلو پھر میں بھی چلتا ہوں۔" وہ جلدی کھاٹ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لڑکا آگے آگے ہم پیچھے پیچھے چلے۔ وہ تجارتی علاقے کی ایک گلی میں مڑ گیا۔ یوں تو کراچی میں جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں۔ ایسے علاقوں میں بھی جہاں دیوار کے ایک طرف قالین ایسا سبزہ، بوتل پام اور جھومتی بوگن ولا اور سانوری بیل کے سائے ہیں دیوار کے دوسری طرف ناقابل بیان اور ناقابلِ یقین حد تک گندگی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ مگر یہ گلی کچھ ایسی سڑ رہی تھی کہ ناک نہ دی جاتی تھی، مختلف نوعیت کے کوڑوں کے انبار میں ایک جگہ مرغی کے پروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، جنہیں ایک عورت موتیوں کی طرح رول رہی تھی۔ ان میں سے وہ کلیجی رنگ کے چھوٹے چھیچھڑے سے نکال کر پولی تھین کے ایک تھیلے میں ڈالتی جا رہی تھی۔

"کیا کرو گی ان کا؟" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کن کا؟" اس نے بڑی بڑی یرقانی آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"یہ جو تم نکال رہی ہو۔"

"پکائیں گے اور کیا کریں گے۔" اس کے لہجہ میں ایسی کاٹ تھی کہ بیان سے باہر۔ کلیجی رنگ کے وہ چھچھڑے جو وہ پروں میں سے کھینچ کھینچ کر نکال رہی تھی پکا کر کھانے کے لئے ہیں، میرا دماغ چکرا گیا۔

"چلو بھاگو یہاں سے، میرا جی متلا رہا ہے،" میرے ساتھی نے ابکائی لی۔

ہمارا راہبر لڑکا کوڑے کے ڈھیر کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ "یہ میری ماں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو یہ مرغی تمہارے ہاں روز پکتی ہے،" میرا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا جیسے اس گلی کے سارے کوڑے اور تعفن کا ذمہ دار وہی ہو۔

"ہاں ——!" اس نے بے حد سادگی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی کہ ہمیں اس کی بات ماننے میں تامل کیوں ہے؟

"کم بخت! یہ مرغی ——!" میرا ساتھی چلّا کر بولا "میں نے کہا تھا کہ جھوٹ بولنے والے قیامت کے دن دوزخ میں ایندھن کی طرح جھونکے جائیں گے۔"

"تو میں کب جھوٹ بولا ہوں۔" لڑکے نے معصومیت سے کہا۔

"ارے خدا سے ڈر ...... مرغی کے ......!" میرے ساتھی نے چلتے چلتے ایک دھپ اس لڑکے کی گردن پر دیا۔ لڑکے نے اپنی ماں کی سی بڑی بڑی زرد آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور گردن سہلاتے ہوئے بولا۔

"ایک ٹیڈی پیسہ بابو جی ——!" جیسے اپنے مار کھانے کا معاوضہ مانگ رہا ہو۔

"چل بے۔ ایک ٹیڈی پیسے میں ٹھنڈی بوتل نہیں آتی ...... اور تو تو روز مرغی کھانے والوں میں سے ہے تجھے پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔"

ہم نے ایک رکشہ پکڑی۔

"بکمبت آباد—" میں نے کہا۔

"یار اب گھر چلو، بھوک لگ رہی ہے۔ دھوپ بھی تیز ہوگئی۔ لوگ اس وقت مرغی کی بات کرنے کے بجائے ہمیں کھانے کو دوڑیں گے۔"

"اچھا کل سہی..... رکشہ موڑلو بھئی۔" میں نے کہا۔
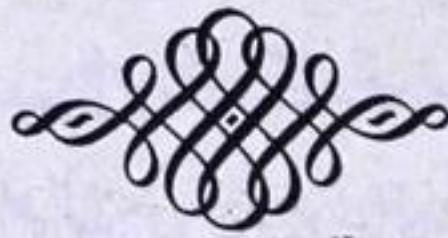
تیرھواں آدمی

یقین آنے والی بات نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے میں اس شہر گمنام کی بسوں میں ایک آدمی بھی کھڑا نہ ہوتا تھا۔ سب بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ مسافروں میں کبھی دنگا فساد نہ ہوا تھا۔ مسافروں اور کنڈکٹر میں کبھی تو تو میں میں نہ ہوئی تھی۔ مسافروں، ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کا رشتہ ایسا تھا جیسا کہ ایک اچھے شہر میں شہریوں کا ہونا چاہیے۔

مگر پھر یہ ہوا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے اس شہر میں رفتہ رفتہ بسیں کم ہوتی گئیں، مسافر بڑھنے لگے اور سواریوں کی کمی کا مسئلہ شروع ہوا۔ لوگ دفتروں سے دس پندرہ منٹ لیٹ ہونے لگے تو تشویش کا آغاز ہوا۔ شہریوں کی زبانوں پر عام شکایات، اخباروں میں خطوط اور محکمے کے نام آنے والی عرضیوں کے بعد ایک بلند سطح کی کانفرنس بٹھائی گئی جس میں بسوں کی کمی اور مسافروں کی تکالیف کا مسئلہ سامنے لایا گیا۔ عام خیال تھا کہ ضرورت واقعی ہے، مسئلہ سنگین ہے اور اس کا فوری حل ہر حال میں دریافت ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کئی سو بسوں کی درآمد کی تجویز فوری طور پر منظور ہونے ہی والی تھی کہ ایک ماہر حسابیات جو آدھے زمین سے اوپر اور آدھے اندر تھے، بول اٹھے۔

"صاحب! اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔"

"فرمائیے۔" صاحبِ صدر نے کہا۔

"جناب والا! حساب کی رو سے اتنے لوگ بسوں میں سفر کرتے ہیں اور بسیں اتنی ہیں۔ چنانچہ اگر ہر بس میں فقط آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی جائے تو بات بن سکتی ہے۔ ہر پندرہ منٹ بعد ایک بس چلتی ہے اور ہر بس میں آٹھ آدمی زیادہ سفر کر

سکتے ہیں تو حساب کی رو سے کوئی بھی آدمی بس سٹینڈ پر انتظار نہ کرے گا اور اس طرح ہمارا زرمبادلہ... قیمتی زرمبادلہ جو کسی پیداواری قوت میں اضافہ کرنے والی مشین پر خرچ کیا جا سکتا ہے بچ جائے گا۔ یہ میری چھوٹی سی ذاتی رائے ہے۔"

"واہ، واہ، تو آپ پہلے کیوں نہ بولے۔ اس میں تو کچھ جان نظر آتی ہے۔" صاحبِ کرسی نے کہا۔

ہر ایسی تجویز جس میں زرمبادلہ بچتا یا صرف اس کی ذات پر خرچ ہوتا ہو حکومت کے ہر افسر کو بڑی جاندار نظر آتی ہے۔ جب اس تجویز کو دوبارہ صاحبِ کرسی نے اپنے الفاظ میں کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو جن لوگوں کو پہلے یہ مردہ نظر آتی تھی انہیں بھی اس میں جان پڑتی نظر آئی اور تھوڑی ہی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد مردہ زندہ ہو گیا۔

سب نے اس تجویز پر صاد کر دیا۔ زرمبادلہ کی بچت کی فوری خوشی میں بھاری چائے پی گئی اور ضروری کارروائی کے بعد یہ حکمنامہ جاری کر دیا گیا کہ بحکمِ سرکار شہر گمنام کی ہر بس میں آٹھ آدمیوں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ کنڈکٹر کا فرض ہے کہ وہ آٹھ سے زیادہ آدمی بس میں کھڑے نہ ہونے دے کہ وہ امنِ عامہ کے لئے خطرہ اور حادثے کا سبب ہو سکتے ہیں۔

دوسرا دن وہ پہلا تاریخی دن تھا جس میں شہرِ گمنام میں لوگ بسوں میں کھڑے ہوئے اور جب بھی کنڈکٹر نے گنا وہ آٹھ سے زیادہ تھے۔ نو... دس... گیارہ یا بارہ۔ اور جب کنڈکٹر نے آخری آدمی سے اترنے کی درخواست کی تو کوئی بھی نہ اُترا۔ کسی نے کہا کہ وہ پہلے چڑھا تھا آخری آدمی کوئی اور تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ بوڑھا اور کمزور ہے اس لئے اسے پہلے جانے دینے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ نوجوان نے جواب میں کہا تو کیا وہ اپنی جوانی کی سزا بھگتے اور بس سٹینڈ پر کھڑا کھڑا بوڑھا ہو جائے۔ پہلے ہی دن آخری آدمی کی تلاش نہ ہو سکی نہ یہ طے پا سکا کہ کس عمر اور سائز کا بچہ آٹھواں آدمی شمار کیا

جا سکے گا۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب بوڑھوں نے جوانوں کے سر سے شفقت کا ہاتھ اٹھایا اور جوانوں کے دلوں میں بوڑھوں کا لحاظ ختم ہوا۔ مسافروں کی آنکھوں سے ایک دوسرے کی مروت اُٹھ گئی۔

اس دن تقریباً ہر اخبار میں بسوں میں کھڑے ہونے والوں کی تصویریں شائع ہوئیں۔ اور یہ خبر چھپی کہ شہر گمنام میں ہر جگہ آٹھ سے زیادہ آدمی کھڑے ہوئے جس پہ آپس میں جھگڑا ہوا۔ تب کانفرنس دوبارہ طلب کی گئی اور بڑے صاحب نے کہا کہ مسئلہ حل تو ہوا مگر پوری طرح حل نہیں ہوا۔ تب اس ماہر حسابیات نے کہ آدھا زمین کے اوپر اور آدھا زمین کے اندر تھا کہا۔

"آپ نے غور کیا کہ ہر جگہ کھڑے ہونے والوں کی تعداد گیارہ اور بارہ کے درمیان تھی۔ چار ہی مسافروں کی تو بات ہے۔ اگر ان چار مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی جائے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جائے۔"

چنانچہ دوسرے دن سے بارہ مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت دے دی گئی اور تا حال اس شہر گمنام میں ایک بس میں بارہ مسافروں کو کھڑے ہونے کی اجازت ہے۔ تیرھواں آدمی وہ آخری آدمی ہے جسے بس میں گھسنے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر اس کی تلاش آج تک نہ ہو سکی۔ تیرھواں آدمی قانوناً مجرم ہے اور کنڈکٹر کو حق ہے کہ گردن پکڑ کر اسے نیچے اتار دے مگر ہر شخص کہتا ہے کہ وہ تیرھواں آدمی نہیں ہے اور اب تو مدت ہوئی یہ پوچھنا اور دیکھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے کہ تیرھواں آدمی کبھی کوئی تھا بھی۔ بس میں جو آدمی مسافروں کی تعداد چیک کرنے آتا ہے اسے بس میں گھسنے تک کی جگہ نہیں ملتی اور ویسے بھی اب کھڑے ہونے والوں کی تعداد گن لینا آسان بات نہیں ہے۔ اس لئے چیکنگ کرنے والا باہر ہی سے لوٹ جاتا ہے۔ جیسے تیرھواں آدمی وہ خود ہی ہو۔

اپنا نذرانہ وہ باہر ہی سے لے لیتا ہے اور حکومت سے اس کی تنخواہ ماہ بماہ آج بھی مل رہی ہے۔ اب شہر گمنام میں نئی بسوں کی درآمد کا سوال کبھی نہیں اُٹھتا۔ جب اُٹھتا ہے یہی سوال اُٹھتا ہے کہ آیا مسافروں کو بس کی چھت، اس کے ریک، ونڈ اسکرین یا اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

مگر ایک شاخِ نہالِ غم

اُس دن مجھے پھر اس گھر میں انتظار کی بو پھیلی ہوئی لگی۔ گل دانوں میں تازہ پھول سجے ہوئے تھے۔ خالہ آئیں، ہمیشہ کی طرح سفید کپڑوں میں تھیں۔ مگر آج کے لباس میں کچھ زیادہ نفاست، کچھ زیادہ سفیدی، کچھ زیادہ رکھ رکھاؤ تھا۔

یونہی آزمانے کے لئے میں نے باورچی سے پوچھا۔ آج کیا پکایا ہے اس نے جن چیزوں کے نام بتائے اس سے میرا شبہ یقین میں بدل گیا اور پھر آج میٹھی چیز بھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آج کوئی آرہا ہے؟"

"نہیں جی کوئی نہیں۔" اس نے اپنے ازلی احمقانہ پن سے جواب دیا اور میں نے سوچا کیا واقعی اس نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ جس دن گلدانوں میں تازہ پھول سجے ہوں، جس دن خالہ کے کپڑوں میں زیادہ سفیدی اور نفاست ہو اور جس دن کھانے میں کئی چیزوں کے ساتھ میٹھا بھی ہو تو اس دن کوئی آتا ہے۔

"کیا کوئی آرہا ہے جی؟"

اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"بی بی جی نے تو مجھے نہیں بتایا"

ارے احمق! میں نے دل میں کہا۔ بی بی جی نے زبان سے نہیں بتایا، تو کیا ان کا رُواں رُواں نہیں بتا رہا۔ ان کی ڈھلی ہوئی جلد کی شفاف سفیدی، ان کی بڑی بڑی آنکھوں کی اُداسی میں ایک انتظاریہ کیفیت، دروازے پر لگی ہوئی ان کی نگاہیں اور بار بار باغ

کے پھیرے، کیا یہ بھی تجھے کچھ نہیں بتا رہے۔ بعضے لوگ بغیر کچھ دیکھے بھالے کیسے مزے سے زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ دل میں کانٹے تو ہم جیسے لوگوں کے کھٹکتے رہتے ہیں" آج یا کل میں کوئی خط یا تار آیا ــــ؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں تو، کیسا تار؟ خط وط بی بی جی کے پاس آتے ہی کون سے ہیں، یہی کوئی بل وِل آجاتے ہیں۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور میں پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ ٹیلیفون گھر میں نہیں تھا، کیونکہ خالہ کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ خط یا تار بھی نہیں آیا ... تو پھر کیا مہینے کا کوئی خاص دن کوئی خاص تاریخ۔ مگر نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ تو پھر آخر خالہ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ کیا واقعی پتہ چل جاتا ہے ؟؟؟

دوپہر کے کھانے تک خالہ بڑی بے چین سی رہیں میں جان بوجھ کر کہیں نہیں گیا آج فرصت سے بہت سی باتیں سوچتا رہا۔ خالہ کی عمر بھلا کتنی ہوگی۔ بہت حساب کتاب کے بعد طے ہوا، کہ پچاس سے تو ہر حالت میں اوپر ہی ہوگی، ساٹھ بھی ہو سکتی ہے یا پچاس ساٹھ کے درمیان کسی بھی سیڑھی پہ ہلکی پھلکی سی، سوچتی ہوئی سی، خالہ کے نہ معلوم خالو جان سے کیسے تعلقات رہے ہوں گے۔ میں خالو جان کی زندگی میں یہاں کبھی نہیں آیا۔ یہ تو میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تو خالہ نے خود ہی اپنے گھر میں رہنے کی پیش کش کی۔ ظاہرہ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالو اور خالہ ایک دوسرے پر فدا نہ بھی ہوں تب بھی انہوں نے نارمل ازدواجی زندگی تو ضرور گزاری ہوگی۔ کیونکہ کبھی کوئی ایسی ویسی کہانی سننے میں نہیں آئی انکل مجیب خالو جان کی زندگی میں بھی ضرور آتے ہوں گے، ان سے تو بڑی پرانی دوستی تھی اس وقت خالہ کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ خدا ہی جانے۔ ہو سکتا ہے اس وقت وہ انکل مجیب سے اور انکل مجیب ان سے عشق نہ کرتے ہوں۔ ہو سکتا ہے اس وقت انہیں اندازہ نہ ہو کہ وہ انکل مجیب کو چاہتی ہیں اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہیں اب بھی اندازہ نہ ہو کہ وہ انکل مجیب کو چاہتی ہیں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے !!!

خالہ نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ تھکے ہوئے قدموں سے اندر آئیں اور صوفے پر بیٹھ گئیں ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا شاید کوئی باہر دے کر گیا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ باورچی خانے میں چلی گئیں مگر جیسے ہی کھانا میز پر رکھا گیا انہوں نے مجھ سے کہا "نجم بیٹے تم کھانا کھاؤ، میری طبیعت ٹھیک نہیں میں اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ صوفے پر وہی پرچہ پڑا ہے جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا....

"آج میں اچانک آیا تھا۔ ضرور رکتا مگر فوراً واپس جانا پڑ گیا۔ سوچا تمہیں اطلاع تو دے دوں شاید کسی اور سے پتہ چلے اور تم سوچو کہ بغیر ملے چلا گیا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" مجیب!

تو انکل مجیب دراصل لاہور سے آئے اور خالہ سے بغیر ملے چلے گئے۔ خالہ نے جو اتنے اہتمام سے کھانا پکوایا تھا ان کے بغیر زہر مار نہ کر سکیں اور غالباً ویلیم کھا کر سو گئیں۔ مگر سوال پھر وہی ہے کہ خالہ کو کیسے پتہ چلا تھا کہ وہ آئیں گے جب کہ انہوں نے پرچے میں خود لکھا تھا کہ ان کا پروگرام اچانک بنا اور یہ اسی دفعہ کی بات نہیں تھی۔ سینکڑوں مرتبہ میں نے دیکھا تھا کہ جب گھر میں انتظار کی بو پھیلی ہوئی ہوتی تو اچانک باغ کا دروازہ کھلتا اور انکل مجیب مسکراتے ہوئے داخل ہوتے۔

"ارے انکل آپ کب آئے؟"

"کب کیا معنی! ابھی تو ایئر پورٹ سے چلا آ رہا ہوں۔"

جوانی کے کتنے ہی عشق دیکھے ہوں مگر بڑھاپے کا عشق مَیں نے ایک ہی دیکھا تھا اور اسی عشق دیکھنے نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ انکل مجیب خالہ سے بڑے ہی ہوں گے۔ خالہ سے انہیں کب سے عشق تھا میں نہیں کہہ سکتا۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتے ہوں اور میرے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلتا اگر میں اس گھر میں آ کر نہ رہا ہوتا اور اس دن

میں نے خالہ کو قالین پر ان کے قدموں سے چند فٹ کے فاصلے پر یوں بیٹھے نہ دیکھا ہوتا جیسے وہ کسی دیوتا کے چرنوں میں بیٹھی ہوں۔ انکل صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں بھی صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے خالہ آئیں اور قالین پر بیٹھ گئیں ہم دونوں نے دیکھا کہ وہ قالین کے اوپر سے فرضی پھول سمیٹتی جا رہی ہیں اور ان کو غیر شعوری طور پر یوں اچھال رہی ہیں کہ اگر وہ سچ مچ کے ہوتے تو انکل مجیب کے پیروں پر پڑتے جاتے وہ انکل مجیب کو مجھ سے باتیں کرتے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے پلک جھپکنا بھول گئی ہوں۔ جب ہماری گفتگو طویل ہو گئی تو انہوں نے کھسک کر دوسرے صوفے سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں اب انکل مجیب نے جس طرح باتیں کرتے کرتے ان کی طرف دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آگ آج کی نہیں پرانی ہے۔ اتنی پرانی کہ اب اس کے بھڑکنے اور ان دونوں کو جلا کر خاکستر کر دینے کا بھی کوئی ڈر نہیں۔ شاید وہ نور بن چکی ہے یا راکھ ہو چکی ہے۔ ممکن ہے چنگاریاں رہ گئی ہوں۔ مگر میں تو دیکھنا چاہتا تھا کہ محبت کی آگ کیا واقعی نور بن سکتی ہے جس میں چھپی ہوئی چنگاریاں کسی کا ہاتھ نہ جلائیں کسی کے پاؤں نہ پھونکیں . . . . اور اب جب انکل مجیب آتے۔ چھپ چھپ کر دونوں کو دیکھا کرتا۔

میں جوان تھا اور افلاطونی محبت میں قطعی یقین نہیں رکھتا تھا۔ لمس بغیر کوئی محبت پنپ نہیں سکتی۔ میں یہ بات سینکڑوں مرتبہ دعوے سے کہہ چکا تھا اور اب چاہتا تھا۔ بلکہ بڑی شدت آس لگاتے تھا کہ کسی لمحے بوڑھے انکل کو بوڑھی خالہ کی گردن میں بانہیں ڈال کر اپنے سے نزدیک کرتے دیکھ لوں۔ شاید کوئی لمحہ آئے جب وہ بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیں شاید کوئی بے پناہ لہر اٹھے جب خالہ ہی ان کے پیر پکڑ کر آنسوؤں کے گہر نچھاور کر دیں۔ مگر چھپ چھپ کر جو میں نے دیکھا اس سے میں حیرت میں ڈوب گیا۔ تنہائی میں وہ اپنی نگاہوں کو بھی ایک دوسرے کے لمس سے بچاتے تھے۔ انکل بات کرتے تو خالہ کسی اور طرف دیکھ رہی ہوتیں۔ خالہ بات کرتیں تو انکل کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔

اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتے تھے اور کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کرتے تھے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو بے انداز چاہتے ہیں۔ اتنا کہ ان کے لئے ایک دوسرے کی قربت ہی لمس ہے۔ اس کے بعد نہ کسی لمس کی ضرورت ہے نہ گفتگو کی نہ نگاہوں کے تبادلے کی ان سب کی ضرورت تو تب ہوتی ہے جب اپنا پیار جتانا مقصود ہو اور یہاں تو مقصد چھپانا تھا جب کبھی میں نے ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی وہ بے معنی، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی عام سی باتیں نکلیں۔ انہیں اتنا بھی سلیقہ نہ تھا۔ کہ ماضی کی کہانیاں ہی دہرا لیتے۔ ہاں کبھی کبھی دونوں پرانے گانے سننے ضرور بیٹھ جاتے تھے۔ شاید اس لئے کہ باتوں کا ذخیرہ تو تھا ہی نہیں اور بہر حال ایک، دوسرے کی موجودگی میں کچھ تو کیا جائے۔

اور جب انکل کہتے۔ "اچھا بھئی میں چلا"، تو خالہ کی نظروں میں خلا سا آجاتا۔ مگر زبان سے وہ کچھ نہ کہتیں۔ جیسے وہ ظاہر کرتیں کہ شوہر کے پرانے دوست ہی تو ہیں۔ آ گئے تو خوشی نہیں، چلے گئے تو ملال نہیں، مگر آنے کی خوشی اور جانے کا ملال ان کی رگ رگ میں، نس نس میں بسا ہوتا تھا جب مجھے اندازہ ہو جاتا تھا، تو انہیں کیسے نہ ہوتا ہوگا۔

اور پھر یہ ہوا کہ ان کا عشق مجھے گھلانے لگا میں اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ یا الٰہی یہ کیسا عشق ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کا آغاز کیا تھا۔ کیا ان دونوں کے لئے کوئی اماں نہیں ہے۔ کیا یہ اسی طرح فراق میں تڑپتے رہیں گے؟ کیا اس عمر میں فراق میں تڑپ نہیں ہوتی۔ اگر نہیں تو جدائی کے لمحے میں انکل کا چہرہ زرد کیوں ہو جاتا ہے اور خالہ ایک دم سفید کیوں پڑ جاتی ہیں۔ کیا کبھی ایک دوسرے سے دل کی بات نہیں کہیں گے۔ تو ان کے کلیجے پھٹ نہیں جائیں گے۔ کیا یہ قیامت تک اس درد کو چھپائیں گے یا کبھی کوئی ایسا وقت آئے گا جب انکل مجیب اقرارِ محبت کریں گے۔ میں اس اقرار کے مختلف سین اپنے ذہن کے پردے پر اسٹیج کرنے کا عجیب و غریب کھیل کھیلنے لگا۔ ایک دن چھڑی کی نوک سے گلاب کے ایک پودے کو کریدتے ہوئے انکل مجیب کہتے ہیں:

"سلمیٰ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت برسوں سے!"

"مجھے معلوم ہے"، خالہ دھیرج سے کہتی ہیں اور پھر گلاب کی ایک کلی توڑ کر انکل کے کوٹ میں لگا دیتی ہیں۔ مگر نہیں یہ سین کچھ جچا نہیں۔ جب تک جذبات میں تندی نہیں ہوگی۔ وہ کھلیں گے کیونکر — میں اس میں "پیشن" کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"سلمیٰ!! اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"کیا ہوا مجیب؟ خیر تو ہے —؟"

"تم کب تک بنتی رہو گی، تم خوب جانتی ہو!"

"کیا .... نہیں، میں تو نہیں جانتی ... کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"خدا کی قسم کھا کر کہو کیا تم نہیں جانتیں کہ آج پچاس سال سے میں تم کو چاہتا ہوں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔" اور پھر وہ آگے بڑھتے ہیں۔ خالہ دو قدم پیچھے سرک جاتی ہیں۔

پھر یہ منظر بھی مجھے پسند نہیں آتا میں سوچتا ہوں، نہیں محبت کا اقرار اگر کبھی ہوگا تو خالہ کی طرف سے کمزور ہیں اور کئی دن سے میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت لاغر ہوگئی ہیں۔ کئی مرتبہ میں نے ان کے فیملی ڈاکٹر کو بھی اس گھر میں دیکھا ہے۔ شاید ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹے۔ وہ شخص مرد ہے، چٹان ہے، وہ اپنے مرحوم دوست کی بیوی سے کبھی اقرارِ محبت نہیں کرے گا۔ اور پھر سین کچھ یوں بنا۔ سردی کے دنوں میں خالہ قالین پر بیٹھی فرضی پھول سمیٹ رہی ہیں۔ کمرے میں ان دونوں کے پسندیدہ پرانے نغمے بج رہے ہیں ایک گانے پر خالہ کو جانے کیا یاد آیا کہ وہ اچانک رونے لگیں۔ انکل مجیب ان کے نزدیک کھسک کر انہیں تسلی دینے لگے اور پھر خالہ ان کی گود میں سر رکھ کر سسکیاں لینے لگیں اور کہنے لگیں۔

"بس مجیب، اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

اور پھر انکل مجیب نے ان کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور ان کے ہونٹوں

پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ہیں سب خواب دیکھتا رہا۔ مگر اصل میں وہ ہمیشہ اتنے ہی دور بیٹھے پرانے ریکارڈ سنتے رہے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا۔ انکل جیب زیادہ برداشت نہ کر پاتے تو اچانک کہہ اُٹھتے۔

"اچھا بھئی اب چلوں گا۔"

اور کبھی یہ کیفیت خالہ کے لئے ناقابلِ برداشت ہونے لگتی تو وہ فوراً کافی بنانے چل دیتیں۔ مجھے ان دونوں پر کبھی غصہ آتا، کبھی پیار آتا۔ کبھی جی چاہتا ان سے کہوں قاضی بلوا کر نکاح پڑھوا لو، کب تک اس آگ میں جلو گے۔ کبھی جی چاہتا ان دونوں کو کسی کشتی میں بٹھا کر سمندر میں غرقاب کر دوں کہ ایک ساتھ مر جائیں اور اس عذاب سے چھوٹ جائیں۔

ان کے عشق نے مجھے جوانی میں ایسا ڈرا دیا کہ محبت کے سارے ولولے مر کر رہ گئے محبت شراب ہے، محبت نشہ ہے، کوئی بھی تو نہیں میرے نزدیک محبت بوند بوند ٹپکتا زہر اور ایسا کرب ہے جس کا کوئی اختتام نہیں۔ جیسے کسی کو اذیت دے دے کر مارا جائے۔ مار مار کر زخموں پر مرہم رکھا جائے۔ امرت ٹپکایا جائے اور پھر مارا جائے۔ یا الٰہی مجھے ایسے عذاب سے بچا، میں دعائیں مانگنے لگا۔

خالہ جس دن صبح نہ اٹھیں اور مجھے بلوا بھیجا وہ ان کی زندگی کا آخری دن تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے دیکھا۔ خالہ کو جھوٹی تسلی دی اور مجھ سے کہا "میں انہیں خاصے دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو بالکل گھن کھائی لکڑی کی طرح ہیں، بس اب ان کا وقت آ گیا ہے۔ آج گئیں تو آج گئیں ورنہ کل، یا بہت ہوا تو پرسوں۔ بس انہیں آرام کرنے دیں۔ جان جتنی آسانی سے نکل جائے اچھا ہے۔ خواہ مخواہ پریشان کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں بے چینی محسوس کریں تو یہ دوا دے دیں۔"

خالہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر میں نے انکل مجیب کو تار دے دیا۔ تار دے کر تار گھر سے سیدھا چلا آ رہا تھا کہ دیکھا باغ کا دروازہ کھول کر انکل مجیب اندر داخل ہو رہے ہیں۔

" انکل آپ کیسے ؟"

" بس اچانک آنا ہو گیا" مگر آج وہ مسکرائے نہیں، کچھ پریشان سے تھے۔

" خالہ بہت بیمار ہیں۔" میں نے جلدی سے انہیں شاک کے لئے تیار کرنا چاہا وہ چونکے نہیں جیسے انہیں پہلے سے ہی اطلاع ہو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے ....." میری زبان لڑکھڑا گئی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کیا کہا ہے ڈاکٹر نے .... ؟"

" وہ کہتا ہے کہ وہ زیادہ دن نہیں جئیں گی۔"

تب انہوں نے نظریں جھکا لیں اور گھر میں داخل ہو گئے۔ خالہ نے انہیں دیکھا تو ان کی آنکھوں میں زندگی کی لہر تو آئی۔ مگر حیرت کی نہیں جیسے انہیں معلوم ہوا نہیں تو آنا ہے وہ تو آ ہی گئے ہی۔ مجھ سے کسی نے کہا نہیں مگر میں نے از خود خالہ کے پسندیدہ ریکارڈ لگا دیئے۔ مجھے معلوم تھا یہ گانے انہیں سکون پہنچائیں گے پرانے گانے، بھجن، ستار اور کیا کیا کچھ۔ ایسے دھیمے دھیمے بجتے رہے جیسے کہیں من کے اندر سے کچھ آوازیں آ رہی ہوں۔

انکل مجیب اس وقت خالہ کے ساتھ اکیلے تھے۔ خالہ مر رہی تھیں اور میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ کیا آج انکل خالہ کو سینے سے نہیں لگائیں گے ۔۔ ان کے ہونٹوں پر نہیں تو ان کی پیشانی تک پیار نہیں کریں گے۔ ان کے انگ کو نہیں تو ان کی چھنگلی کی پور تک کو نہیں چھوئیں گے۔

آج سجن موہے انگ لگا لے جنم سپھل ہو جائے۔

ریکارڈ بج رہا تھا۔ یہ بھجن گیتا دت نے کیسی خوبصورتی سے گایا تھا۔ شاید خالہ کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ ان کی آنکھوں میں کیا تھا ؟ کیا وہ بھی یہی بات کہہ رہی تھیں یا تنبیہہ کر رہی تھیں کہ خبردار آخری وقت میں ہمارے عشق کی بے حرمتی نہ کرنا۔ اس کی لاج رکھنا۔ خدا ہی جانے وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر میں انکل مجیب کی جگہ ہوتا تو کم از کم آج خالہ کو سینے سے لگا کر اتنا تو بھینچ لیتا کہ ان کا اٹکا ہوا سانس آسانی سے نکل جاتا۔ انکل اتنا بھی نہ کر سکے کتنے کٹھور تھے

وہ!!! وہ قطرہ قطرہ مرتی رہیں۔ پہلے پیروں کی جان نکلی، پھر ٹانگوں کی۔ پھر آدھے دھڑ کی۔ پھر ان کا سانس سینے میں ایسا اٹکا کہ میں رو رو کر ان کے مرنے کی دعائیں مانگنے لگا مگر انکل مجیب ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے۔

پھر جب سانس بھی بند ہو گیا تب بھی ان کا دل دھڑکتا رہا اور آنکھیں کھلی رہیں۔ جانے وہ دھڑکتا دل اور زندہ آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں۔ اس وقت تک ڈاکٹر آچکا تھا۔ اس نے کہا وہ مر چکی ہیں۔ میں نے کہا۔

"ڈاکٹر! ان کا دل تو دھڑک رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی کچھ دیر اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا آدمی مرتا اس وقت ہے جب اس کا دل دھڑکنا بند کر دیتا ہے۔ پھر میں نے انکل مجیب سے کہا۔

"انکل ان کی آنکھیں تو بند کیجئے۔"

انہوں نے مجھے بے بسی سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "مجھے مجبور نہ کرو..... جس جسم کو جیتے جی نہ چھوا، اسے مرنے کے بعد کیوں گنہگار کرتے ہو۔"

انھوں نے دل پہ ہاتھ رکھا نہ آنکھوں پہ ــــ انہیں خالہ کے دل سے سروکار تھا۔ نہ آنکھوں سے، نہ ان کی زندگی سے نہ موت سے۔ تو پھر ان کی محبت کس قسم کی تھی۔ کس طور کی تھی۔ کیا وہ محبت تھی؟ کیا وہ عشق تھا۔؟ جی چاہتا تھا۔ انکل سے پوچھوں مگر میرا دل کہتا تھا۔ ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اگر وہ منع بھی کر۔ بس اگر وہ قسمیں بھی کھائیں۔ اگر وہ سچ مچ یہ سمجھتے ہوں کہ وہ سچی قسم کھا رہے ہیں۔ تب بھی کیا تم مان لو گے۔

اور جب خالہ کی موت کے چھ مہینے کے اندر اندر انکل مجیب کے انتقال کی خبر آئی تو میں نے ڈاکٹر کے سامنے حیرت کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔

"ان کی موت پر کیسا تعجب! تعجب کرنا ہے تو ان کی زندگی پر کرو۔ وہ تو ایک عرصے سے دل کے مریض تھے اور ایسے کہ میں تو مدت ہوئی ان سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ مگر خدا جانے ان کا دل کس چیز میں اٹکا ہوا تھا جو وہ اتنا جی لئے۔ ایسے دل کے ساتھ ایسی زبردست قوتِ ارادی میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔"

اور تب جو تھوڑا بہت شبہ میرے دل میں تھا وہ بھی جاتا رہا مجھے یقین ہو گیا کہ خالہ اور انکل حبیب ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے۔ خدا بڑھاپے کے عشق سے بچائے۔ واقعی اس میں کہیں پناہ نہیں شاید موت میں بھی نہیں۔

کالے کمرے میں مارے جانے والے لوگ

شام ابھی ابھی رات میں تبدیل ہوئی تھی۔ قبرستان اپنی ہی ہیبت سے سہما ہوا تھا۔ اور اس کی دیواریں ڈر کے مارے دبکی ہوئی تھیں۔ درختوں میں الٹی لٹکی ہوئی چمگادڑیں بھی خاموش، محض پر پھڑ پھڑانے پر اکتفا کر رہی تھیں۔ ایسے میں قبرستان کی دیوار کے پاس مجھے ایک قوی ہیکل سایہ نظر آیا اس کا قد لانبے درختوں تک پہنچا ہوا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اس سے خوف نہ آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکیں گے کہ آپ اتنے قدآور کیسے ہیں؟ معاف کیجئے، میں نے آج تک دیو، آسیبوں اور بھوتوں پر یقین نہیں کیا۔"

"دیو اور آسیب اور سارے مافوق الفطرت ہم ہی میں سے ہوتے ہیں۔" اُس نے جواب دیا۔

"ہم میں سے! ـــ اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"میرا مطلب ہے، انسانوں میں سے۔"

"کیا آپ انسان ہیں؟"

"ہم سب ایک زمانے میں انسان تھے۔"

"ہم سب! کیا یہاں کوئی اور بھی ہے؟ مجھے تو صرف آپ نظر آرہے ہیں۔"

"ہاں، آپ صرف مجھے دیکھ رہے ہیں، مگر میں ایک نہیں ہوں۔ ہم بہت سے ہیں۔ جنہوں نے ایک قالب میں اٹھنے کو پسند کیا ہے۔ مرنے کے بعد آپ کو انتخاب کا حق ہوتا ہے کہ آپ جس قالب میں چاہیں اُٹھیں۔ کچھ لوگ روحانی اور ماورائی قالب کا انتخاب

کرتے ہیں، کچھ لوگ دوبارہ جسمانی قلب میں آنا چاہتے ہیں، ہم سب نے ایک ہی قالب میں اُٹھنا پسند کیا ہے۔"

"آپ سب کون ہیں؟"

"ہم سب کالے کمرے میں مارے جانے والے لوگ ہیں"

"کالا کمرہ!۔۔۔ یہ کہاں تھا؟"

"یہ ہر جگہ ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں، کسی بھی عہد میں۔"

"وہاں کیا ہوتا ہے؟"

"گھُپ اندھیرا۔۔۔ وہاں کی ہر چیز کالی ہوتی ہے۔ کالی دیواریں، کالی چھت، کالے پردے، باہر سے روشنی کی رمق بھی اندر نہیں آتی اور اس اندھیرے گھُپ کالے کمرے میں آپ کے اندر کی تحفظ اور بچاؤ کی دیواریں آہستہ آہستہ گرنی شروع ہوتی ہیں۔ آپ کے اندر خوف سے بچنے کا جو اسلحہ ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے جیسے محاصرے میں گھرے ہوئے سپاہیوں کی گولیاں آخر کار ختم ہو جاتی ہیں۔ تب گھبراہٹ، پریشانی اور خوف و ہراس آپ کو گھیر لیتا ہے۔ اب کیا ہوگا! سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملتی، کیونکہ دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ وہ خوف و ہراس اور پریشانی اس بچے سے ملتی جلتی ہوتی ہے جس کو ماں کسی اکیلے کمرے میں سوتا چھوڑ کر چلی گئی ہو اور جب وہ جاگے تو کمرہ اندھیرا ہو۔ وہ بچہ یہ نہیں سوچتا کہ یہیں کہیں بجلی کا بٹن ہوگا جسے دبانے سے روشنی ہو سکتی ہے ـــــ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ پردہ ہٹا کر دیکھوں شاید باہر روشنیاں ہوں۔ ممکن ہے سورج نکلا ہوا ہو یا چاند ستارے ہوں۔ نہیں اس سے پیشتر کہ بجلی کا بٹن دبانے کا خیال اُس کے ذہن میں آئے یا پردہ اُٹھا کر باہر جھانکنے کا سوچے طرح طرح کے عفریت اسے نظر آنے لگتے ہیں جو اس کی طرف لپکنے لگتے ہیں اور اسے سوچنے کی مہلت نہیں دیتے۔

اسی طرح کالے کمرے میں اب تک کے سارے سوچے اور نہ سوچے، سُنے ہوئے اور نہ سُنے ہوئے جن، بھوت، چھل پایاں، چڑیلیں، چھلاوے۔ ڈریکولا اور شیر اور بھیڑیے آپ کی طرف لپکتے ہیں اور آپ کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ اس میں بُرے بھلے کی تمیز اور سوچنے سمجھنے کی طاقت نہیں رہتی ــ گویا ذہن کا اپنا سوئچ آف ہو جاتا ہے اور وہ بھی ایک کالے کمرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو وہ لوگ جنہوں نے آپ کو کالے کمرے میں ڈالا تھا "بریک ڈاؤن" کہتے ہیں۔

اس کے بعد آپ کے ذہن کے ٹیپ پر جو کچھ بھرا ہوا اسے صاف کر دیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ آپ کے ذہن میں اپنی سوچ ڈالتے ہیں۔ آپ کے ذہن کا ٹیپ صاف ہو چکا ہے اور اب جو کچھ بھرا جا رہا ہے آپ اسے من و عن قبول کرتے ہیں۔ کیا ہونا چاہیئے، کیوں ہونا چاہیئے، آپ کے لیے وہی سچ اور آخری سچ ہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ آپ نہیں جانتے کہ آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے مرحلے میں بھی آپ نہیں جانتے کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا کیونکہ اس وقت آپ باہوش تو ہوتے ہیں مگر باشعور نہیں ہوتے۔ صرف پہلے مرحلے ہی میں آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے اور جان لڑانے، اٹل ہو جانے، شکست دینے اور شکست نہ کھانے کا فیصلہ صرف اسی منزل پر ہوتا ہے بعد میں نہیں ــــ صرف سیاہ کمرہ جہاں جنگ کا پہلا حملہ ہوتا ہے تحفظ کی آخری پناہ ہے۔"

"آپ کے نزدیک بچاؤ کا طریقہ کیا ہے؟"

"سب سے پہلے آپ اپنے ذہن سے "سیاہی" کا خوف نکالیں۔ اندھیرا آپ کے نزدیک کچھ وہ سہی، سیاہی آپ کو بری لگتی ہے۔ برائیوں، ماتموں اور غموں کا تصور سیاہ رنگ سے وابستہ ہے مگر اپنے ذہن کو ہر وہم اور تعصب سے پاک رکھ کر یہ سوچنا ہے کہ سیاہی روشنی کے نہ ہونے کا احساس ہے اور کچھ نہیں ہے اگر آپ یہ سوچ لیں کہ

یہاں روشنی ہے تو وہ کالا کمرہ آپ کے لئے کالا نہیں رہے گا۔ انسان کے تصور اور تخیّل میں بے انتہا وسعت اور توانائی ہے۔ آپ قیاس کر لیجئے کہ آپ کے لئے یہ کمرہ سفید ہے، سبز ہے یا زرد ہے اس کے بعد آپ اس کے کمرے کو ذہن میں از سرِ نو تعمیر کیجئے اس طرح کہ وہ آپ کے ذہن سے نکل کر اصلیت بن جائے۔ سوچئے کہ اس کی دیواریں سفید ہیں۔ اس کی چھت سفید ہے۔ اس کے پردے سفید ہیں اور جب آپ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھیں گے تو کالا کمرہ اتنا کالا نہ ہوگا۔ اس میں سفیدی کی جھلک ضرور ہوگی ——

اس کے بعد آپ خود کو اس کمرے کے رنگ و روغن سے بالکل الگ کر لیجئے اور کچھ تعمیری باتیں سوچئے مثلاً جب آپ اس کمرے سے باہر نکل جائیں گے تو کیا کام کریں گے۔ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لائیے کہ آپ اس کمرے سے کبھی باہر نہ نکل سکیں گے۔ آپ سوچئے کہ جب آپ باہر نکلیں گے تو کیا کیا کریں گے —— کام ڈھیروں ہوں گے اور وقت کم ہوگا۔ آپ اپنے کاموں کی فہرستیں بناتے جائیے اور اپنے ذہن کے ٹیپ میں بھرتے جائیے۔ ذہن کو ان فہرستوں سے کئی کئی مرتبہ بھر لیجئے کہ ایک فہرست مٹ بھی جائے تو اندر سے اور فہرستیں نکل آئیں، پھر اور —— پھر اور ——

اس کے بعد اس بات پر غور کیجئے کہ اب جو وقت آپ کو ملا ہے۔ اس سفید، سبز یا زرد کمرے میں اس کو مستقبل کے منصوبوں کے ساتھ حال میں بھی کام میں لانا ہے حال میں بھی آپ جو کچھ کر سکتے ہیں بہتر سے بہتر طریقے سے کرتے رہیئے۔ وہ لوگ آن کر دیکھیں گے کہ آپ آنکھیں بند کئے ہاتھوں پر سر لٹکائے بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھیں گے آپ بس ٹوٹنے ہی والے ہیں، تڑاخ سے، جب کہ آپ اُس وقت ایک نہایت . . . . نہایت ہی اور تجنل پینٹنگ بنا رہے ہوں۔ آنکھوں کے بند سنہری چوکھٹے پر بہتر سے بہتر موٹے قلم اور بہتر سے بہتر رنگوں کے ساتھ ایسی شاہکار تصویر جو آج تک کسی نے نہیں بنائی۔ اسے محنت سے بنائیے، خوب سوچ سمجھ کے اور غور کر کے —— یاد رکھئے، اتنا وقت، اتنی فراغت جس میں کوئی مخل نہ ہو۔

آپ کو پھر کبھی میسّر نہیں آئے گی۔ ایک تصویر ختم ہو جائے تو اسے سنبھال کر ذہن کے ایک گوشے میں رکھ دیجئے اور دوسری شروع کر دیجئے۔ اسے بھی اتنی ہی احتیاط اور محنت سے بنائیے۔ جلدی نہ کیجیے۔ عُجلت کی ضرورت بھی نہیں، کسی طرف سے کوئی مداخلت نہیں، سوچیے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

اگر آپ کوئی نظم لکھنا چاہیں تو اس کے موضوع اور الفاظ پر غور کیجیے۔ ہر ہر مصرعے کو پرکھیئے۔ نہایت مناسب وقت ہے اور بے حد سکون کہ سوائے آپ کے کوئی اور آپ کے ساتھ نہیں ہے۔

یا پھر کوئی فلسفیانہ کتاب لکھ ڈالئے، خوب سوچ بچار کے اس کتاب کے باب تیار کرتے جائیے اور ذہن میں ایک طرف رکھتے جائیے۔ ان کو بار بار پڑھتے رہیئے تاکہ ذہن میں تازہ رہیں نظموں کو بھی دہراتے رہیئے، تصویروں کو بھی دیکھتے رہیئے مگر ان پر ہی قناعت نہ کیجیے۔ آگے بڑھتے رہیئے۔ کام کرتے رہیئے، اسی دلجمعی اور اسی اطمینان اور لگن کے ساتھ۔ جب تک کام کرتے رہیں گے کالا کمرہ کالا نہ ہوگا اور سارے جن، بھوت، چھل پائیاں، چھلاوے، ڈریکولا، بنیر اور بھیڑیے آپ سے دور رہیں گے۔ آپ ٹوٹیں گے نہیں، جب کہ وہ سمجھیں گے کہ آپ ٹوٹ چکے ہیں۔

اس وقت وہ آپ کو کالے کمرے سے باہر نکالیں گے اور آپ کی نازبرداری کریں گے۔ وہ آپ کو بیش از بیش متاثر کرنے کی کوشش کریں گے، آپ کو اچھی اچھی چیزیں دکھائیں گے۔ آپ کو اچھے اچھے تحفے دیں گے اور آپ کے خیر خواہ اور دوست بننے کی کوشش کریں گے۔ یہ آپ کے ذہن کی دُھلائی کا مرحلہ ہوگا۔ آپ یہی ظاہر کیجیے جیسے آپ ان کی باتوں سے اور ان کی دکھائی جانے والی چیزوں سے بہت متاثر ہو رہے ہیں۔ آپ انہیں دھوکے میں رکھیے۔

تیسرے مرحلے میں جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ آپ ان ہی میں سے ہیں، وہ

اپنے سارے نقاب اُتار دیں گے، اپنے سب راز کھول دیں گے، اپنی تمام سفاکیاں عیاں کر دیں گے اور آپ کو اپنے ہی لوگوں کو سولی چڑھانے کے کام پر لگائیں گے۔

اور یہ وقت ہو گا جب آپ انہیں آئینہ دکھا سکیں گے کہ وہ نہ آپ کے بہی خواہ تھے، نہ نیک تھے۔ ان کی نقابیں نوچ کر ان کے مکروہ چہرے دکھانے کی یہی گھڑی ہو گی۔ اس وقت وہ آپ کو دھوکا نہ دے سکیں گے اور دوسرے لوگ بھی آپ کی بات کا یقین کر لیں گے۔ وہ سب آپ کے طرفدار ہوں گے یہ ظالم لوگ اکیلے رہ جائیں گے اور کوئی ان کا ساتھی نہ ہو گا۔

اب آپ ان کو اپنی صفوں سے الگ کر دیں مگر ان کو کالے کمروں میں نہ ڈالیں۔ ان سے برابری کا سلوک کریں۔ ان کو چناؤ کا موقع دیں۔ انسان کے لئے دو راہوں میں سے کسی ایک پر اپنی مرضی سے چلنے کی خوشی بڑی خوشی ہوتی ہے۔ انہیں بند راہ پر جانے کا حق بھی دیں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی مرضی سے لوٹ کر کھلی راہ پر، آگے جانے والی راہ پر آئیں اور آپ کے احسان مند ہوں کہ آپ نے ان پر کوئی بھی راہ بند نہ کی۔ آپ کا نصب العین کالے کمرے نہیں کھلی راہیں ہونی چاہیئں۔

"آپ نے یہ سب نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں — پہلے ہی مرحلے میں ہم نے غلط فیصلہ کیا۔ ہم نے سوچا ٹوٹنا شکست ہے۔ مرنا پسپائی ہے ہم سب مرتے چلے گئے کہ ہمیں یہی راہِ فرار دکھائی دی۔ اس وقت تک ہمیں تحفظ کے اس طریقے کا علم نہ تھا ہاں یہ ضرور معلوم تھا کہ جس طرح آدمی کڑی سے کڑی مصیبت جھیل کر زندہ رہ سکتا ہے اسی طرح حیات کی رسی ڈھیلی چھوڑ کر اپنی مرضی سے مر بھی سکتا ہے۔ ہم سب وہی اپنی مرضی سے مر جانے والے لوگ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب ہم سب نے ایک قالب میں اٹھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یک جہتی، قد آوری اور تنومندی کی یہ کیفیت نہایت شاندار ہے مگر ہے پس از مرگ افسوس! —"

"تو اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں ؟"

"ہم لوگوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ کالے کمرے سے زندہ سلامت نکل آنے کا کیا طریقہ ہے مگر ابھی کوئی ہماری بات سمجھ نہیں رہا ہے۔" قوی ہیکل سلائے نے دُکھ سے اپنی گردن جھکالی۔ درختوں کے پتے ساکت ہو گئے۔ چمگادڑوں نے پھڑپھڑانا بند کر دیا۔ اس بے پناہ سناٹے میں میرے چہرے پر بوچھار سی ہوئی۔ خدا جانے بادل کا کوئی ٹکڑا اچانک برس پڑا یا وہ اس مردِ عظیم کے آنسو تھے۔۔۔۔

انکشاف

اس کے آتے ہی یہاں سے وہاں تک سنسنی سی پھیل گئی۔

اور تقریباً ہر پارٹی میں یہی ہوتا تھا۔ مرد اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ عورتیں رشک و حسد سے۔ جو اسے نہیں جانتی تھیں بوکھلا بوکھلا کر پوچھتی تھیں۔

"ائے یہ کون ہے؟"

"اے ہے ساری تو دیکھو — اوپر سے اتی نیچی — نیچے سے اِتی اونچی — اسے ساری کون کہے گا —"

"بھئی یہ مینی ساری ہے۔"

"اٹکا تی کہاں ہے کم بخت تے۔ ذرا سا اور نیچے کھسکا دیتی تو بہتوں کا بھلا ہو جاتا۔"

"بدبخت کو لاج بھی نہ آئی ناف دکھاتے۔"

"اور دیکھو — یہ بلاوز ہے یا....."

"ارے دیکھنا ننگے پاؤں ڈانس کر رہی ہے۔"

"یہ بھی ایک ادا ہے بس کہ کسی طرح لوگ دیکھیں۔"

"ہاں دیکھنا اس غیر ملکی کے سینے پر کیسی جھول رہی ہے کم بخت۔"

"دُھت ہے۔ شراب پی کر ہوش میں تھوڑا ہی رہتی ہے۔ یاد ہے پچھلی مرتبہ اس خوبصورت لڑکے کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ میرے ساتھ ناچ — ادھر وہ شرما شرما کر کہہ رہا ہے کہ مجھے ناچنا نہیں آتا۔ اُدھر اس کی نئی نویلی دلہن پیچ و تاب کھا رہی ہے۔

اور یہ کم بخت اس کا پنڈ ہی نہیں چھوڑتی۔ آخر ایک امریکن لڑکے کو سکھا پڑھا کر بھیجا گیا۔ تب اس کا بازو چھوڑا —— وہ لڑکا تو اپنی دلہن کو لے کر ایسا بھاگا کہ غریب نے کھانا تک نہ کھایا۔"

"پاگل ہے۔"

مگر وہ اس سے قطعی بے خبر تھی کہ اس کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے یہ احساس اسے ضرور ہو جاتا تھا کہ اس پر مردوں اور عورتوں کی نظریں الگ الگ زاویئے سے پڑتی ہیں اور بس یہی نظریں اس کی ساری محنت کا جواب تھیں۔

کھانے کے وقت دوسری سنتی پھیلی جب اس نے اپنی پلیٹ میں خالی شیر مال کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا رکھ کر ٹونگنا شروع کیا۔ بات کیا تھی کہ گوشت قطعی نہیں کھاتی تھی —— نہ مرغی نہ مچھلی —— اور یہاں اس سب کے سوا کیا دھرا تھا۔

"ہندنی ہوگی کم بخت ——" عورتوں میں سے کسی نے کہا۔

"ارے بنتی ہے، یہ بھی ایک ادا ہے۔"

"ڈائیٹنگ کا بہانہ ہے۔ جبھی تو چھلا سی کمر ہو رہی ہے، کوئی کہے گا دو بچوں کی ماں ہے؟"

نانا بھائی دادا جی کی تیسری پشت اترا اترا کر اس سے پوچھ رہی تھی کہ آخر وہ گوشت کیوں نہیں کھاتی۔

اور وہ کہہ رہی تھی —— "بس میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ زندہ، جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے جانور کو محض اس لئے مارا جائے کہ انسان اسے کھائے۔"

نانا بھائی دادا جی کی تیسری پشت اُسے بتا رہی تھی کہ یہ ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ بڑی زبردست انٹیلکچول ہے کیونکہ اس نے سُنا ہے کہ بہت سے مغربی مصنف شاعر اور فلسفی بھی گوشت سے محض اسی وجہ سے پرہیز کرتے تھے۔ اس نے پاس کھڑے

ہوئے غیر ملکی سے اس بات کی تصدیق چاہی تو اس نے یونہی بے نیازی سے گردن ہلادی۔ گویا اس کی اتنی ذہین بات کی داد تو کجا نوٹس ہی نہیں لیا۔ یہ کم بخت غیر ملکی! خود بات کریں گے تو یوں جیسے ان پر وحی نازل ہوئی ہو اور دوسروں کی اچھی سے اچھی بات کو صفا نظر انداز کردیں گے۔

کھانے کے بعد وہ تینوں لان کے اس کنارے پر آ بیٹھے جہاں سے سمندر نظر آرہا تھا۔ اور پیتے رہے نیم دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی کراچی شہر کی رنگ برنگی بتیاں دُور سے کیسی بھلی لگ رہی تھیں پھر سمندر پر کھڑے جہازوں کی روشنیاں یوں بکھری ہوئی تھیں جیسے جگہ جگہ چراغاں ہو رہا ہو۔ ڈھم ڈھم ڈھما ڈھم۔ پاپ گروپ کا بینڈ اس قدر پُرشور تھا۔ کہ کھلی ہوئی جگہ نہ ہوتی تو کانوں کے پردے یقیناً پھٹ جاتے۔

"ہائے کیسی اوس گر رہی ہے ——— اس ننگی کو ٹھنڈی نہیں لگتی ———" عورتیں ابھی تک مُڑ مُڑ کر اُسے دیکھ رہی تھیں۔

نانا بھائی دادا جی کی تیسری پشت اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ غیر ملکی بے نیاز سا بیٹھا ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ باتیں جوان بنگلے زمینوں کی تھیں جہاں انہوں نے مکان بنائے تھے۔ ان شیئرز کی تھیں جہاں انہوں نے روپیہ لگایا تھا اور ان نئی کاروں کی تھیں۔ جو وہ خرید چکے تھے یا خریدنے والے تھے۔

"تمہارے پاس کون سی کار ہے؟" یکایک عورت نے غیر ملکی سے پوچھا۔

"ہے میرے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی، چھوٹی سی کار ———" اُس نے بے تعلقی سے کہا دونوں کو محسوس ہوا جیسے وہ ان کی کاروں کی توہین کر رہا ہو۔

"کیوں ——— ایک بڑی اچھی سی کار کیوں نہیں لے لیتے ——— تم خرید تو سکتے ہو؟" عورت نے کہا۔

"کیا فائدہ ——— ہمارا کنبہ چھوٹا سا ہے اور پھر ——— اکٹھے کم ہی کہیں جاتے ہیں۔

بالفرض جائیں بھی تو — دن میں کتنے گھنٹے ہم اس کار میں صرف کرتے ہیں مشکل سے ایک آدھ گھنٹہ — اس کے لئے اتنا پیسہ خرچ کرنا میری سمجھ میں تو نہیں آتا —۔"

"کم بخت — غیر ملکی یہ اپنے پھیٹچر پن پر اتنا اتراتے کیوں ہیں۔" وہ جل گئی بے اختیار دل چاہا کوئی ایسی بات کہے کہ وہ بھی بغلیں جھانکتا پھرے۔

"تم خدا کو مانتے ہو؟"

"نہیں —"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔"

"عام حالات میں نہیں۔"

"کیوں نہیں — جب تمہیں گناہ اور ثواب کا خیال نہیں تو تم جھوٹ کیوں نہیں بولتے۔"

"اس لئے — کہ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہوئے کہتے ہیں۔ خدا معاف کرے — مگر یہاں تو مجھے خود کو معاف کرنا پڑے گا — اور بعض دفعہ خود کو معاف کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے —۔"

"ایکسکیوز می —" نانا بھائی دادا جی کی تیسری پُشت ایسی بور باتوں کی تاب نہ لاکر بھاگ نکلی۔ وہ اور بھی جل گئی۔

"میں تمہیں بتاؤں میں گوشت کیوں نہیں کھاتی — تم نے منگھو پیر دیکھا ہے؟"

"نہیں —"

جاکر دیکھو — غیر ملکی تو وہاں ضرور جاتے ہیں — جب میں چھوٹی سی ننھی تھی نا تو ایک دن ابا ہم سب بہن بھائیوں کو بس میں بھر کر وہاں لے گئے تھے —۔"

غیر ملکی چونکا تو وہ خوش ہوئی۔

"ہاں — بس میں بھر کر — میرے ابا سفیر قطعی نہیں تھے۔ میں نے تمہیں غلط بتایا

تھا۔ ہم سب ایک معمولی سی بستی کے ایک، چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے۔"

"آؤ، چلیں ——— ایک اور رقص کر لیں، تمہارا میاں کہاں چلا گیا۔ اتنی دیر سے نظر ہی نہیں آیا۔"

"بلیرڈ کھیل رہا ہوگا ——— سنو نا۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ بس ایک تم ہی سچ بول سکتے ہو ——۔"

"میں پادری نہیں ہوں ——— میرے سامنے اعتراف سے کیا فائدہ ——— اور پھر ممکن ہے آج جو بات تم نشے میں کہہ جاؤ کل تمہیں اس پر افسوس ہو۔"

"مگر میں ایسے ہی آدمی کے سامنے اعتراف کرنا چاہتی ہوں جو اس بات کا ڈھنڈورا نہ پیٹے۔ سنو گے ——؟"

"تمہاری مرضی۔"

وہ کرسی پر نیم دراز ہو کر خواب ناک لہجے میں یوں بولنے لگی جیسے وہ سب کچھ اپنے سامنے ہوتا اب دیکھ رہی ہو ——۔ مجھے یاد ہے بس لمبی لمبی سڑکوں پر سے گزر کر ایک سنسان سڑک پر آ گئی تھی۔ دونوں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ پھر پہاڑیوں کا ایک سلسلہ آیا جس میں ایک بالکل تکونی چٹان سب سے الگ نیلے آسمان پر یوں نظر آ رہی تھی۔ جیسے قینچی سے کاٹ کر نکالی گئی ہو۔ اس پہاڑی سے گزر کر گھومتے گھومتے ہم منگھو پیر پہنچے۔ مجھے گرم پانی کے چشمے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ کچھ ایسا تصور تھا جیسے تصویروں میں کسی پہاڑی پر سے شراشر پانی گرتا ہے، مگر یہاں گرم پانی کا سلسلہ بھی بڑا ٹھنڈا تھا۔ صرف دو گڑھے تھے جن میں سے ایک میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ یہ گرم پانی کا چشمہ تھا۔ آس پاس بے شمار مرد عورتیں اور بچے پھر رہے تھے، یہ سب کے سب فقیر تھے جو ہر آنے والے کے چاروں طرف ایسے چمٹ جاتے تھے جیسے شہد پر مکھیاں، ہاں مجھے اس بات پر بڑی ہنسی آئی تھی کہ ایک بڑے میاں اسی چشمے میں سے تین چار گھڑے بھر کے ایک تھڑا بنا کر بیٹھ گئے تھے اور داد،

چنبل اور خارش کا علاج سو فیصدی ضمانت پہ کر رہے تھے۔

گرم پانی کے چشمے سے ابا جی ہم سب کو پیر جی کے مزار پہ لے گئے۔ مزار اونچائی پر تھا۔ پکی سرخ سیڑھیاں اس تک جاتی تھیں نیچے نان بائی کی اور مزار کے تبرک کے طور پر بکنے والی تسبیحوں اور کڑوں کی دو کانیں تھیں۔ مزار پر شاید حال ہی میں سفیدی ہوئی تھی۔ سبز گنبد اور ہرے درختوں کے پس منظر میں وہ خوب چمک رہا تھا۔ سیڑھیوں کے آدھے راستے پر ایک شخص جوتوں کی رکھوالی کے لئے بیٹھا ہوا تھا۔ جوتے اس کے حوالے کر کے ہم سب اوپر آتے۔ پہاڑی پر اونچی نیچی جگہوں پر دُور دُور تک سفید قبریں تھیں۔ درختوں کی چھاؤں میں عجیب ستھری سی ٹھنڈک اور سکون تھا مگر..... "کبھی تم کسی مزار پر گئے ہو ــــ؟"

"بہت دفعہ۔"

"کیا کرنے؟"

"دیکھنے ــــ"

"تمہیں وہاں ایک نامعلوم خوف اور رعب کا سا احساس ہوتا ہے؟"

"نہیں تو ــــ"

"تمہیں کیا خاک محسوس ہوگا، یہ تو ان ہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جن کے دل میں بچپن سے مزاروں کے تقدس کا احساس بٹھایا جاتا ہے۔ میں آج بھی کسی مزار پر جاؤں تو وہی بچپن کا احساس لوٹ آتا ہے۔ ہاں تو اماں نے سر پر رومال باندھا میں نے سر پہ اچھی طرح دوپٹہ لپیٹا ــــ اب میں دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو کیا ــــ اس زمانے میں تو برابر اوڑھتی تھی۔ صرف ہم دونوں اندر گئے۔ باقی چھوٹے بہن بھائیوں کو ابا اندر نہیں لے گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ پیر جی کی قبر پھولوں اور گوٹے لچکے سے اٹی پڑی تھی۔ سرہانے سنہری اور سرخ پگڑیاں رکھی تھیں جن میں مور کے پر کھڑے ہوئے تھے۔ فضا میں پھولوں کے

ساتھ لوبان اور اگر بتیوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ چند لوگ مودب بیٹھے قرآن خوانی کر رہے تھے۔ ابّا نے وہاں رکھی ہوئی صندوقچیوں میں کچھ پیسے ڈالے۔ ہم دونوں ادب سے الٹے پاؤں چلتے باہر آ گئے۔

جوتے پہن کر جب ہم چلے اور نان بائیوں کی دوکان کے پاس سے گزرے تو اچانک ہم سب بہن بھائیوں کو زوروں کی بھوک لگ گئی۔ ابّا نے بہت منع کیا مگر کوئی نہ مانا اور ہم سب نے وہاں سے لے کر کیا کھایا، جانتے ہو؟ تیل میں تلی ہوئی باسی روٹیاں ——

" وہ ہنسی — کیوں ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ یقین نہیں آرہا؟ "

" اب تم اپنے گھر چلی جاؤ — میں سلیم کو بلاتا ہوں، تمہیں آرام کرنا چاہیئے —"

" کیوں؟ "

" اس لیئے کہ تمہارے والد سفیر ہی رہیں تو اچھا ہے۔ ان کا مرتبہ گرانے سے کیا فائدہ؟ "

یہ منحوس غیر ملکی! کبھی تو یوں با اخلاق بن جائیں گے کہ ہر بات میں ہاں ملائیں گے اور کبھی اچانک بچھّو کی طرح ایسا ڈنک ماریں گے کہ آدمی تڑپ کر رہ جاتے۔

" تو تم مجھے گھر کیوں نہیں چھوڑ آتے باقی قصہ میں تمہیں کار میں سنا دوں گی۔ "

" تمہیں معلوم ہے یہاں لوگ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے۔ "

" میں لوگوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ "

" مشکل یہ ہے کہ میری بیوی بھی بڑی امانتی ہے وہ بھی یہاں کی عورتوں کی طرح جل ککڑی ہو گئی ہے۔ "

" ٹھیک ہے تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔ "

" تم کار چلانے کے قابل نہیں ہو۔ "

" گاڑی میں ڈرائیور ہے۔ تم سلیم کو گھر چھوڑتے جانا۔ "

" چلو میں تمہیں کار تک چھوڑ آؤں۔ "

کار گھر کی طرف چلی تو سیٹ پر نصف دراز، آنکھیں کچھ کھلی کچھ مُندی اس نے کہا۔

"تو ہم نے وہاں خوب تیل میں تلی ہوئی روٹیاں کھائیں۔ سُن رہے ہو ڈرائیور؟"

"جی ۔۔۔ کہاں؟ کب؟"

"ارے منگھو پیر میں ۔۔۔ ہاں تو روٹیاں کھانے کے بعد ابا ہمیں مگر مچھ دکھانے تالاب کے کنارے لائے۔ تالاب کا پانی بالکل ہرا تھا۔ اس میں درخت لگے ہوئے تھے۔ اور اندر جگہ جگہ کھجور کے درخت کٹے ہوئے پڑے تھے۔

"دیکھو بچو یہ ہیں مگر مچھ ۔۔۔ اصل میں یہ آدمی تھے مگر پیر جی کی بد دعا سے مگر مچھ بن گئے۔"

"کہاں ہیں ۔۔۔ مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آرہا ۔۔۔" میں نے منہ بسور کر کہا تھا۔

"ارے یہ کیا پڑے ہیں، اندھی ہو گیا؟ ۔۔۔"

اور تب مجھے پتہ چلا کہ جنہیں میں کٹے ہوئے کھجور کے درخت سمجھ رہی تھی وہ پانی میں پڑے ہوئے مگر مچھ تھے۔ مجھے جھر جھری سی آئی۔ ان کے منہ سخت غلیظ اور ڈراؤنے تھے۔ اور کھال پر ایسے کھپڑے تھے جیسے کھجور کے درختوں پر ہوتے ہیں ۔۔۔ ایک آدمی جھولی میں سے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے نکال کر پانی میں پھینک رہا تھا۔ ابا بتا رہے تھے کہ ان مگر مچھوں کی عمر تین تین چار چار سو سال ہے۔ سب بچے دیوار پر سے بار بار اندر جھانک کر انہیں دیکھ رہے تھے مگر میں مارے ہیبت اور کراہت کے کانپ رہی تھی اور اس طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک فقیر رنگ برنگے ٹکڑوں کا جھولا پہنے، کمر میں ایک دوپٹہ باندھے کود رہا تھا۔ اس کے گلے میں گردن سے ناف تک رنگین مالائیں پڑی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں کلائیوں سے کہنیوں تک رنگین کڑے تھے پھر ایک سفید فام عورت آئی جو شمیز نما کوئی چیز پہنے ہوئے تھی اس کے سفید بازو اور ٹانگیں دھوپ میں خوب چمک رہی تھیں وہ اس فقیر کی تصویر لینے لگی اور سارے مرد اور بچے ان بڑھے

مگر مچھوں کو چھوڑ کر چینی کی اس گڑیا کو دیکھنے لگے۔ اس وقت میں نے سوچا کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اسی طرح لوگ سب کچھ چھوڑ کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

وہ عورت چلی گئی تو لوگ پھر مگر مچھوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یکایک میں نے دیکھا دو آدمی ایک مگر مچھ کی گردن میں رسہ ڈالے اسے پانی سے زمین کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ مگر مچھ کا منہ کھلا ہوا تھا اور مرا ہوا پڑا تھا۔ اس پر کیڑے مکوڑے اور مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں اس کا پیٹ پھول کر نمک بھری ہوئی بوری کی طرح ہو رہا تھا۔

"ارے کیوں گھسیٹ رہے ہو اسے؟" ایک آدمی نے پکار کر پوچھا۔

"دیکھتے نہیں ہو مر گیا ہے اسے دفن کر رہے ہیں۔"

"ارے یہ کہیں اتنی آسانی سے مرتے ہیں یہ، لوگ خود انہیں مارتے ہیں کہ ان کے حصے کا گوشت خود ہضم کر سکیں۔"

ایک درخت کے نیچے کوئی سات فٹ لمبا گڑھا کھدا ہوا تھا۔ دونوں آدمی بڑی مشکل سے مگر مچھ کو گھسیٹ کر اس گڑھے تک لائے۔ میں نے اس وقت تک کبھی اتنی بدنما اور کراہت پیدا کرنے والی چیز نہیں دیکھی تھی۔ دفعتاً مجھے چکر آیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد قے کے جھٹکوں نے مجھے بے دم کر دیا۔ ابا الگ ناراض تھے۔

"کتنا منع کیا تھا تیل میں تلی ہوئی روٹیاں نہ کھاؤ کم بختو——"

ایک آدمی دوڑ کر المونیم کے ٹیڑھے میڑھے گلاس میں پانی لایا۔ پانی پی کر میری طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ ابا نے ہم سب کو پھر بس میں بٹھا دیا۔ بس میں کھڑکی سے منہ نکال کر ٹھنڈی ہوا میں سانس لیتی تو وہ مرا ہوا مگر مچھ جیسے ہوا میں ڈولتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوتا۔ گھبرا کر منہ اندر کر لیتی تو بس میں مگر مچھ ہی مگر مچھ نظر آنے لگتے۔ وہ منظر مجھے آج تک نہیں بھولا—— سن رہے ہو ڈرائیور؟"

"جی حضور۔"

"اور وہ دن اور آج کا دن ہیں نے گوشت پھر کبھی نہیں چکھا۔ اماں نے لاکھ خوشامد درآمد بھی کی۔ ڈانٹا ڈپٹا بھی مگر مجھے تو گوشت دیکھتے ہی ایسی ابکائیاں آنے لگتی ہیں جیسے بلّی زیادہ گوشت کھالینے کے بعد اوکتی پھرتی ہے۔ تنگ آکر امّاں نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔"

گھر پہنچ کر ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو اُترتے ہوئے اس نے کہا "یہ بات کسی سے کہنا مت"، پھر پرس کھول کر جو پہلا نوٹ ہاتھ آیا ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا اور لڑکھڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

راندۂ درگاہ

لیویڈیا (LEVADIA) میں لبِ سڑک بنے ہوئے چائے خانے میں بیٹھا میں چائے پی رہا تھا۔ سامنے سڑک کے پار سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے سلسلے چلے گئے تھے۔ یونان مجھے بہت پسند آیا تھا۔ ویسے بھی یونان سے مجھے ہمیشہ سے ایک انجانا رشتہ محسوس ہوتا تھا۔ اگر میں ہندو ہوتا اور آواگون میں یقین رکھتا تو ضرور سوچتا کہ شاید کسی جنم میں یونان میں رہا ہوں گا اور بہت خوش رہا ہوں گا تب ہی میرا ذہن بار بار یونان کی طرف جاتا ہے۔ یونان کے آثارِ قدیمہ پر جو ریسرچ میں کر رہا تھا یہ یونان سے میری دلچسپی کا ثبوت بھی تھا اور یونان کو دل بھر کر دیکھنے کا بہانہ بھی۔ کبھی میرا ذہن یونانی تاریخ میں گم ہو جاتا اور کبھی میں جدید یونان کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید یونان نے مجھے تھوڑا سا مایوس کیا تھا۔ اتنی بڑی تاریخ کے وارثوں سے آپ بڑی بڑی توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ مگر افسوسناک حقیقت یہی ہے کہ جو قومیں فقط اپنے ماضی پہ فخر کرتی رہ جاتی ہیں وہ حال میں کہیں نہیں پہنچ پاتیں۔ لیکن مجھے دونوں سے دلچسپی تھی ماضی کے یونان سے بھی اور اس کے حال سے بھی۔

ہماری یونانی رہبرہ کاؤنٹر کے پاس ایک اونچے اسٹول پر بیٹھی کافی پی رہی تھی اور کاؤنٹر پر چیزیں بیچنے والے کسی شخص سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اُسے برابر کی کرسی پیش کی تھی مگر وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرتی ہوئی کاؤنٹر پر چلی گئی تھی۔ وہ بہت خوش شکل تھی خواہ خوبصورت نہ ہو۔ اس کی جلد بے حد صاف، آنکھیں شفاف اور روشن اور گردن لانبی تھی اس کا قد موزوں تھا۔ مگر جسم نہ چھریرا تھا نہ فربہ بہت غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا

تھا کہ اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ کمر پر مغربی یا امریکی معیار کے لحاظ سے ذرا بھاری تھی مگر مجھے وہ قطعی موٹی یا بھدی نہیں لگی۔ اس کے بالوں میں ہلکی سی لہر تھی جن کو فرینچ بن کی شکل میں اس نے پیچھے باندھ رکھا تھا اور اس کی شفاف گردن کچھ اور لانبی ہو گئی تھی۔ وہ جدید یونانی لڑکی تھی اور یونان کی پرانی تاریخ سے واقف تھی اس لئے میں نے اس سے کئی بار باتوں کی کوشش کی وہ کئی زبانیں جانتی تھی مگر ہر زبان میں خالص یونانی انداز سے بہت غلط جگہ زور دیتی تھی جس سے بعض الفاظ مضحکہ خیز سے ہو جاتے ہیں۔ جانے کیوں وہ ٹورسٹوں سے زیادہ باتیں کرنے کی روادار نہیں تھی۔ خواہ وہ باتیں یونانی تاریخ سے ہی متعلق کیوں نہ ہوں۔ میں اسے مرعوب کرتے یا خوش کرنے کے لئے یونانی ہسٹری دہراتا رہا اور وہ چپ چاپ سنتی رہی حالانکہ اتنے قابل آدمی اُسے شاذونادر ہی میسر آتے ہوں گے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ سیاحوں میں زیادہ تر لوگ بالکل صفر ہوتے ہیں۔ ایتھنز اور روم کے نام سے تو ضرور واقف ہوتے ہیں بس آگے اللہ اللہ ایک عدد قیمتی کیمرہ سنبھال کر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سیر کرنے اور جب یہ رہبر خواتین ان پر پرانی چترکاریوں اور سنگ تراشیوں کے بھید کھول رہی ہوتی ہیں تو یہ چپکے سے ان کی تصویریں لینے میں مصروف ہوتے ہیں نہ انہیں قدیم عمارتوں سے دلچسپی نہ قدیم شاہکاروں سے انہیں تو بس دو ہفتے کی چھٹیاں کہیں نہ کہیں گذارنا ہیں۔ جس طرح ایسے سیاحوں کے لئے ساری جگہیں برابر ہیں ایسے ہی ان رہبر لڑکیوں کے لئے سارے سیاح برابر ہیں اور ٹھیک ہی تو ہے ایک عمر سے یہ ان ٹورسٹ لوگوں سے نمٹ رہی ہیں ان میں یا ان کی باتوں میں دلچسپی لینے سے فائدہ۔ یہ تو اڑتی چلتی چڑیاں ہیں۔ ان کی بلا سے ان میں کوئی اپنے وقت کا بقراط ہو تو کیا — انہیں تو کاؤنٹر پر کھڑے اس شخص سے زیادہ دلچسپی ہے، جس سے ہر تیسرے دن ان کی ملاقات ہوتی ہے اور جس سے یہ یونانی میں اپنا دکھ درد کہہ سکتی ہیں۔

"میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" آواز آئی۔ میں اپنے خیالوں سے چونکا۔ ایک بے حد معمولی لڑکی بے ہنگم سی کلیجی رنگ کی برساتی پہنے جو آگے سے کھلی ہوئی پھڑ پھڑا رہی تھی میرے پاس کی

کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کر رہی تھی۔

"ضرور۔" جی چاہا کہوں۔ اب کیا ایسا گیا گزرا ہوں کہ تم جیسی لڑکیاں میرے پاس بیٹھیں۔ میں نے دوسری میزوں پر نظر ڈالی۔ ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ لڑکی واقعی مجبور تھی۔

"بے شک ضرور" میں نے خندہ پیشانی سے کہا مگر لہجے میں جوش و خروش نام کو نہ تھا۔ وہ اپنی اکڑی ہوئی بے ڈھنگی سی برساتی سمیٹ میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ نہ اس وقت بارش ہو رہی تھی نہ ایسی زبردست بارش کا کوئی امکان تھا۔ پھر خدا جانے اس لڑکی نے یہ برساتی کیوں لا دکھی تھی۔ میں چاہتا تو سوال پوچھ کر اس سے گفتگو کا آغاز کر سکتا تھا مگر میں کافی اور سگریٹ پیتا رہا اور باہر جھانکتا رہا۔ ایتھنز سے ڈیلفی تک کا یہ راستہ بڑا پر فضا تھا۔

"براہ کرم یہ تو بتائیے کہ سیاہ کافی اور سفید کافی میں کیا فرق ہوتا ہے؟" اس لڑکی نے پوچھا۔

بے حد جاہل لڑکی ہے۔ بات شروع کرنے کے لئے کوئی معقول موضوع نہیں سوجھا تھا۔ تو کم از کم ایسا بے وقوفی کا سوال تو نہ پوچھتی۔

"ظاہر ہے" میں نے کہا "سیاہ کافی بغیر دودھ کی ہوتی ہے اور سفید کافی دودھ کی دینا جانتی ہے"

وہ مسکرائی "سیاہ کافی اور گریک کافی میں کیا فرق ہوتا ہے؟" اس نے دوسرا سوال داغا۔

اب میں جھینپا۔ کیونکہ ساری قابلیت کے باوجود یہ نکتہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھے اپنی نااہلی کا اعتراف کرنا پڑا۔ بہر حال اسے کون سے اپنے علم میں اضافہ کرنا تھا۔ سوال تو بہر حال گفتگو شروع کرنے کا بہانہ تھے۔

آپ تنہا سیر کرنے نکلی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم دو سہیلیاں اکٹھی نکلی تھیں۔ کل اس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور وہ واپس چلی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ لوٹنا چاہتی تھی مگر وہ کہنے لگی کہ تم اپنا پروگرام خراب مت کرو، اس طرح میں اکیلی رہ گئی۔ . . . اور مجھے اتنا عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"لو اس میں عجیب لگنے کی کیا بات ہے میں بھی تنہا سفر کر رہا ہوں، بہت لوگ کرتے ہیں۔"

"بہت تو نہیں، کم ہی کرتے ہیں"، اس نے کہا۔ واقعی اس نے ٹھیک کہا تھا۔ یورپ میں عورت یا مرد کا تنہا سفر کرنا کوئی عجوبہ نہیں ہے پھر بھی ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ زیادہ تر میاں بیوی یا ایک لڑکا اور ایک لڑکی کہیں چار چھ کے گروپس یا پھر دو دوست یا دو سہیلیاں۔

جب لوگ باگ اٹھ کر کوچ میں بیٹھنا شروع ہوئے تو ہم چونکہ اکٹھے اُٹھے اس لئے ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ راستے میں اس نے کوئی بات شروع نہیں کی۔ جیسے وہ بتانا چاہتی ہو کہ میں تمہاری تنہائی میں مخل ہونا نہیں چاہتی۔ رہبر، یونان کی پہاڑیوں۔ وادیوں اور تاریخی مقامات کے بارے میں پہلے یونانی میں بتاتی پھر انگریزی میں۔ کچھ فرانسیسی اور جرمن تھے مگر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ انگریزی سمجھتے ہیں اس لئے یہ دو زبانیں کافی ہیں۔ آگے آنے والے گاؤں ایراہووا (ARACHOVA) کا اس نے تعارف کروایا اور جب کوچ وہاں پہنچی تو جھٹ پٹ ایک دوکان میں اتر کر خریداری کرنے لگی۔ دوسری عورتیں بھی اس کی تقلید میں اتر گئیں اور میری ساتھن بھی اس ٹولے میں مل گئی۔ اسی گاؤں کی بنی ہوئی نہایت عمدہ چیزیں دوکانوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ موٹے موٹے اونی سویٹر اور رنگ برنگے قالین بہت خوبصورت تھے دوسری نئی چیزیں ثابت و سالم بھیڑ کی کھال کے شال تھے نہایت سفید اور نرم۔ اس کے علاوہ کراس اسٹچ کے کام کے سفید بلاؤز اور اون کے بنے ہوئے پرس اور کشن تھے۔ اس گاؤں کی سرخ شراب اونی کپڑے اور گھروں کے بنے ہوئے پنیر مشہور ہیں اور عورتیں حسب عادت بے جگری سے خریدنے میں مصروف تھیں۔ میں وہاں سے ہٹ کر سڑک کے دوسری طرف آکر نیچے وادی میں جھانکنے لگا۔ نئے نئے مکان تھے۔ سرخ کھپریلیں تھیں۔ چند مرغیاں اور چند بچے جو دنیا کے ہر گاؤں میں ملتے ہیں۔

یہاں سے چلے تو سڑک مغرب کی طرف مڑتی چلی گئی۔ راہ میں انگور کی بیلیں، بادام کے درخت، زیتون کے جھنڈ اور گیہوں کے کھیت آئے۔ زیتون کے پتے تیز ہوا سے الٹ کے چاندی کے پتوں کی طرح چمک رہے تھے۔ بارہ میل پر وہ جگہ آئی جہاں اوڈیپس نے ڈیلفی سے لوٹتے ہوئے اپنے باپ کو ہلاک کیا تھا۔ ڈیلفی آیا تو رہبرہ ہمیں مرغی کے بچوں کی طرح سمیٹ سب سے پہلے میوزیم میں لے گئی جہاں اس نے ۴۷۸ ق۔ م کا بنا ہوا رتھ بان کا شہرہ آفاق مجسمہ دکھایا۔ اس کی باریکیاں سمجھائیں اور کچھ مجسموں سے اس کا موازنہ کیا۔ میں مجسمہ کی تصویریں کھینچتا اور اس کی تفصیلات لکھتا رہا۔ مجسمے کے خدوخال اس کے بال اس کی خود کے نقش ونگار اس کے لباس کی سلوٹیں حیرت انگیز حد تک خوبصورت تھیں اور پھر اس کی آنکھیں بھی تھیں جو لعل کی بنی ہوئی لگتی تھیں۔ مگر رہبرہ نے بتایا کہ اس کی ایک آنکھ اب بھی اسی وقت کی بنی ہوئی ہے۔ میں یہ سب غور سے دیکھ اور سُن رہا تھا اور میری ساتھن دیوار کے پاس رکھے ہوئے ننگے مجسموں کو دیکھتی پھر رہی تھی یا قبل مسیح کے بنے ہوئے سونے کے زیورات جو پیرس کی دو کانوں میں ہوں یا ڈیلفی کے میوزیم میں ہر جگہ عورتوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

رہبرہ بتاتی رہی کہ قدیم یونانی ڈیلفی کو دو تون دیناؤں کا سنگم اور زمین کی ناف سمجھتے تھے۔ زیوس دیوتا نے دو چیلیں دو مختلف سمتوں میں چھوڑی تھیں جو ڈیلفی میں آن کر ایک جگہ مل گئی تھیں۔ وہیں ایک یادگار بنا کر اسے دنیا کا بیچوں بیچ قرار دے دیا گیا تھا۔ انڈے کی شکل کا بڑا سا نقشین مٹکا جو اس وقت وہاں رکھا گیا تھا اب نابود تھا مگر اس کی نقل اسی میوزیم میں موجود تھی۔ یہاں سے وہ ہمیں مشہور زمانہ اپولو کا مندر دکھانے لے گئی۔ اس مندر میں وہ شہرۂ آفاق آریکل تھا جو مستقبل کے بارے میں پیشینگوئی کیا کرتا تھا۔ مگر اب اس کے کوئی آثار وہاں نہیں تھے۔ مندر شکستہ ہو چکا تھا اس کے سفید ستون اور دیواریں دوبارہ جما کر جتنا حصہ ممکن تھا دوبارہ بنا دیا گیا تھا۔ مندر کے اوپر قدیم تھیٹر کے کچھ آثار باقی تھے عورتیں اس تھیٹر کی سیڑھیوں نما سیٹوں پر بیٹھ گئیں اور مرد گول اسٹیج کے

دائرے میں کھڑے ان کی تصویریں لیتے رہے۔ یہ قدیم تھیٹر اب اسی مصرف کا رہ گیا تھا یہاں سے ہم اس چشمے پر گئے جہاں عہدِ قدیم میں زائرین مندر میں داخل ہونے سے پہلے ہاتھ دھوتے تھے۔

یہ سب دکھانے کے بعد جب رہبر نے پوچھا "کوئی سوال؟" تو میرے ذہن میں سینکڑوں سوال ہلچل مچانے لگے اور قبل اس کے کہ میں کوئی سوال پوچھوں ایک امریکن نے کاندھے پر تھیلا چھلاتے ہوئے کہا "میرے ذہن میں بہت دیر سے ایک نہایت اہم سوال گردش کر رہا ہے وہ یہ کہ ہمارا لنچ کتنے بجے ہوگا ـــــ؟" ایک زوردار قہقہہ پڑا اور یہ جملہ گویا ہمارے ٹور کا اختتامیہ کلمہ ہوگیا۔ رہبر نے فی الفور اعلان کردیا کہ اب ہم آپ کو لنچ کے لئے ڈیلفی شہر لئے چلتے ہیں۔ اس ٹور میں یہ سہولت تھی کہ اگر کوئی زیادہ دن ڈیلفی رکنا چاہے تو اپنے خرچ پر رہ سکتا تھا اور اس ٹور کے کسی بھی کوچ سے واپس جاسکتا تھا میں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھاکر ڈیلفی میں اور ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اسی ہوٹل میں میری بکنگ تھی جس میں اس وقت ہم کھانا کھانے جارہے تھے۔ سب پھر کوچ میں بیٹھے اور ڈیلفی شہر روانہ ہوئے۔ جو دراصل ایک سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے مکانوں، دوکانوں اور ہوٹلوں پر مشتمل تھا۔ ہمارا ہوٹل بھی لبِ سڑک تھا مگر دوسری طرف سمندر بہت دور اور بہت نیچے دو پہاڑوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ اس وقت اس سمندر کی نوک کا رنگ جو کھانے کے کمرے سے نظر آرہی تھی گہرا نیلا تھا۔ دراصل یہ ڈیلفی خلیج تھی۔

دوپہر کا کھانا ٹور میں شامل تھا۔ سب کو ایک ہی سا کھانا ملا۔ کھانے کی میز پر بھی وہ لڑکی میرے نزدیک ہی بیٹھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کھانے کے بعد باری باری سب عورتیں غسل خانے میں گئیں اور اپنا میک اپ درست کرکے آئیں مگر وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ آخر میں نے اس سے یہ سوال پوچھ ہی لیا کہ وہ کیوں دوسری خواتین کی طرح میک اپ

نہیں کرتی۔

"یہ دور مجھ پر بھی گزر چکا ہے۔ ۔ ۔ مگر اب گزر گیا۔ اب مجھے اپنے ظاہری حلیے کی اتنی فکر نہیں رہی۔"

اس نے یہ جملہ اس طرح کہا گویا وہ سنز کی سرحد پار کر چکی ہو جب کہ میرے اندازے کے مطابق وہ پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

"گویا تم نے ظاہری حلیے کو چھوڑ کر باطنی حلیے کو سنوارنے کی کوشش شروع کر دی ہے" میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑی جو لڑکیاں آپ کی باتوں پر ہنسیں وہ خواہ مخواہ اچھی لگنے لگتی ہیں مگر مجھے وہ اس وقت بھی کوئی خاص اچھی نہیں لگی البتہ جب رہبر نے کوچ کا گھنٹہ بجایا اور وہ جانے کے لئے اٹھنے لگی تو یوں ہی میں نے کہہ دیا "میں ابھی یہاں ٹھہر رہا ہوں۔ چاہو تو تم بھی رک جاؤ۔ اکٹھے چلے چلیں گے دو ایک دن میں"

وہ ذرا سا ٹھٹکی پھر واپس کرسی پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے پانی کا گلاس لینے اٹھی ہو اور میں نے پیش کش کر دی ہو کہ تم بیٹھو میں لے آتا ہوں۔

"گائڈ کو مطلع کر دو" میں نے کہا۔

وہ اٹھی اور ڈیڑھ ایک جملے میں رہبر کو مطلع کر کے واپس آگئی۔ رہبر نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں اور سرخ ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ چلو تمہیں کوئی تو مل گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بھئی میری تو کچھ مجبوریاں ہیں تمہیں اندازہ ہونا چاہیئے میں بھی دھیرے سے مسکرا دیا جیسے میں نے کہا ہو، چلو معاف کیا۔

جب ہمارے ٹور کے سارے بڈھے جوان یہاں تک کہ آخری لنگڑا لڑکا بھی اپنی بیساکھی لے کر چلا گیا، تب ہم دونوں اٹھے اور کاونٹر پر گئے۔ میں نے استقبالیہ کی یونانی نژاد خوبصورت لڑکی سے کہا "میرا کمرہ نمبر یہ ہے میں سنگل کے بجائے ڈبل بیڈ کا ایک بڑا کمرہ

غسل خانے کے ساتھ چاہتا ہوں اگر ممکن ہو تو میرا کمرہ بدل دو۔"

"دیکھتی ہوں۔" اس نے خالص کاروباری انداز میں کہا اور رجسٹر دیکھنے کے بعد بولی "او۔ کے کمرہ نمبر پچھتر یہ ہے اس کی کنجی" اس نے کنجی بڑھائی میں نے تھامی اور ہم دونوں کمرے میں آگئے کمرہ عمدہ اور صاف ستھرا تھا لمبی سی ایک کھڑکی خلیج کی طرف کھلتی تھی جس پر باریک سفید اور نارنجی دبیز دہرے پردے پڑے ہوئے تھے اور جہاں سے باہر جھانکو تو سبز پہاڑوں کے درمیان پر سکون گہرا نیلا پانی کسی تصویر کی طرح دلکش تھا۔

ڈیلفی سے ہم واپس ایتھنز آئے اور پھر جہاں جہاں میں گیا وہ سایہ بن کر میرے ساتھ رہی۔ کورفو، کریٹ، مقدونیہ، تھریس، روڈس، اسپارٹا اور دوسرے یونانی جزیرے میں۔ ان لڑکیوں کے صبر و استقلال کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پتی ورتا عورتوں کو چھوڑ دیئے۔ ان لڑکیوں میں جو گھروں کی پابندیاں برداشت نہ کر کے رسیاں تڑا کر بھاگیں کس بلا کا صبر اور کیسی استقامت ہے کہ چاہے کسی آدمی کے کسی کام سے دلچسپی ہو نہ ہو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہیں گی اور کیا مجال جو پیشانی پر شکن آئے میں بے حد مصروف تھا دن کم تھے اور کام بہت۔ سیاحت کرتا۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھتا ان پر نشانات لگاتا، نوٹس بناتا۔ رات کو آنکھ کھل جاتی تو اٹھ کر لکھنا شروع کر دیتا۔ وہ ایک آنکھ کھول کر دیکھتی اور پھر سو جاتی۔ صبح دیر تک سویا رہتا، تو وہ کچھ نہ کہتی۔ اگر پانچ بجے اُٹھ کر اس سے چلنے کو کہتا تو وہ فوراً تیار ہو جاتی۔ خود سے اس نے کبھی نہ کہا کہ اسے بھوک یا پیاس لگی ہے ہاں اگر میں کھانے پینے کو پوچھتا تو انکار بھی نہ کرتی۔ جب ریستوران یا ہوٹل میں جانے کا وقت نہ ملتا تو ہم لب سڑک کھڑے صاف ستھرے ٹھیلوں سے بھٹے خرید کر کھا لیتے جو ٹھیلے والا اسٹینلس اسٹیل کی انگیٹھی میں اسی وقت بھون کر دیتا یا سفید تلوں کی گول ہلکی پھلکی جلیبیاں جو خوانچوں پر بک رہی ہوتیں۔ اس نے کبھی کسی چیز پر احتجاج نہیں کیا۔ اس میں ایک اچھی بیوی بننے کی پوری صلاحیت

تھی۔ ممکن ہے یہ ہر لڑکی میں موجود ہو جو بیوی بننے کے بعد زائل ہو جاتی ہو۔ میں نے سوچا۔
ڈیلفی میں سائپرس کے درخت کے سائے میں بنچ پر بیٹھا جب میں نوٹس لکھ رہا تھا۔
تو اس نے میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا کر دھیمے سے کہا تھا۔
"مجھے ایسی جگہیں بہت اچھی لگتی ہیں جو اونچی نیچی ہوں" پھر وہ اپنے پیر اونچے کر کے احتیاط سے میری گود میں لیٹ گئی اور آہستہ آہستہ کہتی رہی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔
"سیدھے سپاٹ مناظر چاہے کتنے خوبصورت ہوں ان میں یہ بات نہیں ہوتی بے حد خوبصورت پھولوں سے بھرے باغ پر بھی میں ایک چٹیل پہاڑی کو ترجیح دوں گی اور اگر پہاڑوں کے ساتھ سبزہ بھی ہو تو کیا کہنے۔ اس لحاظ سے یونان کتنا پیارا ملک ہے اور ایتھنز کا تو جواب ہی نہیں اس کا اکروپولیس، ہری بھری ڈھلانیں۔ وہ پہاڑ جہاں سینٹ پیٹر نے خطبہ دیا تھا اور اگورا..... اور ایتھنز سے ڈیلفی تک کا راستہ بھی کتنا پیارا ہے۔ اور پھر یہاں سمندر بھی ہے، سمندر اور پہاڑوں میں کتنی کشش ہوتی ہے اگر کوئی مجھ سے کہے تو میں ساری عمر یونان میں رہنے کو تیار ہوں،،
میں نے اپنی کتابیں تہہ کر کے رکھ دیں اور کہا "یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہی، اگر کوئی مجھ سے کہے تو میں بھی یہاں ساری عمر رہنے کو تیار ہوں۔،،
"مگر وہ کون ہوگا جو تم سے اور مجھ سے یہ بات کہے گا،، اس نے بھولپن سے پوچھا اور ہنس پڑی۔
"معلوم نہیں وہ کون ہوگا،، میں بھی ہنس دیا اور اس وقت مجھے خیال آیا اس سے پوچھوں تو سہی کہ یہ کس ملک کی رہنے والی ہے۔ کیا اس کا ملک بہت سپاٹ ہے، کیا وہاں سمندر سرے سے نہیں ہے، کیا وہاں آثارِ قدیمہ کے کوئی آثار نہیں ہیں مگر اس سے پوچھنے کے بجائے میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود چند دن میں اندازہ لگا کر بتا دوں گا کہ اس کا تعلق کس ملک سے ہے اس کی انگریزی انگریزوں جیسی نہیں تھی اگر وہ یونانی

موتی تو یونان کے بارے میں یہ باتیں نہ کہتی۔ رہبرہ سے میں نے ایک مرتبہ اُسے اکھڑی اکھڑی فرانسیسی بولتے سُنا تھا۔ میں جو تاریخ کا طالب علم ہوں اور اقوام عالم کے حال سے بھی بہت دلچسپی رکھتا ہوں مجھے اتنا اندازہ ہونا چاہیئے۔ یہ مطالعہ رہے گا بھی دلچسپ میں اپنے قیاسات بنا کر اس سے بھی پوچھوں گا کہ اس نے میرے بارے میں کیا اندازہ لگایا ہے۔

اور آج یونان میں ہمارا آخری دن تھا۔ میں ایتھنز کو آخری بار اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ ایتھنز کی دور دور بکھری ہوئی چیزیں دیکھنے کے بعد ہم اکیروپولیس لوٹ آئے۔ ایتھنز کے سفید پہاڑوں سے روشنی سی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ان پتھروں میں بے حسی نہیں بھی زندگی تھی اور ایکروپولیس کی سفید عمارتوں میں عجیب تقدس اور جلال تھا۔ پارتھینوں کے ٹکڑی کے سے چھلے ہوئے سفید ستون اور اس کے سائے میں پڑے ہوئے بے ترتیب سفید پتھر، مندر کی چھت کو سنبھالے ہوئے خوبصورت مجسمے، پہاڑ میں گم ڈایونسیس کا تھیٹر۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر اُگے ہوئے زیتون اور ان میں متواتر بولتے ہوئے جھینگر اور نیچے اگورا اور اس کی عمارتیں۔ ان سب میں میرے لئے بے پناہ کشش تھی۔ مگر دوسری طرف پہاڑی کی کوہ میں بنی ہوئی وہ جیل کی کوٹھری مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جس میں سقراط قید رہا تھا۔ اس کوٹھری کو دیکھنے بہت کم لوگ جا رہے تھے اور اس پر کوئی تختی بھی نہیں اس لئے اس کو دیکھ کر سقراط کی قید و بند کا پورا منظر میری نظروں کے سامنے آجاتا تھا۔ رات گئے سب چیزوں سے نمٹ کر ہم اسی جیل کے دامن میں ایک اجاڑ سے باغ کی بنچ پر آکر بیٹھ گئے۔ اسی طرف رومن یادگار کے سائے میں رقص و موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا۔ موسیقی کی لہریں پہاڑوں سے ٹکرا کر کئی گنا پُرشور ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف ایکروپولیس پر "روشنی اور آواز"، کا کھیل ہو رہا تھا۔ عمارتوں اور پہاڑیوں پر رنگ برنگی روشنیاں پھیلتی جاتیں۔ ہر روشنی کے ساتھ ایک گرجدار دھماکہ ہوتا جو ایکروپولیس کے سائے میں بنے قدیم تھیٹر میں ہونے والے کسی ڈرامے کی تالیوں یا قہقہوں کے شور میں گم ہو جاتا۔

درختوں کے بیچ میں سے دور ڈھلوانوں پر سڑکوں اور مکانوں کی روشنیاں چمک رہی تھیں
میں اس مہنگا مہ رنگ و نور میں بیٹھا سوچ رہا تھا جب سقراط یہاں قید ہو گا تب بھی ایکروپولیس
کی عمارتوں میں یونہی رونق رہتی ہو گی۔ یونہی گانے بجانے کی محفلیں برپا ہوتی ہوں گی۔
قہقہے چھپے ہوتے ہوں گے اور سقراط اپنی اندھیری کوٹھری کے غار نما دروازے سے
گذر کر کوٹھری کے دوسرے حصے میں چلا جاتا ہو گا تاکہ ذرا سکون سے سوچ سکے۔

"تم جانتی ہو سقراط کون تھا؟" میں نے اپنی ساتھن سے پوچھا۔

"ہاں، یونانی فلاسفر تھا۔"

"نہیں وہ ایک راندۂ درگاہ تھا، ڈراپ آؤٹ جس کو کہتے ہیں آج کل۔"

"جیسے میں!" اس نے ہنس کر کہا "اور اس کا گناہ کیا تھا۔ نوجوانوں کو گمراہ کرنا!"

"نہیں یہ تو اس پر الزام لگایا گیا تھا گناہ کچھ اور ہوتا ہے الزام کسی اور بات کا لگایا
جاتا ہے یہ دنیا کی بہت پرانی ریت ہے۔ اصل قصہ میں تمہیں سناتا ہوں" میں نے ٹانگیں
پھیلاتے ہوتے کہا۔ ابھی میں طلسمی فضا میں کچھ دیر اور سانس لینا چاہتا تھا۔

"ڈیلفی کے آریکل کی جو جگہ ہم دیکھ کر آئے تھے وہاں سقراط کا دوست گیا تھا اور اس نے
آریکل سے پوچھا تھا کہ کیا دنیا میں سقراط سے عقلمند بھی کوئی شخص ہے اور اس ہاتفِ غیبی سے
جواب ملا تھا کہ "نہیں" سقراط "خدا" کی اس بات پر بے حد حیران ہوا کیونکہ اُسے اپنے
بارے میں ایسی کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ مگر اس کا ایمان تھا کہ آریکل کی بات غلط نہیں ہو سکتی۔ کچھ
دن وہ کشمکش و پیچ میں رہا۔ اس کے بعد اس نے آریکل کی اس بات کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔
سب سے پہلے وہ ایک ایسے سیاست داں کے پاس گیا جو اپنی دانائی کے لئے مشہور تھا۔ اس
سے باتیں کر کے سقراط نے اندازہ لگایا کہ گو دوسروں کی اور خود اپنی نظر میں وہ شخص عقلمند
تھا مگر اصل میں نہیں تھا۔ سقراط نے غضب یہ کیا کہ یہی بات اُسے بھی سمجھانے کی کوشش
کی اور نتیجہ تم سمجھ سکتی ہو کہ کیا ہو گا۔ اس کے بعد سقراط ایک عالم فاضل کے پاس گیا اور اسی

نتیجے پر پہنچا، اس نے محسوس کیا کہ وہ نامقبول ہوتا جا رہا ہے مگر وہ یہ کام مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرتا رہا۔ پھر وہ ہر طرح کے شاعروں کے پاس گیا اور اس نے اندازہ لگایا کہ وہ دانشمند ہونے کی وجہ سے نظمیں نہیں لکھتے بلکہ کسی وجدانی قوت کے تحت لکھتے ہیں۔ آخر میں اس نے صنعت کاروں کی طرف رُخ کیا ان کے ساتھ بھی وہی مصیبت تھی جو شاعروں کے ساتھ یعنی اپنے صنعت کارانہ علم کی بنا پر وہ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ انہیں ہر قسم کے علم سے آگہی ہے۔ تب سقراط نے فیصلہ کیا کہ ان عقلمندوں کی یہ بے وقوفی کہ وہ خود کو عقلمند سمجھتے ہیں ان کی نقد دانائی سے کہیں بڑی ہے اور صرف اسی سبب سے وہ ان سب سے زیادہ عقلمند ہے اور جب اس نے دوسروں پر یہ بات واضح کی کہ آریکل کی مراد کیا تھی تو لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور اس کے حصے میں زہر کا پیالہ آیا جسے اس نے سچائی کو امر بنانے کے لئے پی لیا اور خود بھی امر ہو گیا۔ آؤ اسی بات پر یونان چھوڑنے سے پہلے ایک بار پھر اس کی کوٹھری کی زیارت کر لیں،،

ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور اندھیرے میں ایک دوسرے کو سہارا دیتے اس پہاڑی کی طرف بڑھے۔ ایکروپولیس پہ، رومن یادگار کے سائے میں ہر طرف روشنی تھی، موسیقی تھی اور قہقہے تھے مگر سقراط کی کوٹھری اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ کنپٹی پر رکھے اور سلاخ دار دروازے سے اندر جھانکا۔ اندر قبر کی سی تاریکی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے سقراط اس اندھیرے میں سلاخوں کے پیچھے اب بھی موجود ہو اور موسیقی کو روشنی کے جلو میں ان دھماکوں کو اور تھیٹر کے اُٹھنے والے قہقہوں کو سُن رہا ہو اور دل ہی دل میں ان پہ فلسفہ طرازی کر رہا ہو۔

آج ہم اتنا چلے تھے کہ ہماری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور مارے تکان کے آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ کل کا سفر بھی سامنے تھا اس لئے آدھی رات کے بعد، ہم اُٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے "پلاکا" کے علاقے کی تنگ غلیظ گلیاں طے کرتے ہوئے اپنے ہوٹل آن پہنچے۔

صبح جب ہم ہوٹل میں ناشتہ کر رہے تھے تو میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے صاف اور واضح۔ مجھے حیرت ہوئی۔

"ارے اتنی تھوڑی سی رفاقت پر جدائی کے یہ آنسو!" میں نے کہا۔

"نہیں تو۔۔۔ مجھے کچھ اور یاد آگیا تھا" اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"کچھ اور کی اور بات ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے ہنس دی اور مجھے اس پر سچ مچ ترس آنے لگا۔ رات ہی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ واقعی "ڈراپ آوٹس" میں سے تھی۔ عرصہ ہوا وہ گھر چھوڑ کر اپنے جیسے بہت سے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ سچائی کو کھوجنے نکلی تھی۔ وہ ملکوں ملکوں پھری تھی۔ اور اب اس نے ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کا دل ان کے ساتھ بھی نہیں لگتا تھا۔ اسے وہ بھی سب کمینے اور خود غرض لگتے تھے اور تب وہ تنہا ہی سیر سپاٹے کے لئے نکل گئی تھی۔ تھوڑے دن بعد اسے اپنی جیسی ایک اور لڑکی مل گئی اور ان دونوں کا ساتھ ہو گیا مگر وہ لڑکی بھی کمینی نکلی۔ جب بھی دو مرد ملتے وہ ان میں سے بہتر مرد سے دوستی کی خواہش مند ہوتی۔ اور ہمیشہ بدتر آدمی کو اس کے لئے چھوڑ دیتی۔ خواہ وہ آدمی اس میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہو۔ اس طرح ان کی لڑائی ہو گئی اور پھر راستے جدا ہو گئے۔ سہیلی کی بیماری کی بات من گھڑت تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس کی سہیلی بھی یہی من گھڑت کہانی ہر ایک کو سنا رہی ہو گی۔ اب وہ دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ کم از کم اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ بہن بھائی اور رشتے دار کہاں ہیں کہاں نہیں۔ مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ جی چاہا پوچھوں "مجھ سے شادی کرو گی؟" مگر میں نے خود پر بر وقت قابو پا لیا۔ میں یونان پر مقالہ لکھنے نکلا تھا۔ شادی تو میری منزل نہیں تھی اور رہا ہوں میں کھو جانا کبھی بھی میرا مشغلہ نہیں رہا۔ لمحاتی ترس کے بدلے شادی کا سودا یقیناً مہنگا تھا۔ ہاں البتہ اگر وہ میرا ساتھ دینا چاہتی تو میں چند دن اور اسے ساتھ لئے پھرنے کو تیار تھا مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس نے اب اپنی نئی زندگی کا آغاز ایک نئے

نوکری سے کیا تھا جسے وہ کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ شادی کی پیش کش کرنے کے بجائے میں نے اسے بتایا کہ دیکھا جائے تو میں بھی ایک طرح سے راندہ اپنے ملک سے بچھڑ کر دوسرے ملکوں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ مگر کوئی ملک مجھے پناہ نہیں دیتا پیار نہیں دیتا۔ وہ میری بات غور سے سنتی رہی مگر اس سلسلے میں اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

وہ بس سے جا رہی تھی، میں ہوائی جہاز سے۔ اس کی بس کی روانگی سے پہلے ہم بہت دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے۔ رخصتی کے وقت اس نے بڑی افسردگی سے اپنی آنکھیں جھپکیں۔ پھر ہنسی اور آخری پیار کر کے بس میں جا بیٹھی۔ جیسے ہی بس اسٹارٹ ہوئی مجھے ایک بہت ضروری بات یاد آئی۔ میں بھاگا ہوا اس کھڑکی کی طرف گیا جہاں وہ بیٹھی تھی۔ میں نے اچک کر اس سے کہا۔

"بات سنو، اپنا نام تو مجھے بتا دو" اتنے دن وہ چوبیس گھنٹے اس قدر نزدیک رہی تھی۔ کہ کبھی اسے نام سے پکارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

"ایملی، روزی یا نیلی" جو کچھ اس نے کہا بس کے شور میں میں نہ سن سکا۔

"اور تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

مگر بس آگے نکل چکی تھی اور میرا جواب دینا بے کار تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے سوچا تھا کہ اپنے قیاسات بتا کر میں اس سے اس کی جنم بھومی کا نام پوچھوں گا اور یہ بھی کہ مجھے وہ کس ملک کا رہنے والا سمجھتی ہے۔ مگر اب جب کہ وہ چلی گئی تھی یہ سارے سوال و جواب قطعی بے معنی تھے۔ میں نے موڑ پر غائب ہوتی ہوئی بس کو ہاتھ ہلایا اور اپنے ہوٹل کی طرف بڑھا تاکہ اپنا سامان نکالوں اور اس خوابوں کے جزیرے سے رخصت ہوں۔

آگ میں پھول

جہاز نے ایک دم زمین چھوڑ دی اور اوپر اٹھتا چلا گیا۔ شہزاد کو یوں محسوس ہوا جیسے یکلخت زمین نیچے سے سرک گئی ہو اور وہ ہوا میں معلق لٹکا رہ گیا ہو۔ وہ بیضوی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ مکان چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے سڑک پر بسیں اور کاریں اور ریلوے لائن پر جاتی ہوئی ریل گاڑی بچوں کا کھلونا سی دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز اونچا ہوتا چلا گیا اور جلد ہی ۲۵ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا۔ کھیتوں کے سبز چوکور ٹکڑے اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ صرف جنگل تھا اور دور افق پر آسمان اور زمین کی یک رنگ دھند میں برف پوش چوٹیاں۔ کہیں کہیں نیلے آسمان پر سفید اور سرمئی بادل جمے ہوئے تھے۔ جہاز کے نیچے بادلوں کے پرے کے پرے تیرتے ہوئے جا رہے تھے مگر وہ ان سے بہت نیچے تھے۔ اتنے ہی نیچے جتنے زمین سے وہ اونچے دکھائی دیتے تھے۔ ذرا دیر بعد زمین پر پھر ٹاٹوں کے شکل کے سبز، بھورے بڑے بڑے ٹکڑے نظر آنے لگے جن کو پگڈنڈی کی شکل کی بلمبی بلمبی لائن دو رنگ کاٹتی چلی جا رہی تھیں وہ ان سے تھوڑی ہی دیر محظوظ ہوا تھا کہ پھر سب کچھ بادلوں میں چھپ گیا یوں معلوم ہونے لگا جیسے بادلوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ بادل سفید سفید پھلکیوں کی شکل میں تھے جیسے نیلے سمندر میں جھاگ۔ اُفق پر زمین اور آسمان کا امتیاز مشکل تھا۔ صرف سفید نیلے آسمانی اور اُودے رنگوں کا امتزاج تھا۔ افق کے بعد نیلے رنگ کی چوڑی سی گوٹ تھی اور اس کے بعد گہرا اودا رنگ چھایا ہوا تھا جیسے کالی گھٹا گھر آئی ہو۔ نیچے کے منظر سے مایوس ہو کر شہزاد نے اندر دیکھا۔ زیادہ تر مسافر اخبار رسالوں میں محو ہو چکے تھے۔ جہاز میں سامنے ایک ہٹنے والا دروازہ تھا جس کے دوسری طرف

فرسٹ کلاس تھی۔ دروازے کے ایک طرف دیوار میں پلاسٹک کے کور میں لگے ہوئے انگریزی اور اردو کے چند رسالے اب بھی رکھے تھے سیٹوں کے اوپر سامان کا جو ریک تھا۔ اس پر چھوٹے چھوٹے دودھ کے جھاگ ایسے سفید تکیئے اور سبز کمبل باری باری بڑی نفاست سے سجے ہوئے تھے اسی وقت باریک ایڑی کے جوتوں پر کھنچی دو ہوائی میزبان لڑکیاں اندر آئیں اور ٹرے میں رکھے ہوئے جوس کے چھوٹے چھوٹے کاغذی گلاس مسافروں میں بانٹنے لگیں ایک نے شہزاد کے پاس بیٹھی ہوئی خاتون کے نزدیک آکر بہت مسکرا کر ٹرے آگے کی۔

"تو تھینک یوُرنی"

"بے بھی لو گل آج تو تم ہماری مہمان ہو" وہ دونوں ہنس پڑیں۔ خاتون نے ایک گلاس اٹھا لیا شہزاد نے بھی ایک گلاس لے لیا۔ ذرا دیر میں ایک اسٹیورٹ ٹرالی میں سگریٹ اور دوسرے گفٹ پیکٹ لئے ہوئے آیا۔ چیزیں دیتا اور پیسے وصول کرتا وہ ان کے نزدیک آیا۔

"ہیلو اشفاق"

"ہیلو گل"

"کیا حال ہے۔"

"ٹھیک ٹھاک، تم سناؤ مسافر کی حیثیت سے سفر میں لطف آرہا ہے کچھ۔"

"بہت"

"کچھ لوگی اپنی بیٹی کے لئے؟"

"نہیں شکریہ، اس کے لئے میں وہ گڑیا لئے جا رہی ہوں" اس کی انگلی کے اشارے پر شہزاد نے بھی ریک کی طرف دیکھا جہاں ایک بڑی سی گڑیا رکھی ہوئی تھی۔

"آپ کچھ لیجیے گا؟" اسٹیورٹ نے شہزاد سے پوچھا۔ شہزاد نے سگریٹ کے دو پیکٹ لئے اور وہ اپنی ٹرالی آگے بڑھا لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس

کی نارنجی ساڑھی کا پلّو کچھ ایسا سرسراتا ہوا گزرا کہ شہزاد کی آنکھوں میں قوس قزح سی لہرا گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور شہزاد کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں ۔ وہ اسٹیورٹ کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی ٹرے کے انبار میں سے ایک ایک ٹرے مسافروں کے آگے سجاتی اور کانٹے چھریوں کے پیکٹ ڈالتی چلی آرہی تھی ۔۔۔ آگے کی میز کھول کر ٹرے رکھتے ہوئے وہ مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو "مرے جا رہے ہو نا تعجب کے مارے"۔ پھر اس نے اپنی سیٹ کی میز کھول کر ایک سیٹ اس پر رکھا اور آگے چلی گئی سارے مسافروں کو ٹرے اور کانٹے چھریاں دینے کے بعد وہ آئی اور پھر اپنی جگہ جم گئی اب شہزاد سے رہا نہیں گیا۔

"بھئی مجھے ایک بات بتا دیجئے"، اس نے ایسے کہا جیسے کوئی ضدی بچہ اپنے کسی بڑے سے ہٹ کرتا ہے۔

"فرمایئے"، نہایت شیریں آواز میں جواب ملا۔

"آپ کو جہاز کا سارا عملہ کیسے جانتا ہے اور پھر آپ جہاز میں من مانی کرتی پھرتی ہیں"

"میں ایئر ہوسٹس ہوں"

"سچ مچ"

وہ صرف مسکرائی۔

"تو آپ ویسے کپڑوں میں کیوں نہیں ہیں؟"

"میں ڈیوٹی پر نہیں چھٹی پر ہوں۔ رنی اور مونا کو کام زیادہ تھا۔ میں ان کی مدد کرنے چلی گئی تھی۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں جا رہی ہوں؟"

"لندن اور پھر اٹلی"

"کیا آپ کی بیٹی اٹلی میں ہے"

"جی ہاں۔"

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ ایئر ہوسٹس بننے کے لئے غیر شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔"

"یکایک اس کی آنکھیں دھندلا گئیں، اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوا جیسے لمحوں میں اڑ کر وہ کہیں دور نکل گئی ہو۔

"لمبی کہانی ہے ہم — میرا مطلب ہے میں اور میرے شوہر علیحدہ ہو چکے ہیں۔"

"آہ بڑا افسوس ہوا۔ میرا مقصد ذاتی معاملات کریدنے کا نہیں تھا یونہی مارے تجسس کے پوچھ بیٹھا۔" وہ واقعی شرمندہ تھا۔

"کوئی بات نہیں" گل نے افسردگی سے کہا اس کے چہرے پر پہلی تازگی کی جگہ نئے کرب نے لی تھی۔ جانے ان جانے میں کتنے زخم کرید دیئے۔ میں نے شہزاد نے دکھ سے سوچا۔ لیکن اب اس کے دل میں پہلے سے بھی زیادہ کرید تھی اس کا جی چاہ رہا تھا اس خوبصورت نام والی حسین لڑکی سے پوچھے "وہ کون اندھا تھا جس نے آپ سے علیحدہ ہونا گوارا کر لیا۔ آپ کی بیٹی اٹلی میں کیوں ہے اور کیا وہ بھی آپ کی طرح خوبصورت ہے ظاہر ہے کہ وہ یہ باتیں نہیں پوچھ سکتا تھا۔ گل ابھی تک گم سم سی جانے کن المناک خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ شہزاد نے اسے دکھ کی دنیا سے نکالنے کے لئے کئی موضوع سوچے پھر سب رد کر دیئے۔ بالآخر ایک بے ضرر سے سوال پر اس کا دل ٹھٹکا۔ آپ کو اردو شاعری سے دلچسپی ہے اس نے اپنی گود کا رسالہ الٹ پلٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" گل نے ایسے کہا جس میں رسمی ہاں کے سوا بھی کچھ تھا۔

"ایک نظم سناؤں؟"

"سنائیے۔"

"عنوان ہے، ایئر ہوسٹس۔"

"آپ کی لکھی ہوئی ہے؟"

"جی نہیں"؟

"اچھا سنائیے"

شہزاد ٹھہر ٹھہر کر نظم پڑھنے لگا۔ گل بڑے غور سے سنتی رہی۔

شہر کی روشنیاں کرنِ آوارہ ہیں	نہ وہ ہوٹل کے دریچے نہ وہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطراف نہ رفتار کا گم نام سکوں	ہر گھڑی ساعتِ پرواز بنی جاتی ہے
سینکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہو گی زمیں	کہیں پٹرول کے مرکز کہیں سڑکوں کے غبار
تار کے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار	مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے
تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت	کہ مشینوں کی صدا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بظاہر غافل	تیری صورت تری غماز بنی جاتی ہے
ہمسفر انجنیں گرم کئے بیٹھے ہیں	تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے (زیدی)

"کیسی ہے؟"

"اچھی ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایئر ہوسٹس شاعر کے دل کا سب سے بڑا راز کیوں بنی جاتی ہے۔ کیا اتنے بڑے راز یوں چلتے پھرتے بن جاتے ہیں؟"

"یہ باتیں آپ کے سمجھنے کی نہیں اس سے پہلے جب میں اس نظم کو پڑھ رہا تھا تو میں شاعر سے متفق نہیں تھا میں سوچ رہا تھا کہ ضروری نہیں کہ ایئر ہوسٹس ہی دل کا سب سے بڑا راز بن جائے۔ یہ واردات کسی مسافر کی وجہ سے بھی گزر سکتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ نظم صحیح ہے۔

گل ہنس دی۔ ایسی کوئی اور لڑکی ہوتی تو برا مان جاتی۔ شہزاد نے دل میں سوچا۔ مگر ان لڑکیوں کو ہنسنے مسکرانے کی تربیت دی جاتی ہے، شاید یہ ہر بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔

"میں یہ رسالہ دیکھ سکتی ہوں۔"

"ضرور۔" گل رسالہ دیکھنے لگی اور شہزاد دھیرے دھیرے گنگناتا رہا۔ "تو مرا سب سے بڑا افسانہ بنی جاتی ہے۔ رسالہ دیکھتے دیکھتے دفعتاً اس نے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں ایک اخبار میں کام کرتا ہوں اور وہیں سے نکلنے والے اردو رسالے کا ایڈیٹر بھی ہوں "ستاروں سے آگے" کبھی دیکھا ہے آپ نے"؟

"جی ہاں میں یہ پرچہ اکثر پڑھتی ہوں"

"اس کا مطلب ہے آپ کو واقعی اردو ادب سے دلچسپی ہے"

"جی ہاں ایک زمانے میں ہمارے ہاں ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں میں نے بھی ایک نظم لکھی تھی "آگ میں پھول"

"بڑا پیارا عنوان ہے، وہ نظم آپ کے پاس ہو تو مجھے دیجئے میں اسے اپنے پرچے میں شائع کروں گا۔"

"نظم تو میرے پاس نہیں ہے اس کے کچھ ٹکڑے ذہن میں رہ گئے ہیں، کبھی فرصت میں اسے دوبارہ لکھنے کی کوشش کروں گی۔"

"آپ اسے ابھی یاد کر کے لکھئے" شہزاد نے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں سے کاغذ نکالا جس پر رسالے کا نام چھپا ہوا تھا اور کاغذ قلم اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ابھی؟ آپ تو حد کرتے ہیں"

"یہی سہی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نظم بہت خوبصورت ہو گی۔"

"آپ کو کیسے یقین ہے"

"بس، بعض باتوں کے جواز نہیں ہوا کرتے" لیجئے نا۔"

"قلم میرے پاس ہے کاغذ دے دیجئے۔ اس نے کاغذ لے لیا۔ کاغذ کے اوپر آگ میں پھول لکھ کر وہ نظم کے ٹکڑے اپنے ذہن میں دہرانے لگی اور شہزاد آنکھیں بند کر کے سیٹ کے اونچے تکیے سے سر ٹکا کر سوچنے لگا۔ وہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ کیا سچ مچ

ایک ایئر ہوسٹس اس کے پاس بیٹھی ہے جو اس کا سب سے بڑا ارمان بنی جا رہی ہے یا یہ محض اس نظم کا کرشمہ ہے۔ اچھی تخلیق کا جادو جو افسانے کو حقیقت اور حقیقت کو افسانہ بنا دیتا ہے۔

رات کو ایک اجنبی ملک کی اجنبی راہگذاروں پر کچھ دیر پھرنے کے بعد وہ سب پھر یکجا ہو گئے اب تک وہ بھی جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے کچھ کچھ مانوس ہو گئے تھے لمبا چوڑا سرخ و سپید پائلٹ، خوش لباس و خوش مزاج مسافر، سرخ فراک والی ایک بچی، سبز پوش ہوائی میزبان لڑکیاں سب ایک دوسرے کو پہچاننے لگے تھے۔ ایئرپورٹ کے ہوٹل میں رات کا کھانا کھا کر پائلٹ کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے وہ پھر اپنی اپنی جگہ آن بیٹھے جہاز میں دھیمے سروں میں نغمہ بجنے لگا۔ حفاظتی بند باندھنے کا اعلان ہوا اور پھر جہاز رینگنے لگا۔ رن وے کے دونوں کناروں پر سرخ بتیاں تھیں۔ تھوڑی دور جا کر جہاز رک گیا۔ پھر اس نے تیزی سے انجن اسٹارٹ کیا۔ پھر بھاگا اور یکلخت زمین سے اٹھ گیا ہوائی اڈے کی روشنیاں دور ہونے لگیں اور پھر سارے شہر کی اکٹھی روشنیاں ایسی خوبصورتی سے نظر آئیں کہ دل میں دیئے سے روشن ہو گئے۔ زرد سبز نیلے اور سرخ رنگ کی روشنیوں میں دیوالی کا سا سماں تھا شہزاد کا پلک جھپکنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اتنی دیر بھی نظر کو اس نظارے سے باز رکھنا گراں گذر رہا تھا۔ جہاز چلتا رہا۔ اس کی بلندی بڑھتی رہی۔ وہی روشنیاں یوں دکھائی دینے لگیں جیسے زمین پر کسی نے رنگ برنگی موم بتیاں جلا کر رکھ دی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ روشنیوں کا جمگھٹا دور ہوتے لگا جیسے پریوں کا خوبصورت شہر پیچھے ہٹایا جا رہا ہو۔ پھر وہ روشنیاں یوں نظر آنے لگیں جیسے کسی نے جلتی لکڑی مار کر زمین پر سرخ سرخ چنگاریاں بکھیر دی ہوں یا چولہے پر سے اتارنے کے بعد کوئی بڑا سا توا ہنس رہا ہو۔ شیشے سے ناک لگائے شہزاد باہر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ روشنیاں دور ہو کر اندھیرے میں ڈوب گئیں اور نیچے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایسا سیاہ اور گھمبیر اندھیرا کہ نیچے دیکھنے سے ہی ڈر معلوم ہونے لگا اب شہزاد نے اندر دیکھا۔ گل سفید تکیے

سے سر ٹکائے سو رہی تھی۔ اس کی پلکوں کے چھاج گالوں تک چھا رہے تھے آج تک وہ سوچتا آیا تھا کہ یہ مصور لوگ کتنے جھوٹے ہوتے ہیں کہیں دنیا میں اتنی خوبصورت عورتیں بھی ہوتی ہیں جو یہ بنا دیتے ہیں مگر آج اسے ہر مصور کی تصویر کا یقین آگیا تھا واقعی دنیا میں اتنی خوبصورت عورتیں بھی ہوتی ہیں کہ جب وہ برابر میں آنکھیں بند کئے بیٹھی ہوں تو جہاز کی اڑان خواب معلوم ہونے لگتی ہے اس نے بھی تکیئے سے سر لگا دیا۔ مگر نیند آتے ہوئے بھی وہ سونا نہ چاہتا تھا۔ کسی کی قربت کا یہ خوبصورت احساس کھونا نہ چاہتا تھا۔

نیند اور بیداری کی اس ملی جلی کیفیت سے جب وہ پوری طرح جاگا تو وہ اپنی منزل کے بہت نزدیک تھے۔ ایک میٹھی آواز مائک پر انہیں صبح بخیر کہنے کے بعد منزل پہ پہنچنے کی خوشخبری سنا رہی تھی۔ حفاظتی بیلٹ باندھنے اور سگریٹ بجھا دینے کی تلقین کر رہی تھی اس نے سب سے پہلے برابر کی سیٹ پر دیکھا۔ کہیں اس کی غفلت سے وہ قیمتی قربت کھو تو نہیں گئی۔ گل اپنی نارنجی ساڑی پر بیلٹ باندھ رہی تھی۔ اسے صبح کا سلام کرتے ہوئے اس نے بھی اپنی بیلٹ باندھی، پھر بیضوی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ صبح کاذب کے ہلکے اجالے میں ایئرپورٹ کی دورویہ روشنیاں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ "دیکھئے ہوائی اڈے کی روشنیاں کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔" شہزاد نے کہا۔ وہ دیکھنے کے لئے شیشے کی طرف جھکی۔ قوس قزح کے سارے رنگ دوبارہ اس کی آنکھوں میں بھر گئے۔ جہاز نیچے آگیا تھا کھڑکی میں سے آس پاس کی پہاڑیاں ہلکے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھیں چند سیکنڈ بعد وہ زمین پر ہوں گے۔ صرف چند سیکنڈ۔ مگر وقت ان چند سیکنڈ کے آنے سے پہلے ہی ڈوب گیا۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا۔ ایک ہیبت ناک شعلہ بلند ہوا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔

شہزاد نے آنکھیں کھولیں ذرا فاصلے سے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ جہاز کے جلے ہوئے ٹکڑے دور دور بکھرے پڑے تھے ان میں سے بعض اب تک جل رہے

تھے۔ بعض بعض سیاہ ڈھیر کی صورت تھے ہر طرف شور و غل اور آہ و زاری کا طوفان تھا وہ اُٹھا نزدیک ایک مسافر جہاز کے ڈھیر میں دبا پڑا تھا اس کا چہرہ جھلس گیا تھا اور وہ بُری طرح کراہ رہا تھا۔ شہزاد نے اسے ڈھیر سے الگ کیا اور ذرا فاصلے پر لے جاکر زمین پر لٹا دیا پھر وہ دوسرے مسافروں کی تلاش میں نکلا۔ وہ نارنجی ساڑھی کو ڈھونڈ رہا تھا مگر رنگ کھو گئے تھے ہر طرف سیاہی تھی یا شعلے تھے کیا اس کا حسین راز اتنا مختصر، اتنا جامع اس سیاہ وحشت میں اتنی جلد گم ہو گیا تھا۔ وہ ہر طرف پھرا، ہر طرف گیا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔ جہاں کوئی چیختا چلاتا یا زخمی مسافر دکھائی دیا۔ اس نے اسے گھسیٹ کر جلتے ملبے سے دور لٹا دیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ شاید وہ کسی اور کی مدد کر سکے۔ چیخ و پکار آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی اس کا ذہن سو رہا تھا جیسے کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ دیکھ کر کہ اب کوئی نہیں جسے وہ موت کے اندھیرے غار سے زندگی کی روشنی میں کھینچ سکے وہ خاموشی سے جلتے ملبے سے دور پہاڑیوں کے سائے میں ٹھنڈی زمین پر لیٹ گیا اس کے سوئے ہوئے ذہن میں اپنے ساتھیوں کے چہرے گھوم رہے تھے۔ گل کا حسین چہرہ جیسے کسی مصور کا شاہکار، لمبا چوڑا سرخ و سپید پائلٹ چست لباس میں چست و چالاک ہوائی میزبان لڑکیاں سرخ لباس والی پیاری سی بچی اور چاروں طرف بیٹھے ہوئے خوش باش و خوش پوش مسافر جو اتنی جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے اور خوش دلی سے ہنستے تھے اب سب سیاہ خوفناک ڈھیر میں جلی ہوئی لکڑیوں کی طرح بڑے تھے۔

نا معلوم کب تک یونہی پڑا رہا۔ صبح کاذب صبح صادق میں تبدیل ہو گئی۔ اندھیرا دبے پاؤں چلا گیا اور اس کی جگہ اسی طرح چپکے سے اُجالے نے لے لی۔ تارے ٹمٹماتے ٹمٹماتے جانے کب غائب ہو گئے تھے صرف مشرق میں صبح کا روشن ستارہ ابھی تک چمک رہا تھا ہوا میں خنکی تھی اور اداسی تھی اور وحشت تھی۔ زندگی بھر اس نے اتنی روکھی پھیکی بے تکی صبح نہ دیکھی تھی۔ شہزاد نے اپنے سر کو جھٹکا جیسے کوئی سوتا ہوا شخص

کسی برُے خواب سے چونک کر سر جھٹکتا ہے اور اٹھ بیٹھا مگر اُٹھ کر اس نے دیکھا۔ گرا ہوا جہاز، جلی ہوئی لاشیں جہاز اور سامان کے ٹکڑے اور مسافروں کے بکھرے ہوئے اعضاء خواب نہیں تھے اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔ ٹھنڈی چوٹ کے مانند یہ حقیقت اب زیادہ تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت گھر گھر کی آواز آئی۔ نئی صبح کے اُجالے میں ایک ہیلی کاپٹر اپنے پنکھ پھیلائے ان کے اوپر اڑ رہا تھا۔ پہاڑیوں اور جہاز کے ملبے کے درمیانی میدان میں وہ اترا۔ اس میں سے چند آدمی اُترے گھوم پھر کر جہاز کے سلگتے ملبے کو دیکھا۔ لاشوں کو دیکھا اور جہاز کے خوفناک حادثے سے بچ جانے والے مسافروں کو حیرت سے دیکھا۔ پھر آپس میں کچھ بات چیت کی۔ صرف وہی تھا جو زخمی نہیں تھا پہلے زخمی مسافروں کو ہیلی کوپٹر میں ڈالا گیا پھر اس سے آنے کے لئے کہا گیا۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے سے پہلے ایک موہوم امید کے سہارے اس نے اس سیاہ ڈھیر کے گرد چکر لگائے اور بار بار آوازیں کہ کوئی پکارے۔ ” مجھے بچاؤ مجھے نکالو میں مر رہا ہوں۔“ مگر خاموشی تھی۔ ہر طرف بھیانک سکوت اور سناٹا۔ مرنے والے مر چکے تھے اب کسی کو نہیں بچایا جا سکتا تھا۔ کوئی سرخ فراک نہیں تھی کوئی نارنجی آنچل نہیں تھا۔ کوئی سبز وردی نہیں تھی، کوئی سیاہ سوٹ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا، کچھ بھی نہیں تھا۔ یوں بہت کچھ تھا۔ ڈھیر میں جلا ہوا جو سامان تھا اس میں اب بھی کچھ چیزیں صحیح سلامت موجود تھیں۔ جیسے وہ مردہ مسافروں کے ڈھیر میں جوں کا توں موجود تھا ایک چکر اور۔ اب کے اس نے دیکھا نز دیک کی ایک جھاڑی میں بڑی سی ایک گڑیا اٹکی ہوئی ہے اس کی آنکھیں بند ہیں اس کے سنہری بال بکھرے ہوئے ہیں اور نزدیک ہی ایک کاغذ پڑا ہے شہزاد نے وہ کاغذ اٹھا لیا اور آنکھوں کے پاس لے جا کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا ”آگ میں پھول“

دُم

کئی ہزار گز لمبی سرنگ بنانی تھی۔ سرنگ ایک تھی جس کے دہانے دو مختلف ملکوں میں کھلتے تھے۔ بھورے بندر اپنے ملک میں سرنگ کھود رہے تھے اور کاسنی بندر اپنے ملک میں۔

کاسنی بندر چھوٹے چھوٹے برفانی بندر تھے۔ وہ سخت سردی کے عادی تھے وہ محنت کے عادی تھے اور ان کے ملک میں آسانیاں بھی تھیں۔ ان کے گھر سرنگ سے زیادہ دور نہ تھے اور راستہ بھی اتنا دشوار نہ تھا۔ اگر کبھی تھا تو اب انہوں نے یہ سرنگ شروع کرنے سے پہلے ایک چوڑی پختہ سڑک تعمیر کر لی تھی مگر دوسری طرف بھورے بندر پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے گھروں سے اتنے دور تھے کہ چار چار مہینے ان کو گھر والوں کا خط نہ ملتا تھا ان کا اپنی زمین سے کوئی رشتہ نہ رہا تھا ان کا کھانا بھی کاسنی بندروں کے ملک سے آتا تھا۔ ان کی وردی بھی کاسنی بندر مہیا کرتے تھے اور جب وہ بیمار پڑتے تھے تو ان کا علاج بھی سرحد پار کے ہسپتالوں میں ہوتا تھا۔ کاسنی بندروں کے پاس مشینیں تھیں۔ مگر بے چارے بھورے بندر اپنے پنجوں سے مٹی کھود کر سُوت سُوت بھر آگے بڑھ رہے تھے ان کے خیمے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پلیٹو میں لگے ہوئے تھے۔ شام کو جب وہ اپنے خیموں میں لوٹتے تھے تو کاسنی کھانا کھا کر سونے والے تھیلوں میں گھس کر اکثر سوچتے تھے آخر یہ سرنگ کیوں بنائی جا رہی ہے۔ نگران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا نہ ان کے ساتھیوں کو اس کا کچھ علم تھا کیونکہ وہ سب معمولی سپاہی بندر تھے جن کو بڑی بڑی باتوں کا علم نہیں ہوتا۔

چاروں طرف سفید دیووں کی طرح کھڑے ہوئے برفیلے پہاڑوں کے درمیان سفید خیموں میں سوئے وہ میدانوں کے خواب دیکھتے۔ ان کے گھر والے، ان کے بیوی بچے ان کے لئے

خواب ہوگئے تھے جو صرف خوابوں میں حقیقت بن کر آتے تھے۔ جاگنے میں صرف برف حقیقت تھی
جان لیوا سردی اور سرنگ کھودنے کا عذاب۔ میدان، کھلیان، پھول پھل، درختوں کے جھولے
گرمی، لُو، ان میں سے کسی چیز کا تصور بھی صاف نہ رہا تھا جیسے ان چیزوں کو کبھی خواب میں
دیکھا ہو اور وہ خواب بھی کسی اور جنم کے دیکھے ہوئے ہوں۔

ان بندروں کا افسر اور بندروں کی صحت کا محافظ ڈاکٹر رات کو ایک ہی خیمے میں سوتے
تھے اور ایک دوسرے کی ٹوٹی ہمت بندھانے کا کام بھی کرتے تھے۔ جب افسر کو اپنی بیوی
کی یاد ستاتی جسے وہ شادی کے بعد میکے میں یوں چھوڑ آیا تھا جیسے اب اس سے کوئی
واسطہ نہ رہا ہو، تو ڈاکٹر جو ایک نرم گرم خطے کا رہنے والا تھا اور افسر کی زبان اچھی
طرح نہ بول سکتا تھا۔ اپنے مضحکہ خیز لہجے میں ایک نظم گاتا:

چوہے پانچ تھے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار ایک چوہے کو بلی کھا گئی، باقی رہ گئے چار

بہت جلد ایک آخری چوہا رہ جاتا — جو بے چارہ شادی کر لیتا — اور یوں اس کی
بربادی ہوتی۔ ڈاکٹر جتنا ہنسانے کی کوشش کرتا، افسر اتنا ہی افسردہ ہوتا جاتا۔ یہاں
تک کہ بعض اوقات بھری چاندنی راتوں میں، جب برف پر چاندنی گرمیوں کی دوپہر کی
طرح چمکتی، وہ اپنا روئی بھرا اوور آل پہن کر باہر نکل جاتا اور ڈاکٹر کو اس کی صحت کی خاطر
خود بھی باہر جانا پڑتا اور جب گرم علاقے کے رہنے والے ڈاکٹر کو یہاں کی ٹھنڈ برداشت
سے باہر لگتی اور وہ بے بسی سے وصیت کرتا کہ جیسے بھی ہو اس کی نعش کو اس کے گرم دیس
میں پہنچا دیا جائے تاکہ اُس کے بیوی بچے سال بھر بعد کم از کم اس کی شکل تو دیکھ لیں،
تو افسر اسے مذاقاً دھمکاتا کہ جب تک وہ اسے آرڈر نہ دے کسی کو مرنے کا قطعی حق نہیں ہے
ان میں سے کتنوں کے دل کھڑے کھڑے یا بیٹھے بیٹھے ایسے ڈوب گئے تھے کہ پھر نہ اُبھرے
تھے۔ برفیلے قبرستان میں کتنے ہی ایسے سپاہیوں کی قبریں تھیں جن کے بیوی بچوں کو یہ بھی
نہیں معلوم تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

چند دن سے سننے میں آرہا تھا کہ ان کے سب سے بڑے دو افسر اس علاقے کا دورہ کرنے آرہے ہیں اور یہ لوگ بے چینی سے ان کی آمد کے منتظر تھے تاکہ اپنی مشکلات ان کے گوش گزار کر سکیں۔ آخر خدا خدا کر کے اطلاع آئی کہ وہ نیچے پڑاؤ پر پہنچ گئے ہیں۔ افسر نے بڑے افسروں کے پروگرام کو کچھ اس طرح ترتیب دیا کہ وہ کام کرنے والوں کی مشکلات کا زیادہ سے زیادہ اندازہ کر سکیں۔ ڈاکٹر بندرا اسے بار بار یاد دلا رہا تھا کہ اس کی تکلیفیں بھی ان کے گوش گزار کی جائیں۔ اس کے پاس دواؤں کی کمی تھی۔ نرس بندر باری باری بیمار ہو کر یا تو مر گئے تھے یا واپس بلا لئے گئے تھے اور پھر یہاں کے لوگوں کو ایک نئے مرض نے گھیر لیا تھا جو آناً فاناً آتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے کاسنی بخار کا نام دیا تھا اور اس کا کوئی علاج اس کے پاس نہ تھا۔

افسر کہتا "فکر نہ کرو تمہیں اپنی زبان سے سب کچھ کہنے کا موقع ملے گا۔ دو تین گھنٹے میں انہیں یقیناً تمہاری خدمات کی ضرورت پڑ جائے گی۔"

ایک صبح افسر اور ڈاکٹر اپنے رات کے کپڑوں میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ آسمان کی طرف سے گھرررر گھرررر کی آواز آئی۔ دونوں تیزی سے خیمے سے باہر نکلے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کے آسمان کو تکنے لگے۔ برفیلی چوٹی کے پس منظر میں ٹڈے جیسا ہیلی کوپٹر ہیلی پیڈ کو تلاش کر رہا تھا۔

"وہ آگئے" اب کیا ہوگا۔ ہیلی پیڈ پر کوئی جیپ بھی نہیں"، افسر بے حد سراسیمہ تھا"۔

"نچلے پڑاؤ والوں نے اطلاع کیوں نہیں دی، ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"وائرلیس خراب ہے اطلاع کیسے دیتے"

"تو انہیں بھیجا کیوں، انہیں معلوم ہے کہ دو گھنٹے میں تو یہاں جیپ اسٹارٹ ہوتی ہے"

"فوراً ایک جیپ اسٹارٹ کروائیے، ہیلی پیڈ پر جانے کے لئے اور جوانوں سے کہیں فوراً تیار ہو کر کام پر جائیں"

دوسری جگہ کام کا وقت ساڑھے سات تھا۔ یہاں کے حالات کے پیش نظر انچارج افسر نے نو بجے کا وقت مقرر کیا تھا جو بڑے افسروں کی نظر میں سراسر قابلِ تعزیر ہوگا۔ دونوں اندر آئے رات کے کپڑوں پر پتلون ملی جیکٹ چڑھائی، زپ کھینچی، سر پہ ٹوپی رکھی جوتے پہنے اور وہ تیار تھے خدا کا شکر ہے کہ یہاں وردی میں چمکانے کو تارے اور تاج نہیں تھے نہ بکل والی بلیٹ تھی نہ ہاتھ کی لکڑی ہیلی کاپٹر فضا میں چکر لگائے جا رہا تھا۔ شاید اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہیلی پیڈ پر ان بڑے افسروں کے استقبال کے لئے کوئی بھی نہیں ہے۔

یوں تو جیپوں کے اڈے کے آگے بورڈ لگا تھا کہ سگریٹ پینا منع ہے لیکن اس وقت جلد جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں ایک جیپ کے نیچے ایک چھوڑ دو دو مشعلیں جلائی جا رہی تھیں۔ مگر وہ کم بخت ٹس سے مس نہ ہوتی تھی سنگ دل سرد جان جیپ۔ اسے کیا معلوم کہ بڑے لوگوں کو کوئی لینے نہ پہنچے تو ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ وہ جیپ کا EXPLANATION CALL نہیں کرتے نہ موسم سے ہر وقت بلو زیرو رہنے کا سبب دریافت کرتے ہیں۔ نزلہ تو چھوٹے افسروں پر گرتا ہے۔ ہیلی کاپٹر نے ایک اور چکر لگایا یا وہ اس سے زیادہ چکر نہیں لگا سکتا اب اتر جائے گا۔ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر جب وہ اتریں گے چاروں طرف برف ہی برف دیکھیں گے، ان کو سانس لیتے ہوئے تکلیف محسوس ہوگی اور کوئی ان کے پاس نہ ہوگا تو ان کی کیا حالت ہوگی، انچارج افسر کو اس کا اندازہ تھا۔ بڑی مشکل سے جیپ چلنے پر آمادہ ہوئی۔ افسر نے اپنے جوانوں کو اس میں بٹھایا اور تیزی سے جیپ دوڑا دی۔

ہیلی کاپٹر اتر چکا تھا اور دونوں بڑے افسر مع پائلٹ یوں کھڑے تھے جیسے کسی سنسان جزیرے میں تین تباہ حال مسافر۔ جیپ رُکی، سب اترے۔ دونوں پاؤں ایک ساتھ جوڑ کر دونوں ہاتھ سر پہ رکھ دیئے یہ ان کا سیلوٹ تھا۔ ہیلی کاپٹر سے اتار کر آکسیجن سلنڈر ان کے پاس لائے گئے تو بڑے افسر نے چھوٹے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دونوں نے

اطمینان کا سانس لیا۔ پہلے بڑے نے نالی کا منہ اپنی ناک پر رکھ کر دو تین "پف" لئے چھوٹے نے بھی تین چار کش لئے اور آکسیجن بردار ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

سنگ کے انچارج بندر نے پہلے معذرت کی ان کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اس لئے افسروں کو انتظار کرنا پڑا۔ چار قدم چل کر جیپ میں بیٹھنے سے دونوں بڑے افسروں کے سانس پھول گئے تھے اور وہ حیران ہو گئے تھے کہ یہ کیسی جگہ ہے۔ یہاں پر عرصے سے رہنے والے اور آکسیجن کی کمی کے عادی بندر ان کی اس کیفیت سے لطف اٹھا رہے تھے۔ آکسیجن کے چند گھونٹ اور لینے کے بعد انہوں نے اپنا پروگرام پوچھا۔ پروگرام یعنی انسپکشن کئی گھنٹے کا تھا اور آخر میں ان کے خیمے میں ڈاکٹر کی آمد بھی تحریر تھی بڑے افسر کا چہرہ اتر گیا۔

"ہمارے پاس صرف آدھ گھنٹے کی آکسیجن ہے" چھوٹے افسر نے یاد دلایا۔

"ہم اس سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے" بڑے نے کہا۔

"جوان بہت دنوں سے آپ کی آمد کے منتظر ہیں" سنگ کے انچارج نے کہا "وہ ایسے خوش ہیں جیسے عید آ رہی ہو۔ جب سے آپ کے آنے کی خبر سنی ہے۔ سنگ اتنی تیزی سے بن رہی ہے کہ میں حیران ہوں"

"کتنی دور ہے سنگ؟"

"چار میل"

"چار میل جانا، چار میل آنا، خطرناک راستہ، مفت کی دردسری۔ بڑے افسر نے دل ہی دل میں حساب لگایا "نہیں وہاں نہیں جا سکتے۔" بڑے افسر نے فیصلہ سنا دیا۔

"وہ سخت ناامید ہوں گے" انچارج نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی۔

"مجبوری ہے"

انہیں خیموں میں لایا گیا۔ گرماگرم چائے پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ زبانی کاموں کی کیفیت اور سپاہی بندروں کی حالت پوچھتے رہے۔

"جوان خوش ہیں ؟" آخر انہوں نے پوچھا

کیا انہیں بتا دے ـــ کیا انہیں بتا دے ۔ کیا ایسی جگہ کوئی خوش رہ سکتا ہے جہاں مرنے میں لمحہ بھر بھی نہ لگتا ہو، جہاں پنجوں سے زمین کھودنی پڑتی ہو۔ جہاں وہ خود آدھ گھنٹے سے زیادہ کسی صورت ٹھہرنے کو تیار نہیں ۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں، جوان خوش ہیں ؟"

"خوش ہیں سر" یہ وہ جواب تھا جو وہ سننا چاہتے تھے چھوٹی چھوٹی شکایتیں سن کر ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے، چھوٹی شکایتیں چھوٹے افسروں کے لئے ہوتی ہیں بڑے افسران کے لئے بڑے دل خوش کن جواب ہوتے ہیں ـــ "ہر کام بہترین طریقے پر انجام پا رہا ہے ۔ بندر سمجھ رہے ہیں کہ یہاں پکنک پر آئے ہوئے ہیں ۔ سُرنگ کو ہاتھ لگاؤ تو وہ خود بخود بنتی چلی جاتی ہے ۔ بیماری کا تو کوئی سوال ہی نہیں ۔ رہی ٹھنڈ کی زیادتی یا آکسیجن کی کمی تو سپاہی بندروں کو ان سے مطلب !ـــ"

"ہم تھوڑی دیر آرام کریں گے"، بڑے افسر نے کہا ۔

"آئیے آپ کے خیمے کئی دن سے تیار ہیں"، دونوں کے خیمے ان کو دکھائے گئے جن میں حتی الامکان آرام و آسائش مہیا کی گئی تھیں ۔ یہاں تک کہ بطور سجاوٹ مار کر پولو بھیڑ کے سر دروازوں پر لٹکائے گئے تھے اندر آگ کے شعلے گرمی کا احساس دلا رہے تھے یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے خیموں سے رہی سہی آکسیجن بھی ختم کر دی تھی ۔ آکسیجن آنے ان کے ساتھ آئے اور وہ اپنے خیموں میں الگ الگ آرام کرنے کے بجائے ایک ہی خیمے میں بیٹھ گئے ۔

"پورے آدھ گھنٹے بعد روانگی" بڑے افسر نے اطلاع دی ۔

"آل رائٹ سر"، انچارج افسر نے کہا ۔

دفعتاً بڑے افسر نے دیکھا آکسیجن لانے والے بندر سپاہیوں نے دستانے پہن رکھے ہیں ۔ بڑے افسروں کے سامنے دستانے پہننا یقیناً بدتمیزی تھی ۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے دستانے کی طرف اشارہ کر کے تلخی سے پوچھا۔ بندر سپاہی سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ جواب دینا سراسر گستاخی تھی۔

"سر! ہمارے پاس نہ بارود ہے نہ مشینیں۔ بے چارے ہاتھ سے سرنگ کھودتے ہیں اس لئے ان کے ہاتھ —" افسر انچارج نے بندر سپاہی کو دستانے اتارنے کا اشارہ کیا۔ خون آلود، سوجی، زخمی آدھی پونی انگلیاں دیکھ کر دونوں افسران نے کراہت سے منہ پھیر لئے بڑے افسر نے منہ دوسری طرف کئے کئے انہیں دستانے پہننے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر جانے لگے تو افسر نے انہیں پھر ٹوکا۔

"تم سیلوٹ کرنا بھول گئے ہو؟"

"نہیں سر!" انہوں نے دونوں پاؤں مار کر ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سر پہ رکھ لئے۔

"ویری پوور ڈسپلن" بڑے افسر نے خفگی سے انچارج افسر کی طرف دیکھا۔

"سر! ایسی حالت میں ڈسپلن رکھنا بڑا مشکل ہے۔ جنگ سے بھی مشکل — جنگ میں جذبہ تو ہوتا ہے یہاں تو وہ بھی نہیں اور تکلیفیں ہی تکلیفیں"

"کیا تکلیف ہے یہاں؟" بڑے صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"سر! بڑی ڈفی کلٹ کنڈیشنز ہیں۔ جب جوان میدان سے آتے ہیں تو تین دن میں جکر اور الٹیاں یہ حال کر دیتی ہیں کہ ان کو اپنے مرنے کا یقین ہو جاتا ہے۔ سب کے وزن آدھے ہو گئے ہیں۔ دل کی یہ حالت ہے کہ میں ابھی آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور ہوسکتا ہے دو منٹ بعد ختم ہو چکا ہوں" بڑے صاحب کانپ گئے جیسے اس کا اشارہ دراصل خود ان کی طرف ہو۔ "اسی لئے میں نے ڈسپلن جان بوجھ کر کمزور کر دیا ہے تاکہ بڑے چھوٹے کا احساس نہ رہے۔ ایسے حالات میں بڑے چھوٹے کا یہ احساس بڑا خطرناک ہوتا ہے سر! اکا دکا قتل اور میوٹنی ان کے لئے بڑی بات نہیں رہتے۔"

"مگر۔ مگر ان کی دُم!" بڑے افسر نے دیکھا کہ باہر جاتے ہوئے بندر جوانوں کی دُم بھی غائب

ہے اور اب جو اس نے غور کیا تو دُم نہ انچارج افسر کی تھی نہ اس کے نائب کی اور بڑی بات یہ تھی کہ بغیر دم کے کاسنی بندروں کی گرم وردی میں یہ دونوں خود ان بڑے افسروں سے کہیں زیادہ اسمارٹ لگ رہے تھے دفعتاً انہیں بل کھاتی اپنی لمبی سی دم سے بڑی گھن آئی مگر یہی دم تو ان کی بڑائی کا نشان تھی اسی دم پہ تو ان کے نشان چمکتے تھے۔ دم کٹوا کر ان لوگوں نے اپنی نشانیاں ہی کھو دی تھیں۔

"میں پوچھتا ہوں تمہیں دم کٹوانے کا کیا حق تھا"

"دُم سر——!" انچارج افسر نے کہا "ہمارے کاموں میں بڑے رخنے ڈالتی تھی۔ جب یہ سرنگ بننی شروع ہوئی ہے تو ہم جوانوں کی کمر میں رسی باندھ کر انہیں پہاڑ سے لٹکاتے تھے کہ وہ بیچ پہاڑ سے کھدائی شروع کریں۔ ایسے میں دُم جھاڑیوں میں اٹک جاتی تھی اور بعض دفعہ سپاہی بندر ہزار فٹ نیچے بہنے والے دریا میں گر جاتے تھے۔"

"ہزار فٹ؟"

"جی ہاں جہاں سے ہم نے سرنگ شروع کی ہے وہاں سے دریا پورے نو سو فٹ نیچے تھا"

"تو نو سو فٹ کہو، ایسی غلطیاں میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"سوری سر!—— اور اب بھی سرنگ بنانے میں دم کی وجہ سے بڑی دقت پیش آتی تھی کیونکہ جو کاسنی وردیاں ہمیں ملی ہیں ان میں دم کے لئے کوئی پروویژن نہیں ہے۔ اگر ہم سوراخ کر کے اس کے لئے جگہ بنا بھی لیں تو وہ سردی میں ٹھٹھر کر——"

"شٹ اپ" دفعتاً بڑا افسر گرجا "یہ کوئی عذر نہیں ہے۔ اس بہانے تم اپنی الگ فوج بنانا چاہتے ہو۔ تم بادشاہ بن کر رہنا چاہتے ہو، تمہارا کورٹ مارشل کیا جائے گا۔"

"چھوٹا افسر تھر تھر کانپنے لگا مگر انچارج افسر پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ ذرا سی ڈانٹ سے بڑے افسر کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ اپنے گھر سے سینکڑوں میل دور ان پہاڑوں کے کٹورے میں بند تھے۔ پندرہ ہزار فٹ اونچا یہ ہیلی پیڈ اور اس پہ کھڑا ہوا ہیلی کوپٹر ان

کے اور تہذیب کے درمیان واحد اور آخری رشتہ تھا اور یہ کمبخت سارے بندر تہذیب سے اتنی دور رہ کر وحشی ہو گئے ہیں۔ ڈسپلن بھول گئے ہیں۔ کہیں انہوں نے کوئی ایسی ویسی حرکت —— نہیں، نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ لاکھ جنگلی ہو گئے ہوں مگر اب اتنے بھی نہیں کہ اس جیسی بڑی ہستی کے ساتھ ——

یکایک بڑے افسر کو یاد آیا۔ کہ ایک بہت ضروری بات جو وہ کہتے اتنی دور آئے تھے بھول ہی گئے ہیں۔ یہ وہ ہدایت تھی جس کا سرچشمہ ان سے بھی بہت بلند ایک بلندی تھی۔

"نائب انچارج کو بلاؤ۔" انہوں نے کہا۔ جس کا مطلب تھا کھڑے کھڑے انہوں نے نائب کو انچارج کی جگہ بخش دی تھی۔ انچارج بندر کو قعر مذلت کی کن گہرائیوں میں جانا تھا اس کا اندازہ کرنے والے اب بھی کر سکتے تھے۔ نائب اندر آ کر اس زور سے اُچھلا اور دونوں ہاتھ اس زور سے سر پر مارے کہ خیمے کے در و دیوار ہل گئے۔ اس اسمارٹنس پہ بڑے صاحب کا دل باغ باغ ہو گیا۔

"دیکھو! تم لوگوں کی رائفلیں کہاں ہیں؟" بڑے افسر نے پوچھا۔

"کوٹ میں"

"ان کو نکالو —— اور تیار کر کے رکھو۔ یاد رکھو۔ جو آج دوست ہیں ضروری نہیں کہ کل بھی دوست رہیں۔ تمہیں اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے کیونکہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔"

"رائٹ سر۔" نائب نے ایک اور زوردار سلیوٹ داغا۔

دفعتاً خیمے میں ایک بے ہنگم قہقہہ گونجا "کس سے ڈر رہے ہو ہمیں؟ جو ہمیں کھانا دیتے ہیں، جو ہمیں کپڑا دیتے ہیں جو ہمارے بیماروں کی تیمارداری کرتے ہیں" دروازے پر انچارج بندر ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا اطمینان سے قہقہے لگا رہا تھا "ہمیں ان سے کوئی ڈر نہیں بڑے صاحب! نہ انہیں اپنی گولیاں ہمارے سینوں پہ خالی کرنے کی ضرورت ہے وہ اگر

ہمارا کھانا بند کر دیں تو ہم سب چوہوں کی موت مر جائیں گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ ہمیں تو تم سے ڈر ہے، تم جو اپنے جوانوں کی زخمی انگلیاں دیکھ کر کانپ جاتے ہو اور اپنی جانِ عزیز کی خاطر ان ہزاروں لوگوں کو ایک نظر بھی نہیں دیکھتے جو نہ جانے کب سے تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے منتظر ہیں کہ کب ہمارے بادشاہ سلامت آئیں اور ہمارے سارے دکھ درد دور ہو جائیں سمجھے، ہمیں تم سے ڈر ہے تم سے" اس نے آگے بڑھ کر بڑے افسر کے سینے پر انگلی رکھ دی۔

"شٹ اپ۔" بڑے صاحب گرج کر پیچھے ہٹے اور وہ پیٹ سے اوندھے منہ زمین پر گرا۔

"کاسنی بخار"، نائب نے کہا۔

لمحوں کے اندر دو بندروں کو بلوا کر نائب نے اس کو ڈاکٹر کے خیمے میں بھجوا دیا۔ اس کی تیزی اور پھرتی سے بڑے صاحب بہت خوش ہوئے۔

"آج سے تم اس کی جگہ کام کرو گے، ہیڈ کوارٹرز سے آرڈر پہنچ جائیں گے"

نائب نے خوش ہو کر اس زور سے سر پر ہاتھ مارے کہ سر جھنا اٹھا۔

"آدھ گھنٹہ کب کا گزر چکا تھا۔ آکسیجن کی کمی کے ڈر میں کاسنی بخار کا خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔" "اب چلنا چاہیئے"، بڑے افسر نے کہا۔

"رائٹ سر"، چھوٹے افسر نے کہا۔

وہ تینوں جیپ کی طرف جا رہے تھے کہ ڈاکٹر بندر بھاگا ہوا آیا۔ کبھی مارسیلوٹ کے بعد اس نے چھوٹے صاحب کی طرف دیکھا وہ ذرا سے پیچھے رہ گئے۔

"ویل"، انھوں نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"انچارج افسر کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے آپ انہیں اپنے ساتھ نیچے لیتے جائیں"

"پاگل بندر کو اپنے ساتھ؟ امپاسبل"

"اچھا تو ایک اور مریض ہے۔ اس کا نیچے جانا بھی بے حد ضروری ہے جب کسی ہیلی کاپٹر

کے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ کاسنی ہسپتال والے اسے ہار پھول پہنا کر رخصت کر دیتے ہیں مگر ہیلی کاپٹر والے اسے ہمیشہ چھوڑ جاتے ہیں۔ اب کے اس نے ہسپتال واپس جانے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ یہیں ایک خیمے میں پڑا ہے۔ اگر بیچے نہ گیا تو یقینی مر جائے گا۔"

"واٹ اے پٹی ——— اسٹل دی کانٹ ٹیک ہم"، واپس پہنچتے ہی کوئی بندوبست کریں گے۔"

"جب تک اس کا زندہ رہنا مشکل ہے"

"کانٹ ہیلپ۔"

"ایک اور مریض ہے"

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"وہ ٹی بی کا مریض ہے۔ سوچیئے کہ اپنے ہاں کے کسی ڈاکٹر کو اس کی بیماری کا پتہ نہ چلا اور اسے یہاں بھیج دیا۔ اتنی سردی اس کے لئے سخت مضر ہے۔ اس کے علاوہ سرحد پار کا ملک اس بیماری سے پاک ہے اگر ہم اسے وہاں بھیجیں تو یہ ہمارے لئے شرم کا مقام ہے۔"

"کوئی بات نہیں فی الحال وہیں بھیج دو اس کو بھی۔ انچارج کو بھی اور تیسرے مریض کو بھی۔ اس سے کہہ دو کہ بار بار ہار پھول پہننے میں ایسی کوئی برائی نہیں سمجھے۔"

"یہنز سر۔" ڈاکٹر بندر نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

دفعتاً بڑے صاحب کے گروپ میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ نائب نے ڈاکٹر کو آواز دی جیپ ڈرائیور جو اس وقت سے جیپ کو اسٹارٹ رکھنے کی کوشش میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ کھڑے کھڑے گر پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا۔ یہ بڑی سرنج بھری اور وہیں برف پر پڑے پڑے بے سدھ مریض کے دل میں گھونپ دی پھر اسے اٹھوا کر خیمے میں لے گیا۔ بڑے صاحب نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

"یہ کیا انتظام ہے یہاں پینتالیس منٹ ہو گئے ہیں ہمیں"

"میں دوسرے ڈرائیور کو بلواتا ہوں"، نائب خود دوڑتا ہوا ڈرائیور کو بلانے

گیا۔ سینتالیس منٹ سے جیپ کا انجن برابر چل رہا تھا۔ دونوں بڑے افسران اپنے اپنے آکسیجن آلے لے کر بیٹھ گئے اور اس میں منہ ڈال کر سانس لیتے رہے۔ برف اور مٹی کاٹ کر سرنگ بنانے والے اپنے زخمی پنجوں کے ساتھ تیزی سے کام کر رہے تھے۔ بڑے افسر کا ہیلی کاپٹر نیلی فضاؤں سے زمین پر اترتے انہوں نے دیکھا تھا بس اب وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان کا کام دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے اور خوش ہو کر پوچھیں گے "مانگو کیا مانگتے ہو" اور تب وہ اپنی ساری مشکلات ان کو بتا دیں گے۔

دفعتاً پہاڑوں میں گھرررگھرررر کی آواز گونجی اور ٹڈہ سا ہیلی کاپٹر ان کے سروں سے بہت اوپر اڑتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سپاہی بندروں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے!!! سرنگ بہت لمبی ہے ان کی زندگیوں میں تو نہیں ہاں ان کے بچوں یا پھر بچوں کے بچوں کی زندگی میں شاید بن ہی جائے۔

عجیب و غریب چشمہ

شروع میں تو چیزیں کچھ اوپر تلے نظر آئیں۔ چشمہ بنانے والے نے کہا۔ "بائی فوکل ہے چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" کچھ دن میں چیزیں تو ٹھیک نظر آنے لگیں مگر رنگین حروف اور رنگین تصویریں اوپر نیچے اور دور و نزدیک ہو کر سہ بُعدی تاثر دیتی رہیں۔ معمولی الفاظ اور بے ڈھب تصویریں اتنی خوبصورت معلوم ہوتیں کہ چشمہ ٹھیک کروانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا اس چشمے کی وجہ سے میری سادہ زندگی میں رنگینی آ گئی تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی سالوں پرانی پینٹنگز ایکا ایکی بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔ پہاڑ خود بخود پیچھے ہٹ گئے تھے۔ بڑے درخت نزدیک اور چھوٹے درخت دور کھڑے نظر آتے تھے۔ دریاؤں میں روانی آ گئی تھی یوں لگتا تھا کہ دریا میں ہاتھ ڈالا نو ہاتھ بھیگ جائے گا اور پتھروں پر جمی ہوئی کائی کو چھوا تو وہ انگلیوں سے چمٹ جائے گی تصویری بھیڑیں جو اب تک کب کی مر کھپ چکی ہوں گی۔ یوں کلیلیں بھرتی نظر آتیں کہ چاہوں تو ابھی گود میں بھر لوں اور ان کی اون کی گرمی ہاتھوں کے پوروں میں محسوس ہو۔

رفتہ رفتہ یہ محسوس ہونے لگا جیسے دنیا پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی ہے رنگ میرے بچپن کے رنگوں سے بھی زیادہ حسین اور شوخ ہو گئے۔ سادہ کپڑوں کے پرنٹ سہ بُعدی کیفیت کے ساتھ ہزار رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے۔ دکانوں کے سائن بورڈ اور کار کی نمبر پلیٹ تک پینٹنگز کی طرح دلکش دکھائی دیتے۔ پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے لوگ پہلے سے زیادہ حسین اور بشاش ہو گئے ہیں ان کی آنکھوں میں افسردہ جھلک کی جگہ خوشگوار سی چمک نظر آتی۔ کوئی بھی اجنبی نہ لگتا جیسے سب سے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ

کہیں ملاقات ہو چکی ہو۔ بات اتنی بے تکلّفی سے شروع ہو جاتی ہے کہ مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی کہ ہم کب اور کہاں ملے تھے۔

اب وہ چشمہ ہر وقت میری آنکھوں پر لگا رہتا۔ اُسے اُتار کر زندگی کو بے رونق اور بے مزہ کرنا مجھے منظور نہ تھا جب اسے صاف کرنا ہوتا تو میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا تاکہ مجھے کچھ نظر نہ آئے۔ رفتہ رفتہ لوگ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت نیک اور اچھے لگنے لگے۔ کوئی مجھ سے زمانے کا گلہ کرتا، دوستوں کی شکایت کرتا تو مجھے یقین نہ آتا۔ سب ہی نہایت پیارے اور معصوم دکھائی دیتے۔ احباب کے ساتھ ہمدردی نہ کرتا تو وہ چڑنے لگتے اور کہتے۔

"احمقوں کی جنت میں رہتے ہو، آنکھیں کھول کر دیکھو اور کان کھول کر سنو تو پتا چلے کہ دنیا کیا ہے۔ خود تمہارے بارے میں لوگ کیا کیا کہتے ہیں۔ وہ مجھے میرے بارے میں کہی ہوئی باتیں بتاتے مگر مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ جن باتوں کو سن کر شاید پہلے میں کھول اُٹھتا اور ان کی اور اپنی جان ایک کر دیتا انہیں سن کر اب صرف مسکرا دیتا۔ یوں محسوس ہوتا کہ اول تو میرے بارے میں یہ بات کہی ہی نہیں گئی ہو گی اور اگر کہی بھی گئی ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب کسی کے کہنے سے میں بہتر یا بدتر نہیں ہو سکتا تو اپنی جان گھلانے اور دوسروں کی جان خبق میں کرنے سے حاصل!

اور پھر یوں ہوا کہ لوگ مجھے واقعی اچھا سمجھنے لگے۔ وہ جو دوسروں کی شکایت مجھ سے کرتے تھے اور خلقِ خدا کے غائبانہ طعنے مجھے سناتے تھے اب برملا کہتے تھے "فلاں تمہاری بہت تعریف کر رہا تھا،" لیکن اب ان تعریفوں کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ کیا کسی کی تعریف کرنے سے میں واقعی اچھا ہو جاؤں گا؟ نہیں، تو پھر خوش ہونے سے فائدہ! دیکھتے دیکھتے مشہور ہو گیا کہ میں کوئی سینٹ یا ولی ہوں۔ لوگ میرے پاس دعائیں کروانے آنے لگے۔ ضرورت مند چاہتے میں انہیں پڑھا ہوا پانی دوں تاکہ ان کے ناقابلِ علاج مرض ٹھیک ہو جائیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ان پر جادو ٹونا کیا گیا ہے میں اس

کا توڑ بتاؤں۔ جان عجب مخمصے میں تھی۔

آخر ایک دن میں اسی دوکاندار کے پاس گیا جس نے میرا چشمہ بنایا تھا اور اس سے کہا۔

"مجھے ایسے بہت سے چشمے بنا دو۔"

"کتنے ۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"سینکڑوں، نہیں ہزاروں، بلکہ جتنے تم بنا سکو۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا "کیا کیجئے گا اتنے چشموں کا۔؟"

"میں ان چشموں کو بانٹوں گا ضرورت مندوں میں۔"

"کون سے ضرورت مند..... آپ کو معلوم ہے ایک شخص کا چشمہ دوسرے کے نہیں لگ سکتا۔ میرا چشمہ آپ لگائیں گے تو آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا، آپ کا چشمہ میں لگاؤں گا تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔"

"مگر میں تو اس چشمے کی بات کر رہا ہوں جو تم نے مجھ کو بنا کر دیا تھا اور جس سے ساری چیزیں زیادہ بہتر اور حسین تر نظر آتی ہیں، اسے تو سب ہی لگا سکتے ہوں گے؟"

"ذرا اتار دیجئے، میں دیکھوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں اسے اتار نہیں سکتا۔ میں نے برسوں سے اسے نہیں اتارا ہے۔"

"آپ دیجئے تو۔" اس نے اصرار کیا۔

میں نے اسے چشمہ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اس کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"ذرا دیکھو تو" اس نے کہا "بالکل معمولی چشمہ ہے۔ نمبر میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ مجھے اس سے چیزیں زیادہ خوبصورت نظر آتی ہیں۔"

"لاؤ میں لگا کر دیکھوں۔" کسی نے کہا۔ ذرا دیر بعد آواز آئی۔ "کچھ بھی نہیں سب کچھ ویسے کا ویسا ہے" پھر کسی نے آواز دبا کر کہا "سڑی ہے، کسی ماہر نفسیات کے پاس بھیج دو۔"

"وہاں یہی کرنا پڑے گا۔" دوکاندار نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ صاحب آپ اچھے خاصے سمجھدار آدمی ہیں۔ آپ کو عرصے سے جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی ذہنی دباؤ کی وجہ سے آپ پر یہ اثر ہو۔ میری رائے یہ ہے کہ کسی ماہر نفسیات کے پاس چلے جائیے۔"

"آپ کے مشورے کا شکریہ۔ یہ میری عینک؟"

"یہ اب آپ کے لئے بے کار ہے، آپ اس سے دیکھ ہی نہیں رہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ تو کسی اور ہی دنیا میں پہنچے ہوئے ہیں جناب" اس کے لہجے میں طنز بھی تھا اور تضحیک بھی۔

"جنت الحمقاء؟" میں نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لیجئے۔ اب آپ کو عینک کے بغیر بھی وہی کچھ نظر آئے گا جو اس عینک سے نظر آتا تھا۔ لیجئے آپ کی عینک میں نے کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ اب آپ آنکھ کھولئے اور دیکھیے۔"

مگر میں نے آنکھ نہیں کھولی۔ اس نے کہا "آپ کا علاج یہی ہے کہ آپ کسی ماہر نفسیات کے پاس چلے جائیں۔"

میرا ماہر نفسیات کے پاس جانے کا تو کوئی ارادہ نہیں مگر میں نے آج تک اس ڈر سے آنکھیں ہی نہیں کھولیں کہ کہیں سب کچھ پہلے جیسا نظر نہ آنے لگے۔ میں اتنی بدنظمی اور بدصورتی اب برداشت نہیں کر سکتا۔

آنکھ کا کانٹا

آخر تنگ آکر اماں نے احمد بابو کو بلوا بھیجا۔

یہ بے چارے پاکستان بننے پر جب اس محلے میں آباد ہوئے تھے تو لونڈوں میں شمار کئے جاتے تھے لیکن اب سنٹرل گورنمنٹ میں کلرک ہو کر اچھے خاصے احمد بابو بن گئے تھے اپنے لانبے تاڑ سے جسم پر چھوٹا سا سر اور چہرہ نہایت بردباری سے اٹھائے پھرتے تھے ان کے جھکے ہوئے کندھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ چیف کورٹ بلڈنگ کی (جہاں وہ کام کرتے تھے) ساری فائلوں کا بوجھ اس ترازو سمیت جو اس عمارت کی پیشانی پر لٹک رہا ہے۔ احمد بابو کے کندھوں پر دھرا ہے وہ خالص بابویانہ انداز میں چست جسم پر لپٹا ہوا سوٹ پہن کر باہر نکلتے تھے اور خاص خاص موقعوں پر ٹائی بھی لگاتے تھے۔ پورے محلے کو حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنے کی ذمہ داری انھوں نے لے رکھی تھی۔ دکانداروں اور سڑک کے دونوں طرف بکھری ہوئی جھگیوں کی بڑی بوڑھیوں کے خط پتر بھی لکھ دیتے تھے چنانچہ پورا محلہ جس میں کوارٹر والے بھی شامل تھے، احمد بابو کہا کرتے تھے جو ان کی ہر دلعزیزی کا ثبوت تھا۔

احمد بابو آئے تو اماں نے کچھ یونہی سی کوارٹ کی اوٹ کر کے گھر کی خیر خیریت پوچھی اماں کا محلے کے لڑکوں سے کچھ ایسا پردہ تھا جیسا ان لڑکیوں کا محلے والوں سے ہوتا ہے۔ جو یہیں پیدا ہو کر جوان ہوتی ہوں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دفعتاً وہ پکار اٹھیں۔

"ارے میں نے کہا تم جانے سے پہلے شادی کرتے جاؤ۔ وہاں پردیس میں کہاں لڑکیاں ملیں گی۔"

احمد بابو ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو دارالخلافہ تبدیل ہونے کے بعد پہلی اسپیشل سے پنڈی جارہے تھے احمد بابو اس بات کو بے وقت کی راگنی سمجھ کر کھسیانی ہنسی ہنس دیئے اور رسماً کہہ دیا۔

"آپ کہیں کرا دیجئے، میں تیار ہوں"

اماں نے آواز دبا کر نہایت رازداری سے کہا "ہاں ہے تو ایک لڑکی یہیں پڑوس میں رہتی ہے۔ اے ہے تم نے بھی دیکھی ہوگی یہ اپنی ہاجرہ" اور انہوں نے انجان بن کر دروازے کا پٹ کچھ اس طور سے کھولا کہ مسالہ پیستی ہاجرہ سامنے نظر آئے۔

احمد بابو دھوپ میں بیٹھی ہوئی ہاجرہ کے تمتماتے گال اور کھلی آستینوں سے جھانکتی ہوئی باہوں کو دیکھ کر کچھ کپکپا سے اٹھے۔ اماں نے بات جاری رکھی۔

"صورت شکل کی اچھی ہے، تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی ہے، سلیقہ مند ہے، دہلی میں اچھے خاصے درمیانے درجے کے لوگ تھے۔ یہاں بے چاروں پر مصیبت پڑ گئی لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ لڑکی میں کوئی عیب نہیں"

احمد بابو نے ہاجرہ کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھا تھا لڑکی بری نہیں تھی لیکن ایک جھگی میں بارات لے کر جانا ذرا سبکی کی بات تھی۔ یہ بات ہکلا کر، کچھ ٹوٹے پھوٹے جملوں میں انہوں نے اماں کے گوش گزار کر دی۔ اماں اس اعتراض کے لئے پہلے سے تیار تھیں پھر بھی وہ لمحہ بھر سوچتی رہیں آخر کار بولیں۔

"شادی ہمارے گھر سے ہو جائے گی، عورتیں اندر بیٹھ جائیں گی، مردوں کے لئے باہر شامیانہ لگ جائے گا جہیز میں بھی میں مدد کر دوں گی، تم فکر نہ کرنا۔"

یہ سن کر احمد بابو کی باچھیں کھل گئیں۔ شکریے کے لئے الفاظ بھی نہ ملے۔ صرف ہکلا کر رہ گئے۔ ان کی ماں سدا کی روگی تھی خود لڑکی کی تلاش کرنا ان کے بس میں نہ تھا تو ان کی طرف سے اعتراض کی گنجائش بھی کم تھی اور پھر جب سارا بندوبست خود اماں

کہہ رہی ہوں، چنانچہ کھڑے کھڑے انہوں نے تاریخ بھی طے کر کے احمد بابو کو سنا دی۔
ہاجرہ اب تک جا چکی تھی، چنانچہ انہوں نے ذرا کھلی ہوئی آواز میں احتیاطاً یہ کہا۔

"وہ چار جوڑے کپڑوں کے اور دو ایک زیور بنا لینا اور شادی کرتے ہی ساتھ لے جانا"

بہو نے سنا تو ان کی نظروں میں ایسا تیکھا طنز ابھر آیا کہ اماں دیکھ جائیں تو باقی عمر یہ نظر ان کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہتی ——— جہاں تک بہو کو یاد پڑتا تھا اماں کو اس دن سے ہاجرہ سے کد ہوتی تھی جب وہ پہلی مرتبہ برقع اوڑھ کر ان کے ہاں آئی تھی یوں تو ہاجرہ پہلے دن سے ان کے ہاں آ رہی تھی۔ شروع میں ننگے پاؤں، ننگے سر دھپ دھپ کرتی آتی تھی، چند سال بعد دوپٹے کے نام کی ایک پتلی سی دھجی زمین پر گھسیٹتی آنے لگی۔ پھر ایک دن برقع اوڑھ کر آئی۔ کام کرتے کرتے وہ برقعے کا نیچے کا حصہ پہنے پھر رہی تھی اور گلابی دوپٹہ برقعے کے اندر سے ہو کر اس کے کانوں اور بالوں کو ڈھانکتا ہوا پھر برقعے کی سیاہی میں ڈوب گیا تھا۔ برتن دھونے کے بعد جب وہ ننھے کے کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلا رہی تھی تو بہو نے اپنے کمرے سے ہانک لگائی۔

"ہاجرہ ذرا اماں کے کمرے میں جھاڑو لگاتی جا، صبح سے پڑا بھنک رہا ہے نگوڑ مارا۔"

باوجود کمرے سے انتہائی ہمدردی کے جو کھلا طنز اس جملے میں اماں کی آرام طلبی پر تھا، وہ ان سے چھپا نہ رہ سکا اور انہوں نے اونہہ کر کے اپنی پلنگڑی پر کروٹ بدل لی۔

ہاجرہ آئی اور جلدی جلدی جھاڑو دینے لگی۔ کچھ گلابی دوپٹے کی جھلک اور کچھ اس کی پھرتی نے جیسے اس کے بھرے بھرے گالوں پر گلال بکھیر دیا تھا۔ ان کم بخت ٹکڑے کھانے والیوں کے رنگ تو دیکھو جیسے انار کے دانے اماں نے لیٹے لیٹے سوچا۔ جب وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں اٹھا کر باہر رکھنے جاتی تو اس کے بھاری قدموں کی ہر

تھاپ جیسے اماں کے نازک دل پر پڑتی۔ نگوڑی ماریوں کی تنا رستیاں ہیں کہ زور سے پیر زمین پر ماردیں تو پانی نکل آئے۔ اماں ہمیشہ سے دھرتی پر پھونک پھونک کر قدم رکھتی آئی تھیں۔ یہ زمین زور سے چلنے والوں کے خلاف حشر میں فریاد کرے گی اگر یہ بات بچپن میں اماں کو نہ بھی بتائی جاتی تو بھی ان میں اتنی طاقت ہی کہاں تھی کہ وہ زمین کو ایسا موقع دیتیں۔ بچپن سے ہی چھوئی موئی کا پودا تھیں وہ تو۔

ہاجرہ جھاڑو دے کر میاں جی کی کرسی کے پاس جا کھڑی ہوئی تو انھوں نے اسے استفسارانہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر میاں جی کرسی کھسکا کر ایک طرف جا کھڑے ہوئے۔

"آپ برآمدے میں چلے جائیں، کم بخت ماری کمرے میں دھول ہی دھول بھر گئی۔" اماں نے میاں کو نصیحت کی۔ جب کلو جھاڑو دیتا تھا تو وہ اسی طرح کرسی چھوڑ کر ایک طرف جا کھڑے ہوتے تھے اور اپنی میز کرسی کے پاس سے صفائی ہوتے ہی وہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے کام کا سرا جوڑ دیتے تھے۔ آج نہ معلوم کیوں اچانک اماں کو ان کے پھیپھڑوں پر لوٹ کر پیار آگیا تھا۔ میاں جی چپ چاپ جا کر برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ اماں کھلی آستینوں میں سے ہاجرہ کے جلدی جلدی چلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں جیسے بجلی کے کوندے لپک رہے ہوں۔ غیر شعوری طور پر وہ اپنے کھچی ایسے ہاتھوں کو سہلانے لگیں پل بھر میں ہاجرہ کوڑا اسمیٹ سماٹ برآمدے تک جا پہنچی۔ اندر آتے ہوئے میاں جی نے بے پروائی سے اس سے پوچھ لیا۔

"تیرا بھائی اخبار دینے نہیں آتا آج کل"

"اس نے کام چھوڑ دیا میاں جی"، ہاجرہ نے کہا۔

"کام کیوں نہ چھوڑ دے گا، بہنیں جو تیرے میرے گھر سے بہتیرا اسمیٹ لاتی ہیں"، بیوی کے بدلتے ہوئے تیور میاں جی کو یوں لگے جیسے انھوں نے ہی بہنوں کو تیرے

میرے گھر جاتے کی نصیحت کی تھی وہ کرسی گھسیٹ جلدی سے اپنے کام میں جُٹ گئے۔
باورچی خانے سے گوشت کے جلنے کی بُو آرہی تھی لیکن وہ اپنے نزلہ زکام کے سہارے پڑی رہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب ان کی نزلہ زدہ ناک میں بو آگئی، تو بہو کی ہٹی کٹی ناک میں پہلے گئی ہوگی۔ بھابھی اپنے کمرے سے چلائی۔
"ہاجرہ دیکھنا، گوشت جلا — میں ذرا ننھے کو سلا رہی ہوں۔"
یہ دراصل وہ ہاجرہ کو نہیں اماں کو سنا رہی تھی کیونکہ اسے خوب معلوم تھا کہ اس کی آواز برابر کے کمرے تک ہی جائے گی۔ برآمدے میں ہاجرہ تک نہ پہنچے گی۔ اماں اس تریا چرتر سے بھنا کر چپل پہنتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بھاگی جلے ہوئے گوشت کو دوسری دیگچی میں ڈالنے اور پہلی دیگچی میں پانی جھونک کر نالی کے پاس لڑھکا دینے کے بعد جب وہ کمرے میں آئیں تو ہاجرہ کھڑی میاں جی سے ایک سادہ کاغذ اور لفافے کا سوال کر رہی تھی یہ منظر جانے انہیں کیوں بے حد کھٹکا۔
"کیوں، کس کو خط لکھنا ہے؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ میاں جی نے کاغذ اور لفافہ میز کے پرلے کونے تک سرکا دیا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے — ہاجرہ نے دونوں چیزیں اٹھاتے ہوئے کہا۔
"اماں لاہور بڑے بھائی کو خط لکھوا رہی ہیں۔"
"دو دو مُسٹنڈے بھائیوں اور باپ کے ہوتے ہوئے کنواری لڑکیاں تیرے میرے گھر کی خواری کرتی پھرے ہیں۔" اماں بڑبڑائیں یہ دیکھ کر آج ماں کو کنواری بہنوں پر بے تحاشا ترس آرہا ہے۔ ہاجرہ ان سے چار آنے پیسے مانگ بیٹھی۔
"بس یہ چلتر بازیاں ہیں ایک کمرے میں جھاڑو دی ایک لفافہ اینٹھا، اب چار آنے پیسے مانگنے لگی۔"
"ایک کمرے میں جھاڑو لگائی ہے بس اور اتنے برتن اور کپڑے جو دھو کر آرہی ہوں"

"تو میں کیا کروں، بہو سے مانگ جا کر۔" اماں نے یک لخت کروٹ بدل لی اور وہ بہو کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے پیسے اور ایک پرانی قمیض بغل میں دبا کر جب وہ رخصت ہو گئی تو اماں نے بہو کے پاس جانا ضروری سمجھا۔ بہو نے ساس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سوتے ہوئے بچے کے ایک دھپ جمایا۔ سویا ہوا بچہ کسمسا کر رہ گیا۔

اماں نے یہ سب دیکھا اور سمجھا مگر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ کیونکہ اگر ابھی وہ کچھ کہہ دیتیں تو جھگڑے اور تو تو میں میں کا سلسلہ ساڑھے پانچ بجے سے جا کر ملتا۔ جب ایک کے سر کا تاج اور ایک کے جگر کا لخت دن بھر کی کرسی کا ستایا، ٹریفک کے ہنگامے سے پریشان گھر میں داخل ہوتا۔ اس وقت ننھا اس کی ٹانگوں سے چمٹا مٹھائی کی فرمائش کر رہا ہوتا اور ان کے لیے ثابت کرنا کہ وقتِ فساد ننھا دراصل سویا ہوا تھا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ انہیں یاد آ گیا کہ ایسے وقت خود ان کی ساس کو ہمیشہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جانا پڑتا تھا جب کہ وہ امجد کو سلانے کے بہانے کئی گھنٹے کی نیند کھینچ لینے کے علاوہ دوپہر کا بہت سا کام ساس سے کروا لیتی تھیں۔

"بہو، تم نے ہاجرہ کو بلوایا تھا؟" اماں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ لہجے کی نرمی نے بہو کو اپنی جگہ محتاط کر دیا، کیونکہ یہ ہمیشہ کسی بڑے حملے کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا۔

"جی ہاں —— پھر کیا کرتی۔ جب سے مکو گیا ہے کمرے باسی تھے، برتن الگ پڑے بھنک رہے تھے۔"

"مگر —— ہاجرہ اب بڑی ہو گئی ہے، اسے نہ بلوایا کرو اور بہت چھوٹی موٹی لڑکیاں جھگیوں میں ہیں، آخر جوان لڑکے گھر میں ہیں۔"

اماں اپنا وار کر، جوابی حملے سے پہلے ہی واپس چلی گئیں۔

"ہونہہ،" بہو بڑبڑائی "کون جوان جوان لڑکے گھر میں ہوتے ہیں۔ اس وقت احمد بے چارہ صبح کا گیا چھ بجے لوٹتا ہے۔ صمد کالج سے آ کر کھانا کھاتے ہی سو جاتا ہے

تو شام کو خبر لاتا ہے اس وقت تو گھر میں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ سوائے بڑے میاں کے ۔۔"
جب وہ کوئی بات ساس سے نہ کہہ سکتی تو درودیوار کو اپنی دلیلوں سے قائل کئے بغیر کبھی نہ چھوڑتی۔

دوسرے دن جب بہو نے ہاجرہ کو بلوایا تو پہلے ہی سمجھا دیا کہ اماں سے نہ کہنا میں نے بلوایا ہے، کہہ دینا میں کسی کام سے خود آئی تھی۔ ہاجرہ اب بچی نہ تھی گھروں کی یہ چھوٹی موٹی مکاریاں وہ خوب سمجھتی تھی۔ اب وہ آتے ہی یہ بتلانے کے لئے کہ بلوائی نہیں گئی ہے۔ سب سے پہلے اماں کے پاس جاکر کبھی ابا کے لئے پان کے ٹکڑے یا تمباکو کی فرمائش کرتی۔ کبھی کسی بہلنے دو چار آنے مانگتی اور اس کی آواز سنتے ہی بہو بڑی معصوم سی آواز میں پکارتی۔
"ہاجرہ اب آگئی ہے تو ذرا سا یہ کام کرتی جا۔"
ذرا سا یہ کام کئی گھنٹے نکال دیتا اور اماں بہو کی سینہ زوری پر دل ہی دل میں کھولتی رہتیں اور جھنجلا جھنجلا کر کبھی کسی ٹھیلے والے سے، کبھی پان والے سے کبھی خود میاں جی سے لڑ لڑ کر ڈھیر کر دیتیں۔

انہیں دنوں اچانک ایک دن بہو نے ساس میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ دیکھتی کیا ہے کہ اماں دل و جان سے باورچی خانے کے کام میں لگی ہوئی ہیں، کہاں تو گیارہ بجے تک ہانڈی چڑھنے کے لئے ساس یا بہو کا دل پسیجنے کی دعا کرتی رہتی تھی یا آج نو بجے سے ہی کھد بد کر رہی تھی۔ برتن دھلے دھلائے سجے تھے۔ آٹا گوندھا رکھا تھا اور اماں پیڑھی پر بیٹھی ترکاری بنا رہی تھیں کہ ہاجرہ آئی۔

"چل دُور ہو، آگئی منحوس صورت لے کر،" اماں نے اسے ڈانٹا اور بہو سے مخاطب ہو گئیں" بہو، میں نے سارا کام کر دیا ہے، تم ہانڈی بھون کر روٹی ڈال لینا۔ مت مُنہ لگاؤ اس کلموئی کو، روز چار چھ آنے بٹورنے کے لئے آن مرتی ہے۔"

بہو نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن پیٹھ کے پیچھے اشاروں میں جانے کیا

کہا کہ وہ فوراً ہی دوپٹے سے منہ چھپائے ہنستی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ بعد غسل خانے سے چھپا چھپ کی آواز آئی تو بہو نے نہایت صفائی سے چونک کر کہا۔

"کم بخت کو کتنا ہی منع کرو، مانتی ہی نہیں، آپی آپ ننھے کے کپڑے نکال کر لے گئی ہو گی۔ میں بھی آج ایک پیسہ نہیں دوں گی کم بخت کو۔"

"تم نے سر پر جو چڑھا لیا ہے" اماں کا پارہ ایک دم چڑھنے لگا۔ "ہر چیز میں بغیر پوچھے گچھے ہاتھ ڈال دیتی ہے، کل کلاں کو کوئی چیز غائب ہو گئی تو سر پکڑ کر رو ؤ گی"، دفعتاً اماں کا غصہ کچھ اس طرح قابو سے باہر ہوا کہ وہ ترکاری سے ہاتھ کھینچ جا کر اپنی پلنگڑی پر پڑ رہی۔

ہاجرہ روز اسی طرح کسی نہ کسی بہانے سے آتی رہی۔ اماں کا داؤں چل جاتا تو اسے نکال دیتیں۔ ایک آدھ گھنٹہ بعد وہ پھر آن دھمکتی تھی۔ کبھی روپے کی ریزگاری چاہیئے کبھی آپا جی کو دکھانے کے لئے ٹھیلے والے سے بُندے اور چوڑیاں لئے چلی آ رہی ہے۔ جب سے اس پر برقعے کی تہمت چڑھی تھی اور آزادانہ باہر نکلنے کی پابندی ہو گئی تھی، وہ گھر سے نکلنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ اماں کے سارے طعنے تشنے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔ کبھی بہو سے شکایت کرتی یہ عجیب بات تھی کہ پہلے تو وہ دلائل ان دل کو بڑے معقول نظر آتے، لیکن کہہ چکنے کے بعد وہ اپنے کانوں کو بھی پھُس پھُسے معلوم ہوتے اور وہ کوئی اور ٹھوس بہانہ تلاش کرنے لگتیں۔

ایک دن اسی طرح جب وہ ہاجرہ کو لتاڑے لگانے اور نہ پڑھنے لکھنے کے جرم میں ماخوذ کر رہی تھیں کہ دفعتاً میاں جی چیخے۔ "یہ کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے تم نے کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔ تمہیں کیا وہ پڑھے یا نہ پڑھے۔"

اس کڑکتی آواز کو سن کر ہاجرہ تو برقع سنبھال گھر سے نکل کھڑی ہوئی، لیکن اماں نے رو رو کر زمین آسمان ایک کر دیا۔ میاں جی چھڑی سنبھال گھر سے نکل کھڑے ہوئے تب بہو اماں کو تسلی دینے آئی، لیکن اماں تھیں کہ ایک سال رو رہی تھیں کہ انہوں نے دو کوڑی کی چھوکری

کے آگے میری بے عزتی کی۔ اب اس گھر میں گھسی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ بہو نے دم دلاسا دیا کہ اب اس کی کیا مجال جو اس گھر میں قدم رکھے۔ ان کو چائے بنا کر پلائی اور اس طرح وہ سارا دن بہو کا باورچی خانے میں اور اماں کا پلنگڑی پر پڑے پڑے گزرا۔

چند دن تک ہاجرہ نے شکل نہ دکھائی۔ اماں برابر باورچی خانے میں بہو کا ہاتھ بٹاتیں اور ہر آئے گئے سے ملازم چھوکرے کے لئے کہتیں لیکن کراچی جیسی جگہ میں کھانا پکانے والوں کی قلت کا اندازہ کس کو نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ساس اماں نے زیادہ کام بہو پر چھوڑنا شروع کر دیا۔ کمزور ہڈیوں کی وجہ سے آئے دن سر اور کمر میں درد رہتا تھا اور ایک دن جب اماں کے سر میں سخت درد تھا اور بہو کو بھی فرصت نہ تھی۔ بہو نے ہاجرہ کو بلوایا کہ ذرا کی ذرا اماں کے سر میں تیل ٹھونک جائے۔ اماں کو یہ بات بھلی تو نہ لگی، لیکن وہ ٹال گئیں۔ گئی گزری بات پر فضیتہ کرنا جب کہ میاں جی سے صلح ہو چکی تھی، انہیں کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ یوں بھی میاں جی اس وقت موجود نہ تھے اس لئے انہیں سبکی کا احساس بھی زیادہ نہ ہوا اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہاجرہ سر میں تیل اتنی اچھی طرح لگاتی تھی کہ اس کے تیل ٹھونکنے کے خیال سے ہی جلد میں سرسری ہونے لگتی تھی۔ لیکن ان کی اس وقت کی ڈھیل کا نتیجہ اچھا نہ نکلا کیونکہ وہ پھر اسی ڈھٹے اور بے شرمی سے دن میں کئی کئی چکر لگانے لگی۔ اب اماں کو احساس ہوا کہ اگر اس دن تیل لگوانے کے بجائے اسے ڈانٹ کر بھگا دیتیں، تو پھر اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی، لیکن اس سے غلطی ہو چکی تھی جس کا فائدہ ہاجرہ اور بہو دونوں اٹھا رہی تھیں۔

آخر ایک دن جب ہاجرہ صحن میں بیٹھی مسالہ پیس رہی تھی اور میاں جی کھڑکی کے عین سامنے بیٹھے اپنا کام کر رہے تھے، تنگ آ کر انہوں نے احمد بابو کو بلوا بھیجا۔

احمد بابو سے بات چیت کر لینے کے بعد انہوں نے ہاجرہ کی ماں کو بلا کر یہ مژدہ سنایا جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ جائے۔ اس نے اماں کے پاؤں تھام لئے اور دعاؤں کا طومار باندھ دیا۔ آج نہ جانے کتنے سال بعد اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں مسرت کی لہر جھلملائی۔ پھر جب

کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

" اماں ایک بات کہوں، چھوٹی کی تو پھر بھی ہو جائے گی پہلے بڑی کی ہو جاتی، آپ جانیں اس کی عمر ڈھلے جا رہی ہے۔"

یہ سن کر اماں نے پاؤں کھینچ لئے اور بھنویں چڑھا کر کروٹ بدل لی "تم جانو بھئی، پہلے بڑی کی کر لو، پر احمد تو بڑی سے کرنے سے رہا۔ آخر بالو ہے جانے کس کس جتن سے تو ہم نے اسے راضی کیا ہے۔ اپنی چیز بھی تو دیکھنی چاہیئے۔ بڑی میں کیا ہے نہ شکل نہ صورت، آئے دن کی بیمار الگ۔"

اور جب منہ پھیر کر وہ لیٹ رہیں اور بڑی دیر تک کچھ نہ بولیں تو ہاجرہ کی ماں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آخر آدھ گھنٹے کی خوشامد کے بعد بات اسی خوشگوار موڑ تک پہنچی جہاں سے چلی تھی۔ اماں نے کچھ اسے سنہری اصول سمجھائے اور کہا۔

" جیسے بھی ہو تھوڑا بہت سامان تیار کر لے سسرال کے سامنے سبکی نہ ہو۔ ہاجرہ کو گھر میں بٹھا کر کچھ کام کرواؤ۔ اب دھیڑ دھیڑا دھر ادھر بھاگتے دیکھا تو سچی بات ہے۔ میں اس شادی کے بیچ میں نہ پڑوں گی۔ ویسے جو کچھ ہو سکا میں بھی مدد کروں گی۔"

اب جوں جوں بات پھیلتی گئی کہ ہاجرہ کا بیاہ کر رہی ہیں، ان کی دلچسپی جو ضمنی تھی بنیادی بنتی چلی گئی اور اماں ہاجرہ کے جہیز میں اسی طرح جٹی نظر آنے لگیں جیسے ان کی اپنی بیٹی کی شادی ہو۔ اپنا ایک نیا دوپٹہ لے، اچھا خاصا بقول بہو کے ٹھٹ کا ٹھٹ ریشمی غرارہ کاٹ انہوں نے ہاجرہ کے لئے دلائی تیار کر ڈالی —— پرانے لحافوں کی روئی آج تک سینت سینت کر رکھ رہی تھیں، تکیوں کے لئے جھٹ نکال کر دے دی۔ تانبے کے وہ برتن جو بہو کے کئی مرتبہ مانگنے پر بھی نہیں نکلے تھے۔ صندوق سے نکال قلعی کے لئے دے دیئے گئے اور تو اور بہو کے دن بھر کے کاموں میں یہ کہہ کر اضافہ کر دیا گیا۔

" بہو، وہ قمیضوں کا کپڑا ڈالے جا رہی ہوں، ذرا فرصت ملے تو ہاجرہ کی قمیض سی دینا۔"

اللہ اللہ یہ انہماک! بہو تے یہاں تک دیکھا کہ زنگ آلود ٹرنک سے نوٹ نکل کر ہاجرہ کی ماں کے ہاتھوں میں جارہے ہیں۔ یہ دیکھ کر بہو کو کچھ اور ہی خوف ستانے لگا اور وہ ایک دن اپنے میاں سے یوں گویا ہوئی۔

" پتہ نہیں کیسے یوں ایکا ایکی ان کا دل کھل گیا۔ کبھی ننھے کے ہاتھ پر دو آنے پیسے نہیں رکھے۔ ہاجرہ نے جب بھی مانگے خالی ہاتھ ہی گئی۔ لیکن اب تو خوب دریا دلی سے خرچ کر رہی ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں اپنا سارا زیور نہ دے ڈالیں۔،،

اور امجد میاں نے جو آخر انہیں اماں کے سپوت تھے یہ کہہ کر جلتی پر تیل ڈال دیا " دیتی ہیں تو دے دیں، ان کے زیور ہیں کوئی کیا کر سکتا ہے۔،،

اب تو روز رات بہو کو خواب دکھائی دیتے کہ ہاجرہ دلہن بنی ہوئی ہے اور اماں نے ایک ایک زیور صندوقچی سے نکال کر ہاجرہ کو پہنا دیا ہے اور وہ اس کی ننھی ننگی لوچی خالی صندوقچی کی طرح منہ پھاڑے حیران پریشان کھڑی دیکھتی رہ گئی ہیں۔

اب بہو کو اپنی گزشتہ دھاندلیاں بھی ایک ایک کر کے یاد آرہی تھیں۔ واقعی ایک ذرا سے ہاتھ پیر کے آرام کی خاطر اس نے اماں کا دل کئی مرتبہ دکھایا تھا، کئی بار موقع مل جانے پر انہیں دیدہ دانستہ جلایا بھی تھا۔ جیسے اب یہی ہاجرہ والا معاملہ لے لو، کہیں اماں بھی اسے جلانے ہی کے لئے تو یہ سب کچھ نہیں کر رہیں؟؟؟

جو کچھ ہو چکا تھا وہ تو اب میٹ نہیں سکتی تھی۔ اپنے طور پر اس کی تلافی یوں ہی کر رہی تھی کہ تینوں وقت بلا چون وچرا کھانا تیار کر دے اور اماں کی ہر بات مان لے۔ اماں جن کو سو فیصدی امید تھی کہ بہو ہاجرہ کے جہیز کے سلسلے میں ہر ممکن روڑے اٹکائے گی۔ یہ خوشگوار تبدیلی دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ آج کل اماں کا موڈ خاص طور پر شگفتہ تھا اور میاں جی کا زیادہ وقت اماں کی دی ہوئی فہرست کے سلسلے میں بازاریں گنتا تھا۔

آخر شادی ہو گئی اور اچھی ہو گئی۔ سارے محلے میں اماں کے نام کا ڈونگرا برسنے لگا۔ اماں نے بہ نفسِ نفیس کھانا کھلایا اور میاں جی خود باورچی کی تلاش میں پھرتے رہے۔ یہ باتیں ایسی تھیں جن کو ہزاروں بار تعریفاً نہ دہرایا جاتا۔ احمد بابو بھی خوش تھے، عمر کے کئی سوکھے سال گزارنے کے بعد انہیں ایک خوش شکل چنچل سی دلہن یوں اچانک مل گئی تھی جیسے آسمان سے ان کی جھولی میں ٹپک پڑی ہو۔ ہاجرہ کی ماں کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا تھا۔ وہ جب چلتی تو معلوم ہوتا کہ اماں کے احسانوں کے بوجھ ہی سے اس کی کمر جھکی ہوئی ہے۔ اماں کو ایک عجیب قسم کا روحانی سکون میسّر آیا تھا جیسے قبر میں پاؤں لٹکائے بوڑھے حج کر لینے کے بعد محسوس کرتے ہیں۔ بہو کی مسرت تھی تو مادی قسم کی اس میں شک نہیں، لیکن اماں سے کچھ کم نہ تھی، کیونکہ شاید اس کی آخری دنوں کی کارگزاری سے خوش ہو کر اماں نے زیور کی صندوقچی جوں کی توں روک لی تھی۔

آج اس بات کو دو ڈھائی ماہ گزر چکے تھے، نہ اتنے کم کہ یہ قصہ گلی گلی، کوچے کوچے دہرایا جائے۔ نہ اتنے زیادہ کہ لوگ بھول بسر گئے ہوں کہ آشی کی ماں آن پہنچی۔ یہ اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ دن پڑوس کی جھگی میں رہی تھی، پھر کسی دور دراز علاقے کے کسی سرونٹ کوارٹر میں بس گئی تھی۔ پرانے ملنے والوں کے ذریعے اس محلے کی ایک ایک بات کی اطلاع اس کو ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ ہاجرہ کی شادی میں اماں نے جو کچھ کیا تھا اور جو کچھ اس نے سنا تھا اسے دو سے ضرب دے کر اس نے اماں کے گوش گزار کیا اور انہیں یقین دلایا کہ اس ایک نیک کام کے صلے میں ان کے نام کا "موتی محل" جنت میں تعمیر ہو رہا ہوگا۔ بعد ازیں اپنے مطلب پر آ کر اس نے بتایا کہ آشی اب شادی کے قابل ہے بات پکی ہو گئی ہے لیکن اس کے پاس شادی کرنے کو کچھ نہیں، باتوں باتوں میں اس نے یہ بھی جتا دیا کہ آشی کا حق ہاجرہ سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہ یتیم ہے، اس کے بھائی نہیں ہیں، اس کے علاوہ ماں کو شادی بھٹرانے یا اپنے گھر سے شادی کرنے کی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتی صرف

تھوڑی سی مالی امداد چاہتی ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ اتنی دور سے اپنی بوڑھی ٹانگیں توڑتی وہ اماں سے آس لگائے آئی تھی جو بوڑھی ماؤں اور کنواری لڑکیوں کا آخری سہارا تھیں۔ اماں یہ سب نہایت صبر سے سنتی رہیں پھر بولیں۔

"بھئی اب تو میرے پاس کچھ نہیں ہے، ہاجرہ کی شادی میں بہت کچھ اٹھ گیا۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ بہو پردے کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ یک لخت اماں نے کمر بند سے چونی کھول کر نیچے ڈال دی "بس سے واپس چلی جانا"

یہ کہہ کر کروٹ بدلی آنکھیں موند لیں کہ ان پر نیند کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ آشی کی ماں چہرے پر ناامیدی کی جھریاں سمیٹے، یوں دعائیں دیتی جا رہی تھی کہ اس کا لہجہ اس کی نیت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"سدا سکھی رہو، ایمان سلامت رہے" جیسے وہ کہہ رہی ہو "سدا دکھی رہو لٹے ایمان مردے"

آج اسے اماں کی فراخدلی کی ساری داستانیں سفید جھوٹ معلوم ہو رہی تھیں اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اماں ابھی تک وہی کنجوس مکھی چوس اماں ہیں جنہیں ان کے محلے میں رہتے ہوئے وہ پہلے بھی کئی مرتبہ آزما چکی تھی۔

چند لمحے بعد جب بہو وہاں سے گزری تو بڑے بھولپن سے بولی "اے ہے یہ چونی کیسی پڑی ہے زمین پر، وہی تو نہیں جو آپ نے آشی کی ماں کو دی تھی۔"

"وہی ہو گی۔" اماں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ پھیلا دیا اور بڑبڑائیں "سارے جہاں کی کنواریوں کا میں نے ٹھیکہ لیا ہے کیا۔"

اور چونی احتیاط سے کمر بند میں ڈال کر گرہ لگالی۔

بارش کا آخری قطرہ

"تو دادا جان پھر اجازت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی! آدمی وہ کام کرے جسے وہ دیانت سے کر سکے اور حتی الامکان کمال تک پہنچا سکے۔ جس کام میں یہ دو باتیں نہ ہوں اس سے میں بھاڑ جھونکنے کو بہتر سمجھتا ہوں۔"

دادا کئی سے بھی باتیں کئے جاتے تھے مگر میرے اوپر ان کا کچھ ایسا اثر نہ ہوتا تھا۔ خواہ مخواہ کی شاعرانہ باتیں کرتے ہیں۔ آخر اور ہزاروں لاکھوں بھی تو یہی کام کر رہے ہیں۔

"ہاں کرتے ہوں گے۔ مگر ایک سچے اور دیانت دار آدمی کا کیا حال ہوتا ہے یہ دیکھنا ہو تو کل میرے ساتھ چلنا۔"

دوسرے دن میں ان کے ساتھ گیا۔ شہر کی چوڑی سڑک چھوڑ کر ہم اندر کی طرف ایک نسبتاً تیلی اور خستہ حال سڑک پر مڑے جس کے دونوں طرف ٹین کے چھوٹے چھوٹے کیبن یا نیم پختہ دوکانیں تھیں۔ ان ٹین کے کیبنوں میں کوئی سائیکل مرمت کی دوکان تھی، چند ایک بساطی اور پنواڑی تھے ایک آدھ ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ نیم پختہ دوکانوں میں مٹھائی اور گوشت کی دوکانیں بھی تھیں جن میں مکھیوں کی بھیڑ آدمیوں سے ذرا زیادہ تھی جگہ جگہ میلے پانی کی نہریں اور ابلتے گٹروں کے چشمے تھے۔ دادا نے وہ سڑک بھی چھوڑی اور گھروں کے درمیان ٹیڑھے میڑھے راستوں پر مڑتے آگے بڑھنے لگے۔ خدا معلوم دادا کو کیسے اس جگہ کا راستہ یاد تھا مجھے تو سب جگہ ایک سے کیبن، ایک سے گھر، ایک سی جھگیاں ایک سے ننگ دھڑنگ بچے اور ایک سی کالی دُبلی عورتیں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ دادا کھڑے ٹھیلوں، بڑی بڑی حیران آنکھوں والی گایوں اور بکری کی جگہ جگہ بکھری مینگنیوں سے بڑی

عمارت سے بچتے چلے جا رہے تھے اور میں ان کے نقشِ قدم پر پاؤں دھرتا چلا جا رہا تھا آخر کار
دادا ایک گھر کے سامنے جا ٹھہرے جس کی دیوار پر بڑا بڑا لکھا ہوا تھا "گلشن کرکٹ کلب"
اصل میں یہ کلب کی عمارت نہیں تھی کیونکہ اس کلب کی عمارت کا کہیں وجود ہی نہ تھا۔ اس
کلب کے جملہ ممبران اس وقت سامنے کے پتھریلے میدان میں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔
دادا کے پکارنے پر ایک لڑکا کھیل چھوڑ بلا ہاتھ میں لئے بھاگا ہوا آیا۔

"تمہارے نانا ہیں؟" دادا نے پوچھا۔

"جی ہاں"

"جا کر بتا نا کہ عبدالصمد آئے ہیں۔"

ذرا دیر میں پردہ ہو گیا اور وہ لڑکا ہمیں گھر میں لے گیا۔ پہلے ایک کچا صحن آیا جس کی
الگنی پر بے شمار کپڑے پڑے ہوتے تھے اور اِدھر اُدھر چارپائیوں، مونڈھوں اور پیڑھیوں
کی افراط تھی اس کے بعد ایک مختصر برآمدے سے گزار کر وہ ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔
جو بیک وقت ڈرائنگ روم، کھانے کا اور سونے کا کمرہ تھا۔ اس کے آگے ایک چھوٹی
سی سبز جافری لگی ایک جگہ تھی۔ جہاں ہمیں چھوڑ کر وہ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہ دیکھا اس
لئے کہ سارا کرکٹ کلب، اس وقت باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کھُری چارپائی پر
ایک ادھیڑ عمر کے کھچڑی سے بزرگ دینا و مافیہا سے بے نیاز بیٹھے تھے۔

"سلام علیکم بھائی جلال! کیا حال ہیں؟" دادا نے خاصی گرمجوشی سے کہا۔ انہوں نے
نظر اُٹھا کر دادا کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر توقف کے بعد کہا۔

"آپ تو میری بیٹی کا سراغ لگانے گئے تھے نا کچھ پتہ چلا؟"

دادا نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر مغموم لہجے میں کہا "نہیں"

"تو پھر کیا ضرورت تھی آنے کی...... دیکھ لی آپ کی دوستی۔" ان کے لہجے میں
درشتی صاف ظاہر تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دادا بولے "یہ میرا پوتا ہے"

اخبار میں جانے کو کہتا ہے۔،،

«کہاں جانے کو کہتا ہے؟،،

«کہتا ہے جرنلسٹ بنوں گا، اخبار میں کام کروں گا۔،،

«اس سے کہو کولہو میں جُت جائے، تیل نکالے کرے..... ہزار درجے بہتر ہے۔ آخر تیل تو خالص نکلے گا نا۔ سرسوں خالص ہوگی تو تیل بھی خالص ہی نکلے گا کیوں بھائی؟،،

«جی صحیح ارشاد کیا آپ نے،، دادا نے سعادت مندی سے کہا۔

«اور ہماری بیٹی کا کہیں پتہ نہیں چلا اب تک؟،،

«جی نہیں۔،،

«مر گئی ہوگی...... دفن کر دیا ہوگا کسی بدبخت نے...... کیا خبر دفن بھی کیا یا یونہی پڑی رہی ہو...... لیر لیر ہو گئے ہوں گے اس کے کپڑے۔ اس کے کالے بالوں میں مٹی بھر گئی ہوگی۔ ہیں بھائی! کیسی خوبصورت دلہن بنی تھی وہ انصاف سے کہنا لاکھوں میں ایک لگ رہی تھی کہ نہیں؟،،

«بے شک!،، دادا نے پھر گردن جھکا لی۔ جیسے ان کی بیٹی کے اغوا میں دادا کا ہی ہاتھ ہو۔

«کیسے سج رہے تھے سرخ کپڑے اس پر، کیسا خوبصورت زیور پہنا تھا اس نے، بالوں میں افشاں تھی اور آنکھوں میں کاجل تھا..... پھر کیا ہوا تھا بھائی صمد! اس کے شوہر لچے نے تو اس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا... اور پھر سب نے کیسے اس کے پتھر مارے تھے، کیسا اسے لہولہان کر دیا تھا اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ جو ایسا سنگسار کیا ان لوگوں نے۔ ان ہی لوگوں نے جنھوں نے اسے دلہن بنایا تھا۔ میں اس کی وہ معصوم صورت نہیں بھول سکتا بھائی صمد۔ کیسی ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ ہماری طرف۔ اس کے زخموں سے خون رس رہا تھا، افشاں جھڑ گئی تھی، کاجل بہہ گیا تھا۔ مجھ سے

اس کی یہ درگت نہیں دیکھی گئی۔ میں اسے بچانے بھاگا تو مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا..... جیل میں ڈال دیا..... اور پھر نہ جانے میری بچی کہاں چلی گئی، کدھر نکل گئی..... آپ نے بھی اسے پناہ نہ دی بھائی صمد؟ دیکھ لی آپ کی دوستی۔"

وہ پھر خاموش ہو گئے اور اپنے خیالوں میں کھو گئے۔ دادا سر جھکا کر پھر نادم سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولے "لوگ کہتے ہیں اب اس کی تلاش فضول ہے۔ اس نے خودکشی کر لی، حرام موت مر گئی" آپ حرام موت کس کو کہتے ہیں؟ آپ جسے خودکشی کہتے ہیں، میں اسے بھی قتل کہتا ہوں۔ کوئی انسان خود کو نہیں مار سکتا وہ کوئی اور ہوتا ہے جو اسے مارتا ہے۔ زمانے کے تازیانے، بھوک کے کوڑے یا کوئی اور جسمانی یا ذہنی آزار پہلے زندگی کے دروازے چاروں طرف سے بند کر دیتے ہیں، پھر اگر کوئی چپ چاپ موت کے کنویں میں اترنے لگے تو اس کو پکڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ حرام موت مرنے جا رہا تھا اور اگر مر جائے تو کہتے ہیں اس نے خودکشی کر لی، حرام موت مر گیا۔ یہ نہیں کہتے کہ اسے قتل کر دیا سنگسار کر دیا۔ کیسی ظالم دنیا ہے یہ!!!"

وہ پھر گم سم اپنے خیالوں میں کھو گئے جیسے ہم وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ دادا کس پاگل کے پاس مجھے لے آئے ہیں۔ اگر ان کی بیٹی کھو گئی تو ہم کیا کریں اور اگر اس میں دادا کا بھی کچھ قصور ہے تو پھر میں کیا کروں۔

"آؤ چلیں۔" دادا اٹھ کھڑے ہوئے "اب اجازت دیں بھائی جلال۔"

"خدا کی پناہ میں۔" انہوں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے کہا "دیکھو اس کی کھوج سے غافل نہ رہنا۔ لوگوں کو بکنے دو۔ میرا دل کہتا ہے وہ مری نہیں ہے۔ ایک دن اسے ضرور میرے پاس لے کر آنا ورنہ قیامت میں تم سب کا گریبان پکڑوں گا۔"

"خدا حافظ" دادا سر جھکائے چلے۔ پیچھے میں حیران اور پریشان۔ بڑے کمرے سے نکل رہے تھے کہ سات آٹھ سال کا ایک لڑکا چھوٹی سی ٹرے میں شربت کے دو گلاس لئے

چلا آرہا تھا۔ اس نے وہیں پیش کر دیئے۔ ہم نے انکار کیا اس نے اصرار کیا۔ آخر کار وہیں کھڑے کھڑے وہ شربت زہر مار کیا اور باہر نکل آئے۔ پھر وہی راستہ طے کرنا پڑا۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے اس لیئے دادا آگے آگے چل رہے تھے اور میں پیچھے پیچھے۔ اب میں نے دیکھا گلشن کرکٹ کلب کی اگلی دیوار پر "آفتاب فٹ بال کلب"، تھا جس کے سامنے میں چند لڑکے فٹ بال کھیلنے کے بہانے دھول اڑا رہے تھے اس کے آگے "مہتاب باسکٹ بال کلب"، تھا۔ ان سب کلبوں کے درمیان سے نکلتے، پانی کی چھوٹی چھوٹی گندی لہروں سے بچتے اور ننگے بچوں کو تکتے ہم پھر اسی کیبنوں والی سڑک پر نکل آئے۔

"دیکھا تم نے؟"، دادا نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"جی دیکھا۔"، میں نے کہا۔

"کیا سمجھے؟"

"کچھ بھی نہیں سمجھا۔"

"بھائی جلال ایک زمانے میں بڑے جرنلسٹ تھے۔ انہوں نے آزادی اظہار کی تحریک چلائی تھی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے بڑا لمبا جلوس نکالا تھا اور بڑی جوشیلی تقریر کی تھی اور تمام لوگوں سے حلف لیا تھا کہ آئندہ صرف وہ لکھیں گے جو خود صحیح سمجھیں گے۔ اس دن اخبار نویسوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ لگتا تھا جیسے حاجیوں کا ہجوم ہو جو حج کر کے لوٹ رہا ہو اور انہیں یقین ہو کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہو گئے ہیں اور اب وہ دوبارہ بچوں کی طرح معصوم ہو گئے ہیں۔ ہر ایک بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا اور لگتا تھا کہ واقعی ہر شخص پچھلی خطاؤں کی تلافی پر ادھار کھائے بیٹھا ہے اس رات ہر جرنلسٹ کے گھر میں رات گئے تک چراغ جلتا رہا اور ہر ایک نے پوری ایمانداری اور سچائی سے صورت حال کا جائزہ لے کر اپنے دل کی بات برسوں بعد، اور بہت سوں نے

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ لکھی —— مگر ان میں سے کوئی بھی چیز اخبار کی روشنائی اور دن کا اجالا نہ دیکھ سکی رات ہی کو آنے والے ایک زبردست ڈاریکٹو نے ان سب کو بے موت مار دیا۔ مگر بھائی جلال نے اپنے اخبار کا وہ اداریہ جوں کا توں چھاپ دیا جو رات کو لکھا تھا اور اس کی پاداش میں انہیں دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی وہ جو اس امید میں بارش کا پہلا قطرہ بن کر اوپر سے گرا تھا کہ پیچھے قطروں کا ایک سمندر ہوگا بارش کا آخری قطرہ بن کر جلتی ریت میں جذب ہوگیا۔ آدرش بڑی چیز ہے مگر تنہائی بڑی بھیب چیز ہے۔ چاہے آپ کال کوٹھری میں تنہا ہوں مگر یہ احساس کہ آپ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں، کچھ سر پھرے ہیں جو آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں یا چلنے کو تیار ہیں اس یقین کے بغیر پہل کرنے والا صرف "پیغمبر" ہی ہو سکتا ہے اور بھائی جلال پیغمبر نہیں تھے وہ یہ تنہائی برداشت نہ کر سکے جیل ہی میں ان کا دماغ خراب ہوگیا اور انہیں وقت سے پہلے چھوڑ دیا گیا۔

"مگر وہ تو پورے وقت اپنی لڑکی کا رونا روتے رہے۔"

"ان کی کوئی لڑکی کبھی تھی ہی نہیں"

"اچھا!" میں حیران ہوا۔

"ارے میاں تم سمجھے نہیں۔ یہ تو اسی آزادی ٹیا کا ماتم کرتے رہتے ہیں جسے انہوں نے دلہن بنایا تھا، جس کے شوہر "اظہار" نے اس کا منہ بھی نہیں دیکھا اور جسے لوگوں نے سنگسار کر دیا جب بھی میں جاتا ہوں مجھے یہی طعنہ دیتے ہیں کہ میں ان کی بیٹی کو نہ بچا سکا۔ تب ہی سے میں نے بھی اس پیشے کو خیرباد کہہ دیا۔ اس سے تو پولٹری اچھی، ماہی گیری بھلی یا پھر لوہار اور بڑھئی کا کام اچھا کہ انسان صرف اپنی مرضی کا تابع ہے۔ بس ایک بڑھئی کو جانتا ہوں جو ایک ایک ڈوئی پر اتنی محنت کرتا ہے جتنا کوئی مصور اپنی تصویر پر کرتا ہے۔ بھئی اگر صحیح معنی میں کوئی کمہار ہے تو وہ اس وقت تک چاک سے برتن جدا نہیں کرتا جب

تک اس کا دل مطمئن نہ ہو جائے۔ درزی ایک ایک ٹانکا اپنی مرضی سے لیتا ہے۔ فرض کرو کوئی ایسا قانون نکلے جس میں کہا جائے کہ کمہار صراحی بنا سکتے ہیں مگر اس کی گردن چھ انچ سے زیادہ نہیں رکھ سکتے یا ہانڈی صرف اس ناپ کی بنائی جا سکتی ہے جو ہم بتائیں تو تم ہی کہو کہ کوئی سچا کمہار سارے برتن بھانڈے چھوڑ کر جنگل میں نہیں چلا جائے گا۔ اگر کسی مالی کو پابند کر دیا جائے کہ تم صرف بیر پھول یہاں لگا سکتے ہو تو وہ بھی یہ پابندی برداشت نہیں کرے گا،،

"دادا لوہار ہو یا بڑھئی یا کمہار سب کو وہی چیز بنانی پڑتی ہے جس کی مانگ ہو۔ جو دنیا چاہتی ہو۔ مٹی کی یا کاٹھ کی گڑیاں ہی بناتے رہے تو کون خریدے گا؟،،

"بابا یہ تو ہنر ہنر کی بات ہے۔ تم میری بات مانو نہ مانو، اگر آدمی کے ہاتھ میں سچا ہنر ہو تو وہ اپنی مرضی کی چیز بناتا ہے اور بیچتا ہے نہیں تو دوسروں کی مرضی کی۔ فن کار اور کاریگر میں یہی تو فرق ہے ایک بڑھئی اور چمار بھی آرٹسٹ ہو سکتا ہے اور ایک آرٹسٹ بھی بڑھئی اور چمار ہو سکتا ہے۔ جو اچھی چیز، نئی چیز خونِ جگر سے بنائے وہ آرٹسٹ ہے اور جو لوگوں کی اور وقت کی مانگ پوری کرے وہ بڑھئی اور چمار رہے اور جس پیشے میں تم جانا چاہتے ہو جب وہ بڑھئی اور چمار کے پیشے سے بھی گیا گذرا ہوا تو اس میں جانا کوئی فخر کی بات تو نہیں۔ اگر آرٹسٹ نہیں بن سکتے تو آرٹیسن ہی بن جاؤ۔ لاکھوں لوگوں کی پسند کی چیز بناؤ گے تب بھی کچھ تو ذہن کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ کھلونے ہی بنانا شروع کر دو۔ کھلونے بنانا، کھلونا بننے سے تو بہتر ہے،،

سنگِ میل

اسما کی سالگرہ میں جاتے ہوئے نجیلہ کو اس کی پچھلی سالگرہ بار بار یاد آرہی تھی اس سالگرہ سے چند دن پیشتر اسما کے والد کو کار کا ایک حادثہ پیش آیا تھا جس سے ان کی ٹانگ میں شدید ضرب آئی تھی اور وہ بمشکل چلتے پھرتے تھے اس حادثے کی وجہ سے اس کی امی بھی دل گرفتہ سی تھیں اور خود اسما بھی سالگرہ منانے کے حق میں نہیں تھی۔ مگر اُس کے ابو کہنے لگے:

" یہ تمہاری سالگرہ نہیں ہے بیٹی، یہ ہماری سالگرہ ہے۔ اصل میں اب ہم لوگوں کی راہیں تنگ اور تاریک ہوتی جاتی ہیں اور تم نوجوانوں کی روشن اور کشادہ تر ہم بوڑھے ہوتے لوگ اپنی تنگ اور دھندلی راہیں چھوڑ کر چپکے سے اپنے بچوں کے راستوں پر آن کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے سنگ میل گننا شروع کر دیتے ہیں۔ تمہاری سالگرہ کا ہر دن ہمارے لئے روشن سنگ میل ہے بیٹی ابھی تم یہ باتیں نہیں سمجھو گی اور اس عمر میں یہ باتیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

اسما ہمیشہ سادہ رہتی تھی اور سادگی ہی میں بہت دلکش لگتی تھی۔ ذرا اچھی تراش خراش کا لباس ہوتا تو اُس کے بدن پر کسی ماڈل کے لباس کی طرح سجتا۔ ہر سال گرہ پر اس کے لباس میں کوئی نہ کوئی جدّت ضرور ہوتی جو اسما اور اس کی امی کی مشترکہ ذہنی اختراع کہی جا سکتی تھی۔ اکثر لڑکیاں بعد میں اس کی تقلید کرتی تھیں۔ اسما کے والدین تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن دماغ بھی تھے اس لئے وہ اپنی عمر سے زیادہ ذہین تھی اور حسّاس بھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سوچ میں کھوئی ہوئی اور کبھی کبھی پریشان سی لگتی تھیں، مگر اس کی خوبصورت ہنسی ان سوچوں کی نفی کر دیتی تھی۔ اپنے آپ کو سنوارنے میں اگر وہ کسی چیز کا خاص طور پر خیال رکھتی تھی

تو وہ اس کے بال تھے، جو گھنے، سنہرے اور چمکیلے تھے۔ وہ جس شکل میں بھی ہوں اُس پر پھبتے تھے اس کی باتوں میں بھولپن اور ذہانت کی عجیب و غریب جھلملاہٹ تھی۔ پچھلی سالگرہ ہی کی بات ہے کسی نے اُس سے پوچھا:

"اسمی! تمہاری کونسی سالگرہ ہے یہ ۔۔؟"

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"میں آج اٹھارہ سال کی ہوگئی ہوں مگر سب کو سترہ ہی بتاتی ہوں۔"

اس کی اس بات پہ سب لڑکیاں ہنس پڑیں جس میں اس کے والدین بھی شریک ہوئے۔

اس کی امی بولیں ۔۔۔ "دیکھا پگلی کو اگر عمر چھپانی تھی تو بتائی کیوں ۔۔۔؟"

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرت سی جھلکی، پھر وہ خوشدلی سے ہنس دی۔ سجیلہ کو اس کی یہ ادا بہت بھائی۔ اپنی ساری سہیلیوں میں اسے اسما سب سے زیادہ پسند تھی۔ پچھلی سالگرہ کی یاد میں کھوئے کھوئے پہلو بدلتے ہوئے سجیلہ نے ٹھنڈا سانس لیا یا غیر شعوری طور پر آہ بھری کہ اس کا ڈرائیور ریولا۔

"کیا بات ہے بی بی رو رہی ہو ۔۔؟" اور اس کا جواب نہ پا کر اس نے جیسے خود سے کہا۔

"سوانگ میں چلتے ہوئے رونا کیسا ۔۔۔؟"

سجیلہ کو بے حد غصہ آیا۔ ملازم بوڑھے اور پرانے ہو جائیں تو کیسے سر چڑھ جاتے ہیں اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا اور اسلام آباد کی سڑکوں پر لگے درختوں کو تکتی رہی۔ شاید رات کو ہلکی سی بارش ہوئی تھی۔ درختوں کے تنے بھیگ کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ دل کی شکل کے پتے چند ایک سبز تھے اور چند ایک زرد۔ ہر سال اپریل میں سبز اور زرد کا یہ سنگم سجیلہ کو بہت خوبصورت لگتا تھا۔ سڑکوں پر لگے ہوئے چنار اور درختوں کے کاسنی، گلابی اور سفید پھول اسلام آباد کی سدا بہار رونق تھے اور دوسرے شہروں کے لئے باعثِ رشک دور، اونچا پہاڑ اپنا سبز لبادہ اوڑھے شان بے نیازی سے کھڑا تھا۔ بادل جھک کر اس سے سرگوشیاں کر

رہے تھے جیسے کوئی خفیہ رپورٹ دے رہے ہوں۔ سجیلہ کو یہاں کی بہار ہمیشہ نہایت اُجلی اور خوبصورت لگتی تھی مگر آج اس کا دل بہت بوجھل تھا۔

کار اسما کے گھر میں داخل ہو کر کھڑی ہوئی تو سجیلہ چونکی۔ اسما کے گھر کا لان ہمیشہ کی طرح ہرا بھرا تھا۔ گلاب کے پودے بھی پھولوں اور کلیوں سے لدے ہوئے تھے۔ پچھلے سال بھی سجیلہ نے اپنے تحفے کے ساتھ یہیں سے ایک پھول توڑ کر دیا تھا۔ وہ پھول اتنا حسین تھا کہ سجیلہ جیسے اسے توڑنے سے باز نہ رہ سکی تھی۔ اس سال اسما کی امی نے تحفہ لانے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔ مگر ایک پھول دے دینے میں تو کوئی حرج نہیں جب کہ وہ ہے بھی اسما ہی کے گھر کا۔ سجیلہ نے سوچا۔ آج بھی ایک کم بخت کلی اتنی خوبصورت تھی جیسے خود کو توڑ لینے کی دعوت دے رہی تھی۔ سجیلہ نے آگے بڑھ کر اسے توڑ لیا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اور اسما کا پسندیدہ نغمہ بج رہا تھا۔ سجیلہ کو یاد آیا پچھلے سال اسما نے یہ ریکارڈ اتنی مرتبہ لگایا تھا کہ انہوں نے اخنجاجاً اُسے چھپا دیا تھا——

سجیلہ کو اس سال بھی دیر ہو گئی تھی۔ پچھلے سال بھی وہی سب سے آخر میں آئی تھی۔ اور اسما سے اس بات پر لڑی تھی کہ اس نے دروازے پر اس کا استقبال کیوں نہیں کیا۔ اسما نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "دوستوں کو اتنی دیر سے نہیں آنا چاہیئے کہ میزبان مایوس ہو جائے۔" سجیلہ لمحے بھر کو دروازے پر رُکی اور پھر اندر داخل ہو گئی۔

ڈرائنگ روم میں اسما کی ساری سہیلیاں موجود تھیں۔ ایک ہی ہنستی کھیلتی عمر کی لڑکیاں ان میں اس کے والدین ہمیشہ اسی طرح شریک ہوتے تھے جیسے وہ بھی ان ہی کی عمر کے ہوں۔ ساری لڑکیاں خوب سجی بنی تھیں۔ سجیلہ کو یوں لگا جیسے وہ کوئی بھولا بسرا خواب دیکھ رہی ہو۔ شاید اسما کی امی نے وہی شربتی ساری باندھ رکھی تھی جو پچھلے سال باندھی تھی۔ شاید اس کے ابو نے بھی وہی سوٹ پہنا تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا اور حیران ہوئی۔ ہاں اس نے بھی پچھلے سال یہی کپڑے پہنے تھے۔ روزی حسب سابق کونے میں بیٹھی کیمرے

ہیں فلم ڈال رہی تھی۔ سجیلہ نے سامنے کھڑے اسما کے ابو کو سلام کیا اور گلاب کا پھول اُن کے کوٹ کے کاج میں لگا دیا ــــ

"آؤ بچو کیک کاٹو۔ سجیلہ کا انتظار تھا۔ وہ بھی آ گئی ـــ" اسما کی امی نے کہا۔ سجیلہ نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ــــ

"آؤ بس جلدی کرو ـــ" سجیلہ کچھ حیران سی ہوئی۔ انہیں کس بات کی جلدی ہے؟ اس نے سوچا۔ ساری لڑکیاں بیضوی میز کے گرد کھڑی ہو گئیں۔ بڑے سے کیک پر انیس موم بتیاں روشن تھیں۔ اسما کی امی نے ایک خوبصورت سا سُرخ ڈبہ کھولا اور ایک ایک چھُری ہر لڑکی کو دی۔ پھر انہوں نے کیک کی طرف اشارہ کیا۔ لڑکیوں نے جھک کر موم بتیوں کو بجھایا اور سب نے ایک ساتھ کیک کاٹا ــــ

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ـــ" اسما کی امی نے تان اُٹھائی۔ سب لڑکیوں نے آواز ملائی ـــ "ہیپی برتھ ڈے ـــ" مگر ایک دم سب کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ اسما کی امی نے انہیں ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"سالگرہ کے دن رویا نہیں کرتے ـــ اسما کی روح یہیں کہیں قریب کھڑی خوش ہو رہی ہو گی۔ تم لوگوں کو روتا دیکھے گی تو کیا کہے گی" ـــ یہ کہتے کہتے ان کی اپنی آواز بھاری ہو گئی اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئیں ــــ

سجیلہ نے سوچا۔ اسما کی موت کے بعد اس کے والدین اس کی راہوں کے سنگِ میل کب تک گنتے رہیں گے۔ اس کے ابّو نے کہا تھا یہ اسما کی نہیں خود ان کی سالگرہ ہوتی ہے۔ اس کی سالگرہ کا ہر دن ان کے لئے ایک روشن سنگِ میل ہے۔ اب جب کہ یہ روشن سنگِ میل ہمیشہ کے لئے بجھ چکے ہیں۔ انہوں نے اسما کی سالگرہ کیوں منائی؟ کیا یہ سوانگ تھا جیسا کہ اس کے ڈرائیور نے سمجھا۔ نہیں یہ سوانگ نہیں تھا یہ سالگرہ ضرور انہوں نے اسما کی سہیلیوں کی خاطر کی ہو گی تاکہ اسما اُن کے درمیان زندہ رہے

اور اس کی وجہ سے ان کے ہاں خوشیوں اور مسکراہٹوں کے چراغ روشن رہیں۔ اسما کے والدین واقعی ان بہادر لوگوں میں سے ہیں جو اپنے بچوں کی ہی نہیں ہر بچے کی راہ میں چراغ رکھتے چلے جائیں گے تاکہ ان کی راہیں دھندلی نہ ہونے پائیں۔ اس دن اسما کی ساری دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر اسما کے والدین کو بلانا کبھی نہ بھولیں گی ——

لعنت

وہ شخص اور وہ بچہ مجھے بری طرح ہانٹ (HAUNT) کر رہا ہے اس ملک میں ہر وقت کوئی نہ کوئی چیز مجھے ہانٹ کرتی ہے۔ میں اچھی طرح سو نہیں سکتا۔ لمبے لمبے بے تکے خواب ساری نیند تباہ کر دیتے ہیں اور اکثر ان خوابوں کا تعلق ان چیزوں سے ہوتا ہے جو جاگتے ہیں مجھے پریشان کرتی ہیں۔ وہ شخص جسے آدمی کہنا لفظ آدمی کی توہین ہے۔ ہمارے ملک میں تو جانور بھی اس طرح نہیں رہتے۔ ایک کھاتے پیتے علاقے کے دفتروں اور دکانوں کے سامنے وہ جانوروں کی طرح پڑا رہتا ہے۔ گندگی میں لتھڑا ہوا کبھی پتھریلے فرش پر اور کبھی نیچے مٹی میں۔ دنیا اور مافیہا سے بے خبر۔ اپنے آس پاس گزر جانے والوں سے، چوڑی شاہراہ پر بل کھا کر مڑتی چلی گئی لمبی لمبی ٹیوب لائٹس کی کئی کئی راہوں سے شام کو آسمان پر پھیل کر سڑک کی بتیوں کو حسین تر کر جانے والی شفق سے، ان خوشبوؤں سے جو خوبصورت کپڑوں میں ملبوس اسمارٹ عورتوں کے خوبصورت ملبوسات سے پھوٹ کر فضا میں پھیل جاتی ہیں، سب سے بے نیاز۔

جس دن میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا وہ رات کے اندھیرے میں کچی زمین پر ہیولا سا بنا بیٹھا تھا۔ تاریکی کے باوجود دور تک مجھے گیلی زمین نظر آئی اور بدبو کی بھبک میں کانپ سا گیا۔ کیا انسان کی یہ اوقات ہے۔ اس پر وہ کیسے کیسے دعوے کرتا ہے۔ یہ دعوے کرنے والے اگر آدمی کی اس ناگفتہ حالت کو دیکھ لیں تو شاید وہ بھی سوچ میں پڑ جائیں کہتے ہیں جانور بھی جب کہیں بیٹھنے لگتا ہے تو دُم سے جگہ جھاڑ لیتا ہے مگر اس آدمی کو گندگی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُسے وقت کا بھی ذرا احساس نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں اس کے چوبیس گھنٹے کیسے گزرتے ہیں ٹائم ہینگز آن می۔ میں جو ایک سیاح ہوں، ہر وقت چلے پھرنے کی بلی

بنا گھومتا رہتا ہوں۔ مختلف ممالک کے لڑکے لڑکیوں سے دوستی بھی کرتا ہوں لیکن مجھے
وقت کی آہستہ روی کا احساس رہتا ہے۔ وقت روز صبح تلوار کی طرح میرے سر پہ لٹکا رہتا ہے
مگر اس شخص کو وقت کی سست روی کا کوئی احساس نہیں۔ وہ چوبیس گھنٹے یہیں رہتا ہے۔
نہ کہیں آتا ہے نہ جاتا ہے، پھر بھی اس کا وقت گزر جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ وقت گزار رہے
ہیں، لیکن جو وقت نہیں گزارتے ان کا وقت بھی گزر جاتا ہے اس کا مطلب ہے وقت گزارنے
کی علت سے مادرا ہے وہ خود بخود گزرنے والی کوئی چیز ہے اور چلتی چیز کو دھکا دینے کی کوئی
ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم جیسے احمق چلتی چیز کو دھکا دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

دوسرے دن تقریباً اسی جگہ میں نے ایک لڑکے کو فرش پر جھکے ہوئے دیکھا۔ اتنی دیر سے
یہ کیا دیکھ رہا ہے۔ تجسس نے مجھے اسے نزدیک سے دیکھنے پر اکسایا۔ وہ اپنے تھوک کے
بلبلے بنا رہا تھا، بڑی محنت لگن بلکہ کہنا چاہیئے دل و جان سے سفید بتاشوں کے سے ان بلبلوں
سے اسے کیا حظ مل رہا تھا، اس کی کونسی حس کی تسکین ہو رہی تھی —— وہ شاید قریب کھڑے
ہوئے غبارے والے سے غبارے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اور شاید صابن
کے پانی سے بلبلے بنانے کی توفیق بھی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جب میں نے ذرا غور سے دیکھا
تو مجھے معلوم ہوا کہ اس شخص کی طرح یہ لڑکا بھی پاگل ہے۔ وہ بھی اپنے گرد و پیش کو بھول
چکا ہے جس طرح گرد و پیش اسے بھول چکا ہے۔ صرف میں ہی ہوں جو اسے دیکھ کر چونک
رہا ہوں، کیونکہ میں غیر ملکی ہوں —— اور شاید میں ہی ہوں جو اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ
اس ملک میں کتنے پاگل ہیں، کتنے اندھے ہیں، کتنے فقیر ہیں اور کتنے ڈھیر سارے لوگ ناکافی خوراک
کا شکار ہیں۔ ورنہ یہ لوگ جو آس پاس گھوم رہے ہیں۔ ان چیزوں سے بے نیاز ہیں مگر میں
ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہ چیزیں میرے دل اور ذہن کے کسی ایسے تار کو چھیڑتی ہیں
جو دیر تک جھنجھناتا رہتا ہے اور میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ گورا قبرستان میں بھی مجھے
کسی ایسی چیز سے واسطہ پڑے گا۔

میں نے سُن رکھا تھا کہ انگریز جس کروفر اور شان سے اس ملک میں حکومت کر گئے اسی دبدبے، شان اور علیحدگی سے وہ یہاں کے خوبصورت قبرستانوں میں مدفون ہیں۔ میں گورا قبرستان میں داخل ہوا تو سامنے ہی ایک درخت میں لٹکے کالے تختے پر انگریزی میں لکھی ایک اپیل چسپاں تھی۔ گورا قبرستان کی حالت بہت خستہ ہے چندہ چاہیئے اس ملک میں زندہ اور مردہ دونوں کو چندہ چاہیئے، خواہ وہ گورے ہی کیوں نہ ہوں، چندے بغیر یہاں جینا بھی مشکل ہے اور مرنا بھی۔ دائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں تابوت کھینچنے والی گاڑی کھڑی ہے گاڑی کے پہیئے بڑے شاہانہ قسم کے ہیں اور گوروں کے شایانِ شان ہیں جب کہ قبرستان کی حالت خاصی خراب ہے اس دن بارش نے معاملہ اور بگاڑ دیا تھا۔ میں قبروں کے نزدیک گیا تو گیلی اور کالی زمین پوری قوت سے میرے جوتوں کے تلووں سے چمٹ گئی جیسے سنا ہے۔ ان علاقوں کے قبرستانوں میں بھوت انسانوں سے لپٹ جاتے ہیں۔ پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ قبرستان کی ساری زمین سیم اور تھور کا شکار ہے اور اس زمین نے پتھر کی قبروں کو بھی کھا لیا ہے۔ چند قبریں نئی ہیں مگر زیادہ تر پرانی ہیں۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی کی جب ہندوستان میں انگریزوں کا طوطی بولتا تھا، کراچی صرف ایک بندرگاہ، ایک صاف ستھری چھوٹی سی چھاؤنی تھی اور گورا قبرستان اس وقت ریت کے سمندر میں مُردوں کا ایک جزیرہ۔ اس وقت یہاں خوب پھول پودے لہلہاتے ہوں گے۔ شاید ہر اتوار کو گھڑ سوار افسر یہاں پھول چڑھانے اور ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرنے آتے ہوں۔ آج بھی اتوار تھا، مگر میرے سوا یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ قبرستان کے چوکیدار اور مالی بے کار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے کیونکہ یہاں چرانے کو بھی کچھ نہیں ہے، لگانے اور سینچنے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ انگریزوں کی اس قدر قلت ہے کہ دفن ہونے بھی کوئی نہیں آتا۔

بعض قبریں زمین کے برابر ہو گئی ہیں۔ صرف سیمنٹ کا چوکھٹا رہ گیا ہے۔ بعض کے قدآدم کتبے دیمک لگی لکڑی کی طرح بھُر بھُر ہو رہے ہیں ان پر لکھے ہوئے خوبصورت جملے

مختصر نظمیں، نام اور سن کہیں کہیں سے پرانی یادوں کی طرح جھڑ گئے ہیں اور کہیں کہیں اسی طرح مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں جیسے بعض نقوش ذہن پر کندہ ہو جاتے ہیں۔ مارگریٹ اینڈرسن بیٹی کی قبر جس پر تاریخ وفات ۱۹۱۶ء درج ہے اب تک خاصی اچھی حالت میں ہے اس پر سنگِ مرمر کا بنا ہوا فرشتہ جو پونا سے بن کر آیا تھا ابھی تک اسی معصومیت سے کھڑا زمانے کے گرم و سرد سہہ رہا ہے اس کے دونوں پَر ابھی تک سلامت ہیں البتہ ایک ہاتھ کہنی کے پاس سے ٹوٹ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ فرشتہ وینس کے مجسمے سے مشابہ ہو گیا ہے اور دوسرے ہاتھ کی، جو آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہے، ایک انگلی ٹوٹی ہوئی ہے مگر یہ کیا؟ یہ لیفٹیننٹ بے چارہ صرف بائیس سال کی عمر میں اس دیارِ غیر میں چل بسا۔ اس کی ماں پر کیا گزری ہوگی۔ اس کا جی کیسا کیسا کلپا ہوگا کہ اس کم بخت ہندوستان کی سرزمین پر بنی ہوئی اپنے جوان بیٹے کی قبر پر بوسہ دے مگر وہ وہیں انگلینڈ میں تڑپتی کلستی وہیں کی سیلی زمین میں دفن ہو گئی ہوگی۔ یہاں بہت سے مردہ سپاہیوں کی ایک اونچی سی یادگار بھی ہے جو ابھی تک بلند ہے مگر کراچی کی دشمن زمین جسے چپکے چپکے کھا رہی ہے۔ بہت جلد روم کے ستونوں کی طرح یہ زمین پر ڈھے جائے گا۔ کیا یہ ہی بہت نہیں ہے کہ جس سرزمین سے جیتے جی گوروں کو نکال دیا گیا وہاں ان کے مردوں کے پاس اتنی بہت سی زمین ہے، ان کے چاروں طرف اونچی دیوار ہے ہے۔ حفاظت کو چوکیدار اور مالی ہیں جس کی نگہداشت کے لئے کمیٹیاں ہیں جو اور کچھ کریں نہ کریں چندے کے لئے جگہ جگہ ہاتھ پھیلائے ہیں۔ اخباروں میں چھپی ہوئی اپیلیں ہیں ٹائپ شدہ اپیلیں ہیں اور ہاتھ سے لکھی ہوئی درخواستیں ہیں جو جا بجا لٹکی ہوئی ہیں۔

قبرستان کے بیچوں بیچ جو ایک راستہ چلا گیا ہے، اس پر صلیب پر لٹکی عیسیٰ مسیح کی شبیہہ بد ذوقی اور بے ہنری کی عمدہ مثال ہے۔ سفید بھدی چونا پھری اس شبیہہ میں ذرا بھی ہنرمندی نہیں۔ سر سے ٹپکتا اور ہاتھ پاؤں سے نکلتا خون بھی حد درجہ بناوٹی ہے شاید پیغمبروں کی تقدیس کو اس ظالمانہ ہنرمندی سے بچانے کے لئے ہی اسلام میں پیغمبروں کی

شبیہ بنانا قطعاً منع ہے۔

قبرستان سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ایک عورت دیکھی جو نکھ شکھ سے ایسی درست تھی کہ ہالی وڈ کی بڑی سے بڑی ایکٹرلیس سے ٹکر لے سکتی تھی مگر جس کے بال میل مٹی اور راکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور کھلے گریبان سے جھانکتا سفید بدن راکھ سے چِٹلا ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھیک مانگی تو میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھوک بھی تھی۔ ـــ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے اپنے حُسن کا احساس بھی تھا۔ تو پھر اس نے اپنے سارے بدن کو میل اور راکھ سے کیوں لیتھڑ رکھا تھا جب کہ وہ ہپیوں کی نسل سے بھی نہیں تھی ـــ اور قبرستان سے باہر سڑک پر چلتے ہوئے میں نے ایک شخص کو چھوٹے بچے کی ٹرائیسکل پر ایک لکڑی کے چوکور ڈبے میں بیٹھے دیکھا وہ پہیوں کو ہاتھ کے ایک ہینڈل سے چلا رہا تھا کیونکہ وہ دونوں ٹانگوں سے محروم تھا۔ جب وہ شخص سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص اتنی تیز رفتار لمبی لمبی ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں کے درمیان سے گزر کر کہاں جا رہا ہے ـــ اب یہ شخص بھی مجھے ہانٹ (HAUNT) کرتا رہے گا اور وہ عورت بھی۔ مجھے چاہیئے کہ میں شکیل سے ملوں اور اپنے دل کا غبار اس کے سامنے نکالوں۔ اس سے پہلے جب میں یہاں آیا تھا تو اس سے باتیں کر کے بڑا سکون سا ملتا تھا جیسے نفسیاتی دباؤ کے کسی مریض کو ماہر نفسیات کے سامنے دل کھول کر باتیں کر لینے سے ملتا ہے۔

شکیل اپنے دو کمروں کے کوارٹر میں چادر باندھے اور بنیان پہنے سامنے ہی بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ بہت قابل آدمی ہے اور بحیثیت لکھنے والے کے اسے تسلیم بھی کیا جاتا ہے مگر اس ملک میں ادبی تحریریں مالی منفعت کا ذریعہ نہیں ہیں۔ یہ بات بڑے اطمینان اور سکون سے شکیل نے مجھے بتائی تھی۔ مجھے دیکھ کر کرسی سے اپنا کرتہ اُٹھا کر پہنتا ہوا وہ باہر لپکا اور اپنی مخصوص گرمجوشی سے ملا۔ سکون اطمینان اور گرمجوشی کا کچھ عجیب و غریب امتزاج

اس شخص میں ہے۔ وہ مجھے اندر لے آیا اور میں اس کی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر ایک عجیب تکلیف دہ زاویئے سے بیٹھ گیا۔ تسکیل کے دو کمروں کے کوارٹر میں ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور ڈریسنگ روم نہیں ہیں۔ اس کے دونوں کمرے صرف بیڈ روم ہیں جن میں پاس پاس بہت سے پلنگ پڑے رہتے ہیں وہ خود، اس کے بیوی بچے، ماں باپ، بھائی بھاوج اور ان کے بچے سب مل جل کر اس گھر میں رہتے ہیں۔ اس نے مجھے یہ سب بتایا مگر اس کے لہجے میں کسی قسم کی معذرت نہیں تھی صرف اظہارِ حال کی لاتعلقی تھی۔ جب وہ بھی اپنی چارپائی پر اطمینان سے چڑھ کر بیٹھ گیا تو میں نے آج تک کی ساری روئیداد اسے سنائی۔ وہ سنتا رہا۔ اس کی سوئی سوئی آنکھیں کچھ سوچتی رہیں اور اس کے ہونٹوں کے درمیان سگریٹ سلگتا رہا جس کے کش وہ اتنے زور سے لیتا جیسے سگریٹ کی جان اور اپنی جان ایک کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

کچھ دیر بعد وہ حسبِ معمول کھانسا اور اس نے کہا۔

"تم نے کبھی غور کیا ہے کہ یہ ملک بھی تو گورا قبرستان کی طرح ہے۔ گورے چلے گئے ہیں مگر وہ کچھ ایسی روایات چھوڑ گئے ہیں جن کو یہاں کی سیم وتھور بھری زمین نہ پوری طرح محفوظ رکھ سکتی ہے، نہ پوری طرح اکھاڑ پھینکنے کی ہمت رکھتی ہے اوپر سے کنگرے اور مینارے جھڑ بھی رہے ہیں۔ مگر کچھ لوگ چندے اکٹھے کر کے انہیں برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔"

"کیا تمہاری شامت آئی ہے، اپنے ملک کو گورا قبرستان کہہ رہے ہو کسی نے سن لیا تو تمہاری خیر نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"نہیں بھئی میں تو صرف مشابہت دیکھ رہا ہوں اور مشابہت تو دو بہت مختلف چیزوں میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"مگر میں تم سے اس مشابہت کی داستان سننے نہیں آیا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو چیزیں مجھے ہانٹ کرتی ہیں کیا تمہیں بھی کرتی ہیں؟"

"کرتی ہیں مگر اتنی نہیں، البتہ تمہارے ملک کے ارب پتی تاجر کا وہ بیٹا مجھے ضرور ہانٹ کرتا ہے جس کی تصویر مجھے کسی نے دکھائی تھی۔ ایک انڈر گراؤنڈ کیفے میں اپنے جیسے بہت سے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ میلے کپڑوں میں زمین پر بیٹھا وہ چرس بھری سگریٹ کے دم لگا رہا تھا، اس کے تیکھے نقوش اور اس کی آنکھوں میں نروان کی تلاش مجھے آج بھی ہانٹ کرتی ہے۔ اور اس بوڑھے شخص کی تنہائی جو یونان کے کئی جزیروں کا تنہا مالک ہے، ایک بے حد مشہور اور خوبصورت عورت کا میاں مگر جوان اکلوتے بیٹے کی موت نے جس سے زندگی کا سارا رس، دولت کا سارا سکھ اور جوان خوبصورت عورت کی رفاقت کا سارا مزا چھین لیا ہے۔ یقین کرو اس کھرب پتی شخص کی ساری دولت بھری تنہائی مجھے اکثر ہانٹ کرتی ہے اور میں اس چارپائیوں سے بھرے کمرے میں جہاں چلنے کی جگہ نہیں ملتی بیٹھا اکثر سوچتا ہوں کہ میں بچوں کی یہ چیاؤں چیاؤں، مکھیوں کی یہ بھنبھناہٹ، مچھروں کا یہ شور اور کھٹملوں کی یہ تکلیف دہ کھجلی اس شخص کی تنہائی سے بدل کر خوش رہ سکتا ہوں تو سچ جانو کہ میں اس کے تصور سے ہی کانپ اٹھتا ہوں۔ اگر تمہیں یہاں کے پاگل بوڑھے ہانٹ کرتے ہیں تو مجھے وہاں کی وہ ہوشمند بوڑھیاں پریشان کرتی ہیں جو پارکوں اور بازاروں میں ایک دوسرے کے سہارے گرتی پڑتی پھرتی رہتی ہیں اور جنہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے بچے اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اگر تمہارے حواسوں پر کوئلہ چنتی وہ عورت چھائی رہتی ہے جس کے حسین چہرے کے نقوش راکھ سے چکیرے ہو رہے ہیں تو میرے حواسوں پر نیوڈ کلب کی وہ عورتیں سوار رہتی ہیں جو اپنے جیسے مردوں کے ساتھ دلجمعی سے اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ اور جن کو تاکنے جھانکنے کے لئے جہاز اور ہیلی کوپٹر نیچی اڑانیں کرتے ہیں۔"

"تو تم ہی بتاؤ ہم دونوں کو الگ الگ چیزیں کیوں ہانٹ کرتی ہیں؟" میں اس سے صحیح معنوں میں امداد کا طالب ہوں۔ میں اس بات پر واقعی متجسس ہوں۔ مگر وہ کچھ ایسا فکرمند نہیں ہے۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگتی ہے کہ گو وہ چہرے مہرے سے بڑا پریشان

حال نظر آتا ہے، لیکن دراصل اسے کوئی بات پریشان نہیں کرتی۔ شاید وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسے کوئی بات، کوئی شخص ہانٹ کر ہی نہیں سکتا۔ میرے سوال کا جواب بھی وہ بڑی دھیرج سے دیتا ہے "سیدھی سی بات ہے"، وہ کہتا ہے:

" ہم ان چیزوں کے عادی ہو گئے ہیں تم اُن باتوں کے عادی ہو گئے ہو.... اور سوچو تو آدمی ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں پہلے پہل اُسے شاک کرتی ہیں ان کا بھی وہ عادی ہو جاتا ہے۔ دوستوں کی مفارقت کا پیاروں کی موت کا سننے کا، حبسِ دوام کا پیغمبروں کی شہادت تک کا۔ یوں ہم ان کا ماتم کسی انداز ہی میں کیوں نہ کریں مگر شاذ و نادر ہم وہ کرب محسوس کرتے ہیں جو اپنے سامنے کسی کو تکلیف سے دم توڑتے دیکھ کر محسوس کرتے ہیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"شاید میں تمہاری بات پوری طرح نہیں سمجھا۔"

"دن میں کتنی بار تم حضرت عیسٰی کو صلیب پر لٹکے دیکھتے ہو اور کیا کبھی اس کرب سے دوچار ہوتے ہو جس سے دوچار ہونا چاہیئے۔ تم اس کانٹوں کے بنے تاج اور زخموں سے رستے لہو کے ایسے عادی ہو گئے ہو کہ انسانیت کے گناہوں کا کفارہ دینے والے کی ذہنی اور جسمانی تکلیفوں سے قطع نظر یہ سوچتے ہو کہ یہ مجسمہ آرٹ کے لحاظ سے اچھا ہے یا برا۔ دنیا میں بڑی بڑی لعنتیں ہیں، چور بازاری، رشوت، قتل و غارت، جھوٹ اور نااہلی اور یہ سب لعنتیں ہمارے ہاں بھی ہیں مگر پہلے میں ان سے اتنا خائف نہیں تھا جتنا اب ہوں، کیونکہ اب ان سب سے بڑی لعنت ہمارے اوپر مسلط ہو گئی ہے جس کو کوئی لعنت نہیں سمجھتا، جس کی موجودگی کا کسی کو احساس بھی نہیں۔ یہ لعنت ہے کہ ہم ان سب لعنتوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔ دیکھو میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ تم کسی ملک کے عادی ہو جاؤ اور اس ملک کے لوگ تمہیں ہانٹ کرنا چھوڑ دیں

تو تم اس ملک کو چھوڑ دینا۔،،

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور آج مجھے پتہ چلا کہ اس کی کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہ سب سے الگ ہے۔ وہ ابھی اس دنیا کا عادی نہیں ہوا ہے اس دنیا کی ساری اچھی بُری باتوں کو وہ بچوں کے سے تجسس، حیرت، کرب اور مسرت سے دیکھتا ہے۔ ان کے بارے میں اپنے آپ سے سوالات کرتا ہے اور ان پر غور کرتا ہے، حالانکہ آج تک وہ اپنے ملک، اپنے شہر سے باہر نہیں گیا اور بہت کم اپنے گھر سے باہر نکلتا ہے مجھے یقین ہے کہ جس دن اسے یہ دنیا ہانٹ (HAUNT) کرنا چھوڑ دے گی وہ بھی اس دنیا کو چھوڑ کر چل دے گا۔

انسان ذات

غفورا گدھا صبح نہیں آیا۔ چھا جون بینہ پڑ رہا تھا کون اُسے بُلانے جاتا۔ اُٹھی کیا کرتی۔ ناشتہ بنایا میاں کے لئے۔ بارش ذرا تھمی تو بیٹے کو بھیجا کم بخت کو بُلا کر لاؤ۔ کوارٹر تو زیادہ دور نہیں مگر راستہ لمبا ہے، گندا نالہ ہے بیچ میں۔ خیر منّو تو پھلانگ کر ہی چلا گیا ہوگا۔ آکر کہتا ہے "غفورا کا چھوٹا بیٹا رات کو مرگیا ——" اے ہے —— آج ہی اُسے مرنا رہ گیا تھا —— اب ایسی بارش میں کیسے ہوگا سارا کام —— مرے یہ سؤدرّے۔ چلتے چلتے میاں صاحب کہہ گئے ذرا غفور کے ہاں ہو آنا۔ لو اور سنو۔ شادیوں میں تو جانے کو یہ آج فلانے دوست کے بیٹے کی شادی ہے، آج ڈھمکانے دوست کے بھتیجے کی شادی ہے اور یتیں مُھگتانے کو میں ——!

گیارہ بجے جب کام سے نمٹی تو سوچا۔ لاؤ ہو ہی آؤں۔ دین سے دنیا رکھنی پڑ رہی ہے آخر کو پُرانا ملازم ہے۔ ناک والا الگ۔ اگر اسی بات پہ روٹھ کر چلا گیا تو قیامت ہی آجائے گی۔ ایک دن نہیں آتا تو آفت آجاتی ہے۔ آج ہی کو لو، نہ کسی کو ڈھنگ کا ناشتہ ملا نہ کچھ دھوبی پھر کسی وقت پر ٹالا۔ صفائی! سوچا ایک دن میں کیا فرق پڑتا ہے۔ چلو کل ہو جائے گی۔ بارش کے بہانے بچوں کو اسکول سے روکا اور کیا کرتی۔ بچے گھر میں ہوں گے تو کچھ ہاتھ ہی بٹائیں گے۔ ارے یہ بھی بس دل کی تسلی ہے، گھر میں رہتے ہیں تو اور ادھم مچاتے ہیں اور کچھ نہیں تو لڑ لڑ کر خون خراب کریں گے۔

پھر آن کر کچھ پکا رندھ لوں گی۔ پکانا کیا ہے۔ کھچڑی وچڑی اُبال لوں گی۔ بچے تو شوق سے کھا ہی لیتے ہیں۔ میاں صاحب کا ذرا جھنجھٹ ہے۔ چاول حلق سے اُترتے

ہی نہیں بے چاروں کے۔ خیر آملیٹ، وا ملیٹ بنا دوں گی انڈے کا، کہہ دوں گی غفور ے کے ہاں دیر ہو گئی۔ ہاں تو گیارہ بجے گھر سے نکلی۔ ارے ابھی کہاں۔ سوچا اکیلی کہاں جاؤں فاخرہ کو بلوا لوں، پڑوس میں رہتی ہے، درزی کی بیوی ہے خود تو کام نہیں کرتی، مگر میں اسے درزن ہی کہتی ہوں۔ ویسے تو میں اُسے منہ نہیں لگاتی مگر کام وام پڑے تو بلا لیتی ہوں۔ آ جاتی ہے بے چاری۔ جہاں بُلایا۔ آئی پہلے تو میں نے اُس سے مُنّے کے کپڑے دُھلوائے۔ پھر ذرا چاول دال دے دیئے بیننے کو۔ کہنے لگی گھر کا بھی کچھ کام دھندا کرنا ہے۔ میں نے کہا لو منٹوں میں تیار ہوتی ہوں۔ اے تیار ہی کیا ہونا تھا، میّت کا گھر اور وہ بھی نوکر کا۔ بس جو کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ وہی پہن لئے۔ ساٹن کی شلوار تھی جامنی رنگ کی، پھول دار قمیص اور جامنی دوپٹہ۔

جیسے ہی قدم باہر نکالا منے نے رونا شروع کر دیا۔ خدا کی سنوار ان بچوں پر آندھی پانی ہیں، مرنے جینے میں ہر جگہ انہیں ساتھ لے کر جاؤ۔ "خبردار پکڑ واسے"۔۔۔ میں نے منی سے کہا۔ پہلے ہی نزکام ہو رہا ہے کہیں ہوا نہ لگ جائے۔ اندر لے جاؤ۔۔۔ "مگر وہ تو پٹخنی کھا کر وہیں لیٹ گیا، تب تو اٹھا کر اندر چھوڑ کر آئی۔ کھلونوں کا ڈھیر سامنے ڈالا مگر ان بچوں بدذاتوں کو تو جیسے کھلونوں سے بیر ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز سے کھیلیں گے، ٹوٹے ٹھیکرے گوارا، سڑی بُسی جوتیاں کلیجے سے لگاتے رکھیں گے مگر مجال ہے کسی کھلونے کو ایک دن سے زیادہ جھیل جائیں۔ ٹپک پٹک کے پھینکیں گے، کھال ادھیڑیں گے، نوچیں گے اور پھر بھی نہ ٹوٹے گا تو اُس کی طرف سے یوں منہ پھیر لیں گے جیسے دوہاجو مرد پہلی بیوی سے۔ میں بھی بچوں کے کھلونے منگوا منگوا کر رکھنے کی قائل نہیں۔ آئے کھیلے توڑے پھینکے۔ ہاں نہیں تو۔۔۔۔ مجھے ان لوگوں کے بچپن پر بڑا ترس آتا ہے۔ جن کے ماں باپ فخر سے بتاتے ہیں۔ دیکھو یہ ہمارے بچوں کے کھلونے ہیں اب تک جوں کے توں رکھے ہیں۔ ارے واہ کھلونے نہ ہوئے کیا ہوئے۔ انسان تک ٹوٹ پھوٹ

جاتے ہیں۔ ان کھلونوں بے چاروں کو کیا۔ بچا بچا کے رکھنا۔ ارے ایسے ایسے بھلے مانس بھی دیکھے ہیں کہ بچے غریب ہاتھ لگاتے کو ترسیں اور ٹین پلاسٹک کے دو دو چار چار آنے کے کھلونے سجے ہوئے ہیں۔ ایسی چڑیل شکل بھینگی کانی گڑیاں کہ آوارہ سے آوارہ مرد آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اور ایسے بھدّے جانور کو دنیا کے کسی چڑیا گھر میں ڈھونڈے نہ ملیں ــــ اور رکھے کہاں ہیں ڈرائنگ روم میں، کمال ہے۔ یہاں تو ہر سال بچوں کی سالگرہ ہوں پر ڈھیروں کھلونے آتے ہیں ویسے ہی کسٹمز میں کام کرنے والوں کو کھلونوں کی کیا کمی ہے مگر تھوڑے ہی دنوں میں سب برابر۔ جب بہت ہی بے دلی دیکھی اٹھایا کسی جگہ ڈھیر کر دیا۔ دو ایک مہینے بعد بچے نے ایک آدھ نظر پھر ڈالی۔ اس میں کچھ ٹوٹے، کچھ پھوٹے کچھ غائب غلا ہو گئے۔ پتہ بھی نہ چلا۔ کوئی کھلونا یاد آیا پوچھا پاچھا بھی تو اب کیا پتہ چلتا ہے۔ نوکر تو سب ویسے ہی امرت کے دھلے ہوتے ہیں، کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ میں بھی سوچتی ہوں چلو چھوڑو دفع کرو ویسے ہی کون سے بچّے کھیلتے تھے۔

ہاں تو بات کہاں سے شروع کی تھی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ غفورے کا لڑکا مر گیا، اچھا خاصا بیٹھے بٹھلائے۔ اچھا خاصا کیا موئے کو کوئی چار مہینے سے دست لگے تھے۔ سوکھ کے کانٹا ہو گیا تھا۔ اے ہیئے۔ جو مجھ سے پوچھو کہ آئے دن چاروں طرف جو چھوٹے چھوٹے بچّے مرتے رہتے ہیں، یہ کس سے مرتے ہیں، تو میں کہوں گی، اے بوا نہ بیماری نہ آزاری۔ یہ مرتے ہیں غریبی سے ــــ ہاں اور کیا۔ جان تو ان میں ہوتی نہیں۔ پیلے پٹ دخ۔ نہ گوشت نہ پوست، نہ خون نہ کچھ۔ بخار اور دستوں کا تو بہانہ ہے۔ غریبی تو پہلے ہی کھائے رکھتی ہے۔ بہانہ ہوا، چٹ پٹ ــــ لو ختم۔

ہاں تو جب میں پہنچی غفورے کے کوارٹر میں، اے صبح سے تو بارش ہو رہی تھی۔ جل تھل تھا۔ چپل پہنے چھپا چھپ کرتی پائنچے اٹھاتے چلی جا رہی تھی۔ چلتے وقت دس دس کے دو نوٹ رومال میں لپیٹ لئے۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ نا معلوم غریب کے پاس

کفن دفن کو بھی کچھ ہے یا نہیں، دے دوں گی۔ جب کوارٹر کے نزدیک پہنچیں تو آدم نہ آدم زاد۔ بس دو چار پاٹیاں دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ فاخرہ نے بتایا کہ دو چار لوگ آئے تو تھے، بارش ہوئی تو پاس کے کوارٹر میں جاکر بیٹھ گئے — اے لو اب ہوئی فاخرہ دروازہ پیٹ رہی ہے۔ اندر سے کوئی کھولتا نہیں، سب اپنے رونے پیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھلا — پیر جھاڑتی اندر گئی تو — سارے کوارٹر میں جیسے جھاڑو پھری ہوئی۔ کوئی سامان ہی نہیں۔ ایک کوٹھری میں دو ٹوٹے پھوٹے بکس اور دو چار پاٹیاں۔ دوسری کوٹھری میں عورتیں فرش پہ بیٹھی اپنی اپنی بیماری کا رونا رو رہی ہیں اور غفورے کی بیوی موئی چپ چاپ بیٹھی ہے۔ پیلی زرد مٹی کی مورت۔ مجھے دیکھتے ہی لگی رونے — میں نے کہا ہے ہیں ہیں خبردار — کیوں معصوم ننھی سی جان کو گناہگار کر رہی ہے۔ مر گیا، چلا گیا، تیرا کیا لے گیا۔ اے ایک کفن — کفن کے پیچھے رو رہی ہے۔ دو گز دھجی کے لئے۔ ایل لو اس کے آنسو بند ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگی۔ عورتیں کم بختیں سب کچر کچر بولے جارہی ہیں جیسے مرتے میں نہیں کسی شادی میں آئی ہوں۔ گرمی اُف توبہ۔ حبس ایسا، اس موئی کہ اچی میں بارش کے بعد ایسا حبس ہوتا ہے کہ کچھ نہ پوچھو اور وہاں کیا پنکھے دھرے تھے۔ غفورے کی بیوی کو اپنا ہی ہوش نہ تھا کہ کسی کو پنکھیا دے کہ کمبختی ذرا مکھیاں ہلا دے۔ سب اللہ ماریاں فرش پہ بیٹھی تھیں۔ ایک عورت نے ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی لاکر رکھ دی۔ میں اسی پہ ٹک گئی۔ سامنے جو نظر پڑی ایک کھرّی سی چارپائی پہ دو میلے چیتھڑے سے پڑے ہیں جس پہ مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ کچھ خیال ہی نہیں تھا مجھے۔ اب جو دیکھا تو چیتھڑے کے نیچے سے ایک چھپکلی سی جھانک رہی ہے۔ پیلی زرد۔ اے اب تم کو کیا بتاؤں، پاؤں تھا اس موئے لڑکے کا، سوکھا پیلا بنٹخ ایسی پھریری آئی مجھے کہ بس —

پھر اس کی دادی اسے اٹھالے گئی۔ موئی نہلاتی جائے۔ دھاروں دھار روتی جائے۔ دل چاہا کچھ کہوں جاکر مگر ہمت نہ پڑی۔ کیسے دیکھوں گی اس زرد چھپکلی کو — خیر جب نہلا

ڈھلا کر لائیں تو ہائے ہائے، کھانکھڑ جیسے بند، رکا مرا بچہ رنگ جیسے خوبانی کا نہ رو پتا بڑے بڑے بال اور آنکھیں پٹاخہ سی کھلی ہوئیں۔

"ہائیں یہ کیا؟ — بچے کی آنکھیں بھی بند نہ کیں۔"

"باپ نے نہ بند کرنے دیں، بولا دیکھنے دو ہمیں دیکھ رہا ہے"— دادی بولی۔

"اسے ہے ہڑی زمانے بھر کا جو بات کہے گا اوندھی —" اب کیا ہو سکتا تھا۔ کوئی ہاتھ رکھتا بھی تو جھٹ جادو کے ڈھکنے کی طرح پٹ سے کھل جائیں — مجھ سے نہ دیکھا گیا، میں تو پھر جاکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک دم جو اوپر نظر اٹھائی تو سامنے تختے پر کھلونے — اسے ہے سب میرے منّے کے کھلونے — چابی دار ریچھ، پولیس کی کار، یہ بڑی سی گیند اور خدا تمہارا بھلا کرے اسٹیمر — دیکھ کر جان ہی تو جل گئی — ایسا وقت نہ ہوتا تو بتاتی کمبختوں کو — اے لو، مجھے کیسا پتہ تھا یہ گُن بھرے ہیں اس میں۔ جب دیکھو جب پوچھ رہا ہے بھیا یہ موٹر کتنے کی ہو گی۔ بیگم صاب یہ گڑیا کہاں سے لی — میں کہتی باہر کا مال ہے تو کیا پوچھ رہا ہے، تو خرید سکتا ہے یہ؟ — کھیسیں نکال کر کہتا — "میرا چھوٹا بڑا خوش ہوتا ہے کھلونوں سے —" ہاں خوش کیوں نہ ہو گا مفت کے اچھے سے اچھے کھلونے — ماں اور دادی دھاڑیں مار رہی تھیں — میں نے بھی سوچا رونے دو مجھے کیا پڑی ہے کہ بہلاتی پھروں۔ آٹھ دس مہینے کا چھلا اور اُس کے پیچھے یوں رو رہی ہیں جیسے جواں مرگ ہو۔ اوپر سے بھدّا اور کالا۔ جو جیتے ہیں ان کی شکلیں ہی نہیں دیکھی جاتیں ہاں نہیں تو، اور اس وقت تو اور سب کے حلیے بگڑے ہوتے تھے۔ کوئی بارش کے پانی میں چوڑا بنا پھر رہا ہے تو کوئی پسینے میں — کالے بھیل، سینک سلائی توبہ!!

ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ روتے روتے ماں اور دادی نے اسے کفنایا۔ عزیزیں الگ کھڑی باتیں مٹھولتی رہیں، مجال ہے جو اُن کی مدد کر دیں — خیر خدا خدا کر کے باپ ایک چٹائی لے کر آیا جس میں بیٹے کو ڈال کر جھولی میں بھر کر لے گیا۔ اتنی دیر

وہاں بیٹھنا ایسا تھا جیسے جلتے توے پر بیٹھنا — اللہ میری توبہ — موت کا نام گالی نہیں، ہر ایک کو آنی ہے مگر خدا گواہ ہے میت میں جانا ہے بڑے دل گردے کا کام، اور پھر ایسی میت میں —

بس بھئی باپ اُدھر نکلا اور اِدھر میں نے اجازت چاہی — اجازت وجازت اُن سے کیا چاہتی تھی اور ہوش کسے تھا اجازت دینے کا۔ بس میں نے آنکھ کے اشارے سے فاخرہ سے کہا چلو اور باہر نکل آئی — لو پہلا ہی قدم بھچ سے پانی میں — گرتے گرتے بچی — فاخرہ نے سنبھال لیا — نہیں تو ہنسی ہو جاتی سارے محلے میں — چپل مواد میں پھنسا رہ گیا۔ سارس کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑی رہی — فاخرہ نے مشکل سے چپل نکالا۔ پھر چلی — کہنے کو سامنے گھر ہے مگر راستہ اتنا لمبا۔ راستے میں نالا گنوارن کی جوانی کی طرح چڑھا ہوا — پلیا پر سے گزر کر آئی۔ راستے میں پھر بارش ہونے لگی — بھیگی سو الگ — خیر خدا خدا کر کے گھر پہنچی — اور تو جو ہوا سو ہوا وہ روپے جو رومال میں لپیٹ کر لے گئی تھی کہ غفورے کی بیوی کو دے دوں گی، دینا بھول گئی — بھول کیا گئی جان بوجھ کر نہیں دیئے — کم بخت نے چالیس پچاس کے تو کھلونے ہی چرائے — اے اگر نئے نہیں تھے تو اب ایسے پرانے بھی نہیں تھے — بڑا ایماندار بنا پھرتا ہے ہوا — ہاں تو اسی افراتفری میں وہ روپے رومال سے کہیں گر گئے۔ خدا جانے اُڑ گئے، بارش میں بھیگ بھاگ کر ختم ہوئے یا فاخرہ نے چپکے سے اُٹھا لیے — ہاں بھئی کیا پتہ — سچی بات تو یہ ہے کہ انسان ذات ہے بڑی کمینی —

عوامِ متحدہ موت کا کنواں

وہ ایک بڑا سا گول کنواں تھا جس کے منہ پر چاروں طرف مختلف رنگ و انداز کے جھنڈے ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے یہ لکڑی اور لوہے کا مضبوط کنواں ایک بڑی نمائش کی چار دیواری کے اندر تھا۔ کنویں کے اوپر جس طرف آڑی ترچھی لکڑیوں کا زینہ چلا گیا تھا۔ ایک بڑے سے پارچے پر لکھا ہوا تھا "عوام متحدہ موت کا کنواں" اس تماشے کے جو کاغذ تماشائیوں میں تقسیم ہو رہے تھے ان پر بھی یہی نام چھپا ہوا تھا۔

ظہیر کو یہ نام عجیب سا لگا۔ وہ کہ ایک اخبار میں بطور صحافی کام کرتا تھا اس عوام متحدہ موت کے کنویں میں کام کرنے والوں کا انٹرویو لینے پہنچا۔

"آپ کا نام کیا ہے ؟" کنویں کے نزدیک خیمہ میں بیٹھے ہوئے اشخاص میں سے ایک سے اس نے پوچھا۔

"میرا نام مولا بخش ہے لیکن لوگ مجھے مست مولا کہتے ہیں" اُس نے دانت نکال دیئے۔

رپورٹر نے اس کا نام لکھا "آپ کا مینجر کون ہے ؟"

"مینجر وہی ہے جو کار چلاتا ہے کنویں میں —— ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اس گڑبڑ گھٹالے میں زیادہ آدمی ہوں اور بہت کھپ کھپڑ مچے ——"

"مینجر کا نام کیا ہے ؟"

"میرا نام شیرا ہے جی۔" مینجر نے بردباری سے کہا۔ وہ بہت محتاط انداز میں بول رہا تھا اور رپورٹر کو نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔

"تو تم چار موٹر سائیکل سوار اور ایک کار چلانے والا، بس یہی ہو۔"

"ہاں ۔۔۔ ویسے اور بھی بہت سے آدمی ہیں، ایک باہر تختے پر کھڑا ہو کر ڈانس کرتا ہے۔ ایک ٹکٹ بانٹتا ہے۔ کچھ مزدور ہیں مگر وہ ہماری ٹیم میں شامل نہیں ہیں۔"

"وہ کیوں؟" صحافی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ انہیں ہمارے اصل کھیل کا پتہ نہیں ہے،" مولا بخش جلدی سے بول اُٹھا۔

"اصل کھیل سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"باؤ جی آپ اس کی باتوں پہ نہ جاؤ۔" مینجر نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ وہ بہادری کے یہ کام نہیں کر سکتے اور ان کا ہماری کمائی میں کوئی حصہ نہیں۔ ہم انہیں کچھ پیسے یا روٹی کپڑا وغیرہ دے دیتے ہیں۔"

"اچھا ۔۔۔ تو آپ کو یہ ٹیم بنانے کا خیال کیسے آیا؟"

"یہ جی لمبا قصہ ہے ۔۔۔ پہلے ہماری ٹیم کسی اور شکل میں تھی۔ مطلب یہ کہ چھوٹا کنواں تھا جس میں صرف ایک موٹر سائیکل تھی، لوگوں کا اس تماشے سے دل بھر گیا اور انہوں نے اسے دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب ہم نے اسے بڑھا لیا ہے۔"

"بڑھانے سے کچھ فائدہ ہوا؟"

"بہت، اب دنیا ہمارا نام جانتی پہچانتی ہے، دور دور سے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔"

"جس وقت آپ عمودی دیوار پر اپنی موٹر سائیکل یا کار چلا رہے ہوتے ہیں، اس وقت آپ کے تاثرات کیا ہوتے ہیں، یعنی آپ کے ذہن میں کیا خیالات ہوتے ہیں۔"

"باؤ جی، جب آپ تیزی سے قلم چلا رہے ہوتے ہیں تو آپ کے کیا خیالات ہوتے ہیں۔"

صحافی سوچ میں پڑ گیا۔

"اچھا یہ بتلایئے کبھی آپ کو یہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ اس کنوئیں کی حد سے باہر نکل گئے تو ہوا میں اڑ جائیں گے اور باہر کے لوگوں کے لئے بھی یہ بات بہت خطرناک ہو گی۔"

"ہاں تو اور کیا! جب آدمی اپنی حد سے نکل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ خطرہ تو ہوتا ہے مگر خطرے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ـــــــ ہم سب ایک دوسرے کو کنٹرول کرتے ہیں ایک کار اور چار موٹر سائیکلیں اگر کنوئیں میں اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو کنٹرول نہ کریں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا حال ہو ـــــ"

"جب آپ کا تماشہ ختم ہو جاتا ہے تو آپ کیا کرتے ہیں، آرام؟"

"ہاں جی ــــ" ینجر نے کہا۔

"نہیں جی ـــــ بتا دو نا باؤ جی کو ــــــ پھر، ہم مچھلیاں پکڑتے ہیں جی" مولا بخش نے حسبِ معمول دانت نکال دیئے ــــ

ننھیرا نے گھور کر دیکھا، مولا بخش ہنس پڑا۔ دھیرے سے بولا۔ "باؤ لا ہے، چرسی ہے آنکھوں پر چشمہ چڑھا کر لکھنے آگیا ہے۔ اس کی سمجھ میں کیا آئے گا ـــــ"

"پھر بھی ہمیں محتاط رہنا چاہیئے ـــ" ننھیرا نے سرگوشی میں کہا۔

"اسے اے، موت کے کنوئیں میں احتیاط کیسی ـــــــ ہاں باؤ جی یہ نہ لکھنا کہ ہم رات کو مچھلیاں پکڑتے ہیں اس سے ہماری بے عزتی ہو گی ـ"

"بے عزتی! کیوں؟ ـــ"

"آپ نہیں سمجھو گے ـــــــ ابھی دنیا ہمیں ننھیرا جوان سمجھتی ہے، موت کے کنوئیں میں ہم ہاتھ چھوڑ کر موٹر سائیکلیں چلاتے ہیں۔ اوپر سے لوگوں کے ہاتھ سے نوٹ لینے کے لیے سو سو چکر لگاتے ہیں اگر لوگوں کو پتہ چلے گا ہم رات کے اندھیرے میں بے چاری چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں تو اس میں ہماری مشہوری نہیں ہو گی، آئی سمجھ!"

"اچھا! ـــــ اس سے پہلے آپ لوگ کیا کرتے تھے؟"

"ہم سب جی بس ایسے ہی چھوٹے موٹے کام کرتے تھے، اپنی محنت سے یہاں تک پہنچے ہیں ـ"

"یہ تماشہ تو شام کو ہوتا ہے۔ دن کے وقت آپ کیا کرتے ہیں؟"

"دن کو جی، ہم ـــــ" مولا بخش نے بات شروع کی۔

"چُپ کر ـــــ پاگل ہو گیا ہے، مروائے گا ـــــ" شبراتے آہستہ سے اسے جھڑکا اور کہا۔

"دن کو ہم آرام کرتے ہیں ـــــ"

"مگر یہ صاحب تو کچھ اور کہہ رہے تھے۔"

"تو پھر اسی سے پوچھئے کہ دن میں یہ کیا کرتا ہے"

"صاحب جی، ہم آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا سکتے ہیں پر ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"جب ہم آپ کو اپنا بیان دے دیں گے نا صحیح صحیح تو آپ کو بھی ایک چیز دینی ہوگی۔ بولو منظور ہے؟" مولا بخش بولا۔

"مگر پتہ تو چلے کہ کیا چیز ہے، میں دے بھی سکتا ہوں یا نہیں۔"

"بابو جی، معمولی چیز ہے، کوئی ایسی بڑی چیز نہیں ہے۔"

"پھر بھی؟"

"جان ـــــ" مولا بخش ہنس پڑا۔

"جان؟" ظہیر حیران ہو گیا ـــــ

"ہاں آپ کی جان، چھوٹی سی تو ہے ہلکی پھلکی، ایسی کونسی بڑی چیز ہے" مولا بخش پھر ہنسا۔

ظہیر نے چشمے کے پیچھے سے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ قہقہے لگانے لگا۔

منیجر نے بات سنبھالنے کی کوشش کی "صاحب یہ بکواس کرتا ہے، آپ اس کی بات پر نہ جائیے، جب کبھی ہمارا ناچنے والا بیمار ہو جاتا ہے تو ہم اس کے چہرے پر بھبوت

مل کر اسے جوکر بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، باہر تختے پر کہ لوگوں کو ہنسائے اور اس طرف بلائے۔"

"یہ تو باری باری ہم سب ہی کرتے ہیں، کرتے ہیں کہ نہیں؟" مولا بخش نے کہا۔

"اچھا باؤ جی اب تم جاؤ، ہمارے آرام کرنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔" بشیرا اینجر نے پاؤں پھیلائے۔

ظہیر پھر بھی بیٹھا رہا جیسے وہ اس انٹرویو سے کچھ مطمئن نہ ہو۔ مولا بخش نے اس کی بے اطمینانی تاڑ لی اور کہا ــــ "باؤ جی، ایک دم تو لگاؤ، ہمارے ہاں کی چلم بھی تو پی کر دیکھو۔"

"نہیں، میں نے کبھی نہیں پی ــــ بس سگریٹ ہی پیتا ہوں۔"

"ارے پیو تو سہی ــــ"

ظہیر نے ایک کش لگایا۔ اس کا سر گھوما، لگا موت کا کنواں الٹا ہو کر اس کے سر پر ٹوپی کی طرح جم گیا ــــ پھر وہ کنواں ہوا میں جھولنے لگا اور وہ اس کی دیواروں پر موٹر سائیکل سوار کی طرح چڑھنے لگا ــــ جب وہ کنارے پر پہنچنے لگتا موت کا کنواں فضا میں اوپر چلا جاتا اور اس کی دیواریں بھی بلند ہو جاتیں۔ وہ پانچوں اس کی ہیئت کذائی پر قہقہے لگانے لگے۔

"سن رہے ہو باؤ یا سو گئے؟" مولا بخش نے اسے چھیڑا۔

"سو گیا! اوے وہ انٹا غفیل ہو گیا، ایک ہی سٹے میں اس کی رتی گم ہو گئی۔"

"تو ایسی حرکتیں نہ کیا کر مولے ــــ" بشیرا نے تنبیہ کی۔

"کچھ نہ کچھ تو اسے یاد رہے گا ہی۔"

"اسے کچھ یاد واد نہیں رہے گا۔ سوچتا رہ جائے گا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔"

"نہیں نہیں ــــ تم نے مچھلیاں پکڑنے کی بات ہی غلط کی ــــ"

" تو وہ کیا سمجھا۔ اتنی سمجھ ہوتی تو اخبار کے دفتر میں بیٹھا بیٹھا دنیا کو دیکھتا عینک لگا لگا کر!۔۔۔ کبھی تم نے اخبار کا دفتر دیکھا ہے؟ چاروں طرف کاغذ ہی کاغذ۔۔۔ وہاں کے آدمی بھی سوکھے سوکھے کاغذ کے بنے ہوئے لگتے ہیں۔۔۔"

" جناب کیوں گئے تھے وہاں؟۔۔۔"

" ابھی نہیں گیا تھا۔۔۔ بہت پہلے گیا تھا جب ہماری یہ ٹیم نہیں بنی تھی۔۔۔ باؤجی اٹھو نا، سنو تو"

مولا بخش نے ظہیر کو جھنجھوڑا۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور یوں سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ رہا ہو۔۔۔

مولا بخش نے کہا۔۔۔" اب تم آ ہی گئے ہو تو ہم تمہیں سب کچھ بتا دیں گے، اگر ہمت ہو تو لکھ دینا۔۔۔ یہ جو ہمارا موت کا کنواں ہے نا یہ ہمارا پردہ ہے۔۔۔ کیما فلاج ہے۔ اصل میں یہ ہماری خفیہ پناہ گاہ ہے۔۔۔ تم میرا منہ کیا تک رہے ہو، میری زبان کے بدلنے پر حیران ہو رہے ہو؟۔۔۔ ہاں ہم دیہاتی نہیں ہیں نہ ان پڑھ ہیں۔۔۔ ہم سب پڑھے لکھے شہری ہیں۔ ہم میں سے کوئی پیراٹروپر (PARA TROOPER) ہے۔ کوئی غوطہ خور ہے۔ کوئی فلموں میں موٹر سائیکل سوار کی ڈمی (DUMMY) کا کام کرتا رہا ہے۔ یہ ہمارا مینجر بڑا زبردست کار ریسر (COR RACER) ہے۔ ہم شام کو یہ تماشہ کرتے ہیں، رات کو ڈاکے ڈالتے ہیں اور اپنا مال موت کے کنوئیں میں کھڑی کاروں اور موٹر سائیکلوں کے نیچے بنے تہہ خانوں میں چھپا دیتے ہیں۔ ہمارے پاس کاروں کی بہت سی باڈیاں ہیں، نمبر پلیٹ ہیں، موٹر سائیکلوں کے مختلف ماڈل ہیں۔ ہم انہیں بدلتے رہتے ہیں۔ دن میں بھی آرام نہیں کرتے باؤجی۔۔۔ ہم محنتی لوگ ہیں۔ دن میں ہمیں اپنے اپنے دفتروں میں حاضری دینی ہوتی ہے۔ حیران ہو کر کیا دیکھ رہے ہو گول گول آنکھوں سے، ہم اپنی حکومت کے ملازم ہیں، جی ہاں، ہم امن و امان کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا کوڈ ورڈ

(CODE WORD) بدلتا رہتا ہے لیکن اس میں "امن" کا لفظ ضرور آتا ہے۔ ہم دن میں جب مشن پہ ہوتے ہیں تو مجرموں کو پکڑتے ہیں البتہ اپنا کوڈ ورڈ جاننے والوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور تم جیسے اخبار والوں کے سامنے کہتے ہیں "ہم مجرموں کو عبرت ناک سزائیں دیں گے۔ امن اور آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے وغیرہ۔" مگر تم جیسا کوئی شخص جب ہماری ٹوہ لگانے آتا ہے تو ہم اسے ایک پنجرے میں بند کر دیتے ہیں۔ کچھ دن بعد اسے کھول بھی دیتے ہیں مگر اس کے بعد ہم نے کسی کو کچھ لکھتے نہیں دیکھا۔"

"اچھا اب بہت باتیں ہو گئیں، جاؤ اسے لے جا کر پنجرے میں بند کر دو۔" بشیر نے کہا۔

"نہیں بھائی، یہ تو عقل سے بالکل پیدل ہے۔ میں اسے لے جا کر پاس کے نالے میں ڈال آتا ہوں، دیکھتا ہوں صبح کو یہ کیا لکھتا ہے۔"

"دیکھو یہ خطرناک بات ہے۔"

"خطرہ تو ہر جگہ ہے، مگر کبھی کبھی خطرہ مول لینا چاہیئے۔ آخر ہم لوگ موت کے کنوئیں میں رہتے ہیں، موت سے کھیلتے ہیں اور پھر یوں ہر ایک کی جان لینی بھی ٹھیک نہیں۔ آخر ہم بھی، شانتی امن کمیٹی کے ممبران بھی تو ہیں۔"

مولا بخش قہقہے لگاتا ہوا رپورٹر کو گھسیٹ کر باہر لے گیا اور تھوڑی دور پہ بہتے ہوئے گندے نالے میں پھینک کر ہاتھ جھاڑتا ہوا آ گیا۔۔۔

"چلو، نکلو۔۔۔ آج کدھر جانا ہے؟۔۔۔"

منزل کہاں راہیں کدھر؟

مچھلیوں کی اس دنیا میں مجھے عجیب سکون سا ملتا ہے۔ شیشے کے پردے کے پیچھے مچھلیوں کی سبک خرامی اور حسین و جمیل رنگ۔ آرٹسٹ کو اور کیا چاہیئے۔ جہاں اسے سکون ملے اور رنگ ملیں وہیں اس کی جنّت ہے مگر نازیہ بات نہیں سمجھتی جتنا میں مچھلیوں سے پیار کرتا ہوں۔ اتنا ہی وہ ان سے نفرت کرتی ہے" اونہہ، کیا رکھا ہے ان میں، چپٹی، بدشکل، ابلی ہوئی آنکھیں گھن آتی ہے مجھے تو۔" وہ کہتی ہے۔

" مگر ان کے رنگ تو دیکھو۔ یہ نیلے اور سرخ کی آمیزش، رنگ ان مُنّی مُنّی مچھلیوں میں ایسے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے بلّوری گولیوں میں" اور اس کو دیکھو، ہائے سبز کاہی میں یہ اودی جھلک اور ذرا اسے تو دیکھو سر سے پیر تک کاسنی جیسے کسی نے کاسنی رنگ میں ڈبو کر نکال لیا ہو اُس دن تم اس رنگ کے کپڑے پہن کر آئی تھیں تو بالکل ایسی ہی لگ رہی تھیں۔"

" اللہ نہ کرے۔ جو میں منحوس مچھلی جیسی لگوں۔"

" تمہیں میری قسم ـــــ ذرا اسے دیکھو سلیٹی اور نارنجی دھاریاں، معلوم ہوتا ہے۔ مچھلی دو رنگا سویٹر پہنے پھر رہی ہو۔"

" سویٹر نہیں منک کوٹ (MINK COAT) کہو" وہ ہنسی۔

" بارے آپ کے چہرے پر کسی مچھلی کے طفیل مسکراہٹ تو آئی۔"

نازمسکراہٹ سمیٹ پر آمادہ ہونے ہی والی تھی کہ میں نے اسے اور باتوں میں لگا لیا۔

" تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ان مچھلیوں پر جو یہ رنگ بکھرے ہوئے ہیں ان میں کسی جانی بوجھی چیز کی تصویر نہیں ہے۔ سمر ٹی بھی نہیں ہے بس ویسی ہی رنگوں کی آمیزش ہے۔ جو تجریدی

آرٹ میں ہوتی ہے۔ ہمیں ماننا چاہیئے کہ تجریدی آرٹ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور یہ کہ اللہ میاں سب سے بڑا تجریدی آرٹسٹ ہے۔"

"ارے واہ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔"

"تو کیا اس میں کوئی برائی ہے، کیا اللہ میاں کو آرٹسٹ کہنا گناہ ہے؟ ارے بھئی اللہ میاں سے بڑا آرٹسٹ کون ہو سکتا ہے۔ وہ خالق ہے، وہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اور سوچو کہ آرٹسٹ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنا ایک اسلوب بنا لیا ہے ان کی آئی ڈینٹیٹی (IDENTIY) نکھر آئی ہے۔ ان کی کوئی بھی تصویر دیکھ کر پہچاننے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کس نے بنائی ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں بڑے آرٹسٹ کا انداز اس کا برش اسٹروک۔ رنگوں کا رچاؤ بہت حد تک ایک سا ہو جاتا ہے مگر اس عظیم آرٹسٹ نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس کا ایک خاص اسلوب ہو جائے۔ تم خود دیکھ لو ہر درخت کا پتہ مختلف ہے ہر پھول الگ ہے۔ انداز مختلف۔ رنگ الگ۔ برش اسٹروک، اسٹائل سب جدا۔ اس کی بنائی ہوئی چیزوں پر غور کرو کہیں سمٹری ہے کہیں نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں وہ بیک وقت ہر طبقہ خیال کا آرٹسٹ ہے۔ وہ ریئلسٹ بھی ہے رومانسٹ بھی ہے۔ امپریشنسٹ بھی ہے۔ فیوچرسٹ بھی ہے وہ آپ (OP) آرٹسٹ بھی ہے اور۔۔۔۔"

"بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ بڑی گرمی ہے نکلو یہاں سے۔۔۔ دیکھو تو کیسے کیسے لوگ تمہاری مچھلیاں دیکھنے آتے ہیں۔ کوئی ایک بھی شریف آدمی ہے۔ سب دیہاتی "منجی کتھے ڈھاواں" کی نسل کے۔"

"چلو۔" میں کہتا ہوں۔

ہم باہر نکل آتے ہیں۔ میں سمندر کے کنارے جانا چاہتا ہوں۔ اور وہ پلے لینڈ کے ریسٹوران میں بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتی ہے "سمندر میں کیا رکھا ہے۔ ہزاروں دفعہ دیکھا ہے۔" وہ کہتی ہے۔

وہ نہیں جانتی کہ سمندر ہر دفعہ نیا ہوتا ہے۔ انسانوں کی طرح اس کے موڈ ہوتے ہیں۔ ہر دفعہ اس کا الگ رنگ الگ مزاج ہوتا ہے اور پھر آسمان کے رنگ اور مزاج سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے آسمان نیلا ہے تو سمندر بھی نیلا ہے۔ آسمان پہ بھوسلے بادل چھائے ہوئے ہیں تو سمندر پہ بھی بھوسلا پن طاری ہے۔ سمندر کبھی خوش ہوتا ہے۔ کبھی پرُسکون ہوتا ہے۔ کبھی پھرا ہوا ہوتا ہے۔ کبھی خوبصورت ہوتا ہے کبھی بدصورت ہوتا ہے مگر ناز یہ بات نہیں سمجھتی۔ اس کے نزدیک سمندر صرف پانی کے اربوں کھربوں قطروں کا مجموعہ ہے اور بس۔ جی چاہتا ہے۔ اس سے پوچھوں بھلا پلے لینڈ میں کیا ہے؟ بچوں کے کھیل اور کھانے پینے کی چیزیں۔ بند کمرے میں جس کا ایئر کنڈیشنر نہ چل رہا ہو، گھٹن بے تحاشا ہو، بڑے بڑے شیشوں پہ لدھڑ مکھیاں چمٹی بیٹھی ہوں، فرش پہ کاغذ اور پانی بکھرا ہوا ہو تو آمنے سامنے میز پہ بیٹھ کر کھانے میں کیا مزا ہے!

میں نے ایک دن سمندر کنارے کی دکانوں سے ناز کو کوئی تحفہ دینا چاہا۔ "ہو نہہ یہ چیپ مجھے نہیں چاہیئے،، وہ برا سا منہ بنا کر ہٹ گئی۔ مگر مجھے وہ سب چیزیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ کوڑیوں کے بُندے، وہ سیپ کے ہار، وہ نئے نئے نمونوں کے راکھ دان پھر مُٹی مُٹی کوڑیوں کے بنے ہوئے سفید براق ٹائیس تو اتنے خوبصورت تھے کہ مہارانیوں کے کان بھی سج جائیں۔ مجھے ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی دو روپے دے کر میں نے انہیں خرید لیا میرا خیال تھا ناز انہیں دیکھ کر اُچھل پڑے گی کہ تم تو واقعی گوہر نایاب نکال لائے مگر میرے دکھانے پر۔ اس نے بڑے انجان پن سے کہا۔ "کس کو دو گے۔ تمہاری تو کوئی چھوٹی بہن بھی نہیں ہے۔،،

"دے دوں گا کسی کو۔،، میں نے کہا اور وہ ٹائیس جیب میں ڈال لئے۔

اور یہی میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جب مجھ میں اور اس میں اتنے اختلافات ہیں۔ تو پھر ہم کیوں ملتے ہیں۔ میں فاقہ مست آرٹسٹ ہوں اور اس میں خوش ہوں۔ وہ معمولی ٹیچر ہے۔

مگر اس پر قانع نہیں ہے وہ اپنی چچازاد بہنوں کی طرح کاروں میں گھومنا چاہتی ہے اعلیٰ ہوٹلوں میں کھانا چاہتی ہے۔ اسے بیب اچھے نہیں لگتے۔ اُسے قیمتی پتھروں سے محبت ہے۔ یہ جانتے بوجھتے کہ میں یہ سب مہیا نہیں کر سکتا میں اس کی تمناؤں کی اڑانوں تک نہیں پہنچ سکتا اور وہ میری سطح تک نہیں آسکتی میں کیوں اس سے یہاں وہاں ملنے کی درخواست کرتا ہوں اور وہ کیوں آجاتی ہے۔ ہر مرتبہ، ہر ملاقات کے بعد کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے درد دل میں اضافے کے، احساسِ محرومی اور ایک خلش بے نام کے۔ پھر ہم کیوں ملتے ہیں! کیوں ملتے ہیں!! یہ ہے وہ سوال جو اس وقت میں بیلے لینڈ کے سامنے ٹمن کے کٹاؤ دار چھجے والے پتلے سے راستے پر انتظار کرتے ہوئے اپنے آپ سے کر رہا ہوں۔ سامنے مندر کی چھت پر اور زمین پر بے شمار کبوتر سمندر کی چھوٹی موٹی لہروں کی طرح کلبلا رہے ہیں۔ ہوا میرے بال اُڑائے دے رہی ہے، دُور مزار کا سفید گنبد چمک رہا ہے۔ خوش لباس عورتیں اور خوبصورت رنگوں میں ملبوس بچے تیز تیز قدم اٹھاتے بیلے لینڈ میں جا رہے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک نہیں آتی ہے۔ وقت کتنی مشکل سے گذر رہا ہے۔ اگر ہم نے ملنے کی یہ جگہ طے نہ کی ہوتی تو اتنی دیر میں سمندر کے کنارے چند اسکیچ ہی بنا لیتا یا مچھلی گھر میں مچھلیوں کے رنگوں ہی سے دل بہلا لیتا۔

برقعے میں ملبوس ایک عورت اپنی بارہ چودہ سالہ لڑکی کو جھڑک رہی ہے "زاہدہ چلی آ، میں نہیں خرید کر دوں گی، ٹا پس میرے پاس فالتو پیسے نہیں ہیں۔"

"ہائے اماں تم آکر دیکھو تو، کیسے خوبصورت ہیں، مُنّی مُنّی کوڑیاں بالکل سفید موتیوں کی طرح۔"

"بس رہنے دو۔ سمندر پر چلنا ہے تو چلو۔ ورنہ یہیں سے لوٹ چلتے ہیں۔"

"نہیں اماں۔ سمندر پر ضرور جائیں گے" لڑکی چپل گھسیٹتی ماں کے ساتھ ہولی۔ اس کے معصوم سانولے چہرے پر کیسی مایوسی ہے۔ ہوا اس کے لمبے لمبے بالوں سے کھیل رہی

ہے اور اس کے دوپٹے کو اڑا لے جانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس نے سرخ کرتے پہ زرد دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے مگر وہ کیسا سج رہا ہے۔ شاید اس نے مچھلیوں سے رنگوں کی آمیزش سیکھ لی ہے۔ وہ خود ایک چھوٹی سی، خوبصورت سی مچھلی نظر آرہی ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا شاید اس دن کے ٹاپس پڑے ہوں۔ نہیں، وہ تو میں نے دراز میں ڈال دیئے تھے۔ میں دوڑ کر دکان سے ایک جوڑی ٹاپس خرید لایا۔ دونوں ماں بیٹیاں سمندر کی طرف جاتے والی ڈھلان پہ پہنچ چکی تھیں۔ میں نے لڑکی کے بجائے ماں کو یہ ٹاپس پیش کئے۔ وہ بھڑک اٹھی "اے واہ ہم کوئی فقیر ہیں"۔

"مجھ سے ان کی مایوسی نہیں دیکھی گئی"، میں نے کہا۔

"رہنے دو۔ میں سب چلتر بازیاں سمجھتی ہوں"۔

لڑکی کی آنکھوں میں جو امید طلوع ہوئی تھی۔ مایوسی کی دھند میں ڈوب گئی۔ میں نے ان کے سامنے ہی دونوں ٹاپس ریت میں اچھال دیئے اور سر جھکا کر بیٹھے ہوئے کتے کی طرح پلے لینڈ کے دروازے پہ دوبارہ آکھڑا ہوا شاید میں خود بھکاری ہوں مگر میں کیسا بھکاری ہوں کہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں بھیک میں کیا چاہتا ہوں۔ نازا بھی تک نہیں آئی ہے۔ میں یونہی ہولے ہولے چلتا سمندر کے کنارے چلا جاتا ہوں۔ آج سمندر کیسا میرے دل کی طرح بے رنگ ہے۔ آسمان پہ بھوسلے بادل ہیں اور سمندر کا رنگ جیسے ریت کا رنگ۔ دور سے جھاگ بھری اچھلتی لہریں یوں معلوم ہو رہی ہیں جیسے ریت پر کہیں کہیں پانی پڑا ہو۔ میں سوکھی بھربھری ریت پہ قدم دھرتا پکی ڈرائیور پہ آجاتا ہوں۔ برقعے میں ملبوس بہت سی عورتیں ڈھیر سے بچوں کے ساتھ سمندر کی طرف جارہی ہیں۔ جب تک یہ ڈرائیو رنہیں بنی تھی اور پتھروں کا ڈھیر سمندر کے سینے کی پیر نہیں بنایا گیا تھا۔ یہاں کتنا عمدہ سمندر کا کنارا تھا۔ دور دور تک ریت کی لہروں پہ لیٹا ہوا سمندر ریت سے اٹکھیلیاں کرتا آگے تک آتا اور پلٹ جاتا اور اب وہ کیسے جنونی انداز میں اس پتھر کی دیوار سے سر ٹپک رہا ہے

جیسے آج وہ نہیں یا یہ دیوار نہیں۔ اس ڈرائیو نے جہاں تک فی الحال گاڑیوں کی رسائی بھی نہیں میری نظر میں سمندر کا سارا حسن خاک میں ملا دیا ہے۔ مٹی سے اٹی یہ ڈرائیو اور منڈیر پار کر کے نوکیلے پتھروں سے الجھتا میں سمندر تک پہنچ گیا اور ایک چپٹے پتھر پہ سمندر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سارے آسمان پر مٹیالے بادل تھے۔ جن میں کہیں کہیں سفید بادلوں کی لہریں تھیں جیسے مٹیالے سمندر پر سفید جھاگ کی لکیریں۔ سمندر سے نکلی ہوئی پتھر کی چٹانیں بھی مٹیالی ہیں۔ ایک بڑی سی چٹان مانو کوئی شخص سمادھی لگائے بیٹھا ہو۔ منوڑہ کے کنارا اور دور سمندر کے جہاز یوں نظر آ رہے ہیں جیسے کوئی تصویر برس ہا برس دیوار پہ لگی لگی دھندلی پڑ گئی ہو۔

اس نام نہاد ڈرائیو کی رکاوٹ کے لئے لگائے ہوئے بڑے بڑے پتھر ڈھی ہوئی مورتیوں کی طرح ٹیڑھے میڑھے پڑے ہیں۔ پتھر کی دیوار پر چل کر آتا ہوا کوئی شخص دور سے ہیولہ سا نظر آ رہا ہے۔ آج سمندر کا موڈ بے طرح خراب ہے۔ ہوا ہمیشہ کی طرح تیز اور مچھلی کی بو میں بسی ہوئی ہے۔ ابھی ابھی ایک دو انچ کی مچھلی لہر کے ساتھ بہتی آئی اور میرے پاؤں میں اٹکی رہ گئی۔ یہ اتنی سی مری ہوئی مچھلی بھی مجھے خوبصورت لگ رہی ہے۔ جب کہ ناز کو ہر مچھلی بری معلوم ہوتی ہے۔ ہم آج تک کسی بات پر متفق ہوئے ہیں؟ ہاں ایک دن ہم دوبارہ ملنے پر متفق ہو گئے تھے یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ ڈرائیو ابھی نہیں بنی تھی اور کاریں سمندر کے کنارے تک جایا کرتی تھیں۔ اس وقت تک کلفٹن بیچ اتنا گھٹیا نہ ہوا تھا کہ ناز جیسی لڑکیاں وہاں آتے ہوئے منہ بنائیں یا ہو سکتا ہے ناز کے چچا اس وقت تک اتنے امیر نہ ہوئے ہوں کہ یہ سمندر ان کی پوزیشن کے لائق نہ رہتا۔ ابھی ناز کے چچا ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں شفٹ نہ ہوئے تھے اور ان کے پاس فقط ایک گاڑی تھی جس میں سب کزن بھر کر سمندر کی سیر کو نکلے تھے اور سمندر کے اتنے نزدیک چلے آئے تھے کہ گاڑی ریت میں دھنس گئی تھی۔ اس کے پہیے کو اٹھو کے

بیل کی طرح ایک ہی جگہ گھوم رہے تھے نہ آگے چلتے تھے نہ پیچھے ہٹتے تھے۔ کار والوں میں لڑکا صرف ایک تھا اور پتلی کمر کی بے دم۔ درود لڑکیاں نہ جانے کتنی تھیں، نوزائیدہ بلی کے بچوں، چوزوں اور لڑکیوں کو ایک نظر میں گن لینا خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ یہ سب ہلتے بہت ہیں اور ایک دوسرے میں گھستے نکلتے رہتے ہیں۔ بہر حال میں نے گاڑی کو دھکا لگانے کی پیش کش کی کچھ اور لوگ بھی آگئے خاصی کوشش کے بعد گاڑی نکلی اور ایک اچھا بڑا گڈھا چھوڑ گئی۔ شکریے کے طور پر انہوں نے مجھے گھر تک چھوڑ دینے کی ضد کی۔ گو کار میں جگہ کم تھی مگر کسی نہ کسی طرح مجھے ٹھونس لیا گیا۔ راستے بھر لڑکیوں کی چون چان سے کان پڑی آواز سنائی نہ دی۔ مگر جب کار کے واحد لڑکے نے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں اور میں نے کہا کہ تصویریں بناتا ہوں تو جیسے کار میں یکایک سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اس کے بعد مجھ سے کوئی سوال نہ کیا گیا اور جہاں میں نے کہا شکریے کے ساتھ مجھے اتار دیا گیا۔

نانسے دوسری ملاقات ایک آرٹ گیلری میں ہوئی۔ کسی مشہور آرٹسٹ کی نمائش تھی۔ مہمان بہت زیادہ تھے۔ کرسیاں کم تھیں۔ میں ایک جگہ کیلے کے درخت کے سائے میں کھڑا اپنے جیسے ایک نئے آرٹسٹ سے باتیں کر رہا تھا کہ ڈرتی جھجکتی وہ اندر داخل ہوئی اور اتنے مجمع میں کسی جاننے والے کو نہ دیکھ کر کچھ اور پریشان ہو گئی۔ یکایک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھ ہی کو غنیمت سمجھتی ہوئی وہ میری طرف چلی آئی۔ مگر آج میں سوچتا ہوں کہ آرٹ میں اسے ایسی دلچسپی کبھی بھی نہ تھی تو کیا وہ وہاں صرف میری تلاش میں آئی تھی۔ یہ بات میں نے پھر کبھی بھی اس سے نہ پوچھی۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ سمندر پر وہ اپنے چچا زاد بھائی اور بہنوں کے ساتھ تھی وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک غیر معروف علاقے میں رہتی تھی اور ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ مختصر تقریر کے بعد ٹیپ کاٹا گیا اور پھر جو نمائش دیکھنے والوں کا ریلا بڑھا تو سانس لینا دشوار ہو گیا۔ جلد ہی ہم باہر نکل

آئے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اسے تصویروں میں دلچسپی ہے تو پھر کسی دن آن کر دیکھے۔ میں خود کسی دن اطمینان سے ساری تصویریں دیکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یوں ہمارے دوبارہ ملنے کا وقت طے ہوگیا۔ اس دوسری ملاقات کے بعد اکٹھے پکچر دیکھنے کا پروگرام بنا۔ نازنے بتایا کہ ویک اینڈ اور چھٹیاں اپنے چچا کے ہاں گزارتی ہے اور صرف وہیں سے وہ کہیں تنہا جانے کا تصور کرسکتی ہے ورنہ اپنے گھر میں تو اس پر اس قدر سختی ہے کہ اسکول کے علاوہ وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ یوں ہم ملتے رہے ملتے رہے اور آہستہ آہستہ ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم میں کوئی بات مشترک نہیں ہے۔ کوئی شوق یکساں نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ہماری اُمنگوں اور آرزوؤں میں بھی کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ پھر وہ کیا چیز تھی جو مارے باندھے کے میاں بیویوں کی طرح ہمیں ساتھ ساتھ پھرنے پر مجبور کرتی تھی۔ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ہر ملاقات کے بعد اگلی ملاقات کا وقت طے کرکے میں سوچتا کہ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ اس طرح ہماری اس بے مقصد دوستی کا تار ٹوٹ جائے گا وہ ناراض ہو جائے گی بلا سے، ہو جائے مگر جب وقت آتا تو میں وہاں موجود ہوتا۔ وہ زیادہ تر چچا کے گھر کی باتیں کرتی رہتی اپنے سب کزنوں کے رومانوں کے راز اس نے مجھ پر افشا کر دیئے تھے۔ اس کا چھا یہ جھلّو کزن جسے وہ جلّو کہا کرتی تھی کسی بڑے مل اونر کی لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ اس کی سب سے بڑی کزن کسی شادی شدہ شخص کی محبت میں پھنس گئی تھی اور ان دنوں بے حد دُکھی تھی۔ اس سے چھوٹی بہن کا منگیتر امریکہ میں تھا۔ اس بے چاری نے وقت گزاری کے لئے چند لوائے فرینڈ بنا رکھے تھے جن میں سے ایک کے ساتھ وہ سنجیدہ ہو چلی تھی اس کے چچا کے گھر میں کوئی نہ کوئی کرائسس ہمیشہ رہتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنے گھر کے حالات بھی بتلائے۔ اس کے والد بے حد سخت مزاج تھے۔ امّی اتنی ہی نرم دل تھیں۔ اس کے بہن بھائی سب انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ کوئی انتہا کا ضدی تھا۔ کوئی حد کو پہنچا ہوا کاہل تھا۔ کوئی سر سے پیر تک کتاب کا کیڑا تھا۔ کوئی کتاب کو ہاتھ لگانا

گناہ سمجھتا تھا۔ وہ ان سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ اپنے گھر میں اس کا زیادہ دل نہیں
لگتا تھا اور اسی لئے وہ ہر ہفتے چچا کے ہاں آجاتی تھی۔ ماں باپ کا خیال تھا کہ شاید
چچا اس کے لئے کوئی مناسب بر ڈھونڈھنے میں کامیاب ہوجائیں۔ ایک ملاقات میں
اس نے مجھے بتایا کہ کل رات جلّو کی دوست کے گھر پارٹی تھی۔ ہائے کس غضب کا کراوڈ تھا۔
کس غضب کا کھانا تھا۔ لوگ ناچ ناچ کر پاگل ہو گئے۔ اُف۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے
جیسے رات کا شور اب تک اس کے کانوں میں گونج رہا ہو۔ رات کے شور کے ساتھ
پارٹی میں دیکھے جانے والے بہت سے انداز، بہت سے لباس، بہت سے زیورات
بھی شاید اس کے دل میں حسرتوں کی گرہیں بن کر بیٹھ گئے تھے۔ جبھی اس کا دھیان
بار بار رات کی پارٹی کی طرف لوٹ جاتا تھا یا جلّو کی دوست کی طرف۔ "جلّو کو
بے حد چاہتے ہیں اور وہ بھی جلّو کو بے حد چاہتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو
اتنے قیمتی پریزینٹ دیتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔"

وہ استانی تھی۔ اس کی یہ نفسیاتی کیفیت اس کے شاگرد بچوں کے لاشعور میں
چھپ کر بڑے ہونے پر انہیں کتنے دکھ دے گی۔ یہ سوچ کر میں اُداس ہو گیا۔ لیکن میں
نے ناز سے کچھ نہ کہا اور اگر کہتا بھی تو وہ میری بات ہرگز نہ سمجھتی اور آخری ملاقات میں
اس نے یہ بتایا تھا کہ اب یہ بات کھلا راز ہے کہ جلّو کی دوست اس سے قطعی مخلص نہیں
ہے۔ وہ ایک غیر ملکی لڑکے سے دوستی بڑھا رہی ہے۔ مگر جلّو کو ابھی معلوم نہیں ہے۔
جس دن جلّو کو پتہ چل گیا۔ خون خرابہ ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اس کے چچا کا گھر پھلکڑی لگی
چتا کی طرح بالکل تیار تھا۔ ہوسکتا ہے آج ناز کے نہ آسکنے کی وجہ یہی ہو کہ گھر میں کوئی
زبردست سانحہ ہو گیا ہو۔ جلّو نے قتل کر دیا ہو یا خودکشی کر لی ہو۔

ایک بڑی لہر آئی اور اس کے پوری طرح ٹوٹنے سے پہلے دوسری آنے والی لہر نے
اس کا راستہ روک دیا اور شیر بچّے کی طرح اسے دوبارہ اپنے ساتھ بہا لاتی۔ دونوں کا

زور اتنا زیادہ ہوگیا کہ پانی میرے پتھر کے اوپر سے گزر گیا اور میرے کپڑے تر ہوگئے۔ میں چھوٹے بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ضرور سمندر کا موڈ بہتر ہو چلا ہے۔ میرا موڈ بھی شگفتہ ہوگیا گیلے جوتوں کو ہاتھ میں لے کر پتلون کے چڑھے ہوئے پائینچے کھولتا میں ڈرائیو پر آگیا۔ اب چلنا چاہیئے۔ ابھی تو بہت دُور جانا ہے۔ پلے لینڈ کے سامنے ہی مجھے بس پکڑنی ہے۔ ٹھنڈی ہوا میرے ہاتوں اور گیلے پیروں کو اچھی لگ رہی تھی۔ بہت جلد یہ تیز ہوا میرے کپڑے سکھا دے گی۔ آج مچھلیوں کو دیکھنے نہیں جاؤں گا، پھر کبھی سہی۔

آج پہلی مرتبہ ہے کہ وہ وعدہ کر کے نہیں آئی ہے۔ شاید اُسے احساس ہوگیا ہے۔ کہ ہمارا ملنا اور ملتے رہنا بے فائدہ ہے۔ ہم اچھے میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ ہم اچھے دوست بھی نہیں بن سکتے تو ملتے رہنے سے حاصل؟ وہ آج کل اپنے چچا کے ہاں ہے چچا کے گھر آسائشوں کے درمیان رہتے ہوئے اسے میرا وجود اور بھی حقیر نظر آتا ہے۔ شیشے کے اندر بند یدوضع مچھلی جیسا۔ گو چچا کے ہاں اسے بڑی آزادی ہے، وہ بے روک ٹوک جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ واپسی کے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔ جب کہ اپنے گھر میں پانچ منٹ اسکول سے دیر ہو جاتے تو ابّا سر پر آن کھڑے ہوتے ہیں۔ ابّا اور چچا کے گھر کے ماحول کے اس فرق نے ہی اس کی شخصیت کو عجیب سا بنا دیا ہے۔ اسے چچا کے گھر کی آزادی اور آسائش پسند ہیں مگر اُسے معلوم ہے۔ یہ سب کچھ اس کا نصیب نہیں ہیں وہاں اس کا لاکھ خیر مقدم ہو مگر یہ احساس کہ وہ ایک غریب کزن ہے۔ اسے گھلائے جاتا ہے جس کا غم و غصہ وہ مجھ پر بھی اتارتی ہے، چھوٹے بہن بھائیوں پر بھی اور بغیر غلاف کے مونڈھوں پر بھی جن کو وہ آتے جاتے ٹھوکر مارتی ہے یا پھر اپنے گھر کے معمولی کھانے پر کہ دو دو وقت کھانا نہیں کھاتی۔ چچا کے گھر سے آنے کے بعد اسے اپنے گھر کی ہر چیز کتنی بے مایہ اور حقیر نظر آتی ہے یہ بات بھی اس نے خود مجھے بتائی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے گھر کی عادی ہونے لگتی ہے تو پھر میں اسے یاد

آنے لگتا ہوں اور مجھ سے ملنے کے لئے پھر بچا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ یہ سائیکل چلتی رہتی ہے نہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا ہے اور نہ میری سمجھ میں کچھ آرہا ہے۔

اب اندھیرا ہو چلا ہے۔ پلے لینڈ کی رنگین بتیاں جل اٹھی ہیں۔ سارے کبوتر حجروں میں اعتکاف کرنے والے صوفیوں کی طرح اپنے اپنے کابک میں دم سادھے بیٹھے ہیں۔ دُور ڈو جم کارز کا "ڈی" چاروں طرف کی تاریکی میں ادھر لٹکا چمک رہا ہے۔ نیچے جالی کی چھت سے نکل کر روشنی اوپر آنے کی کوشش کر رہی ہے اب آنے کا وقت نہیں جانے کا وقت ہے۔ میرا دل مجھ سے کہتا ہے۔ میں بس کی طرف بڑھتا ہوں۔ بس میں چڑھتے ہوئے میں دیکھتا ہوں۔ ناز ایک لمبی سی کار سے اُتر رہی ہے اس کی باریک ساڑھی ہوا سے اُڑی جا رہی ہے۔ بال بے قابو بچوں کی طرح سمیٹے نہیں سمٹ رہے اس کا کزن جِلّو اس کے ساتھ ہے پلے لینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے جِلّو نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ ناز کی آنکھوں میں ذرا سی بھی تلاش نہیں ہے۔ شاید اسے یقین ہے کہ میں واپس جا چکا ہوں وہ جِلّو سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ وہ پلے لینڈ کی ٹین کی چھت والے راستے سے تیزی سے سیلف سروس ریستوران کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری بس تیزی سے ڈھلان پر اُتر رہی ہے۔ کراچی کی نیم دائرے کی شکل کی روشنیاں مصنوعی موتیوں کی ان مالاؤں کی طرح دُھندلی ہیں جن پر ریت پڑ گئی ہو۔

میرے تصور میں ناز اور جِلّو سیلف سروس ریستوران میں اسٹیل کی ٹرے کو لبالب بھرے کھڑکی کے نزدیک والی آخری میز پر آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ سامنے شیشے کی دیوار پر لدھڑ مکھیاں مردہ معلوم ہو رہی ہیں۔ شیشے کے پار سمندر ریت کے صحرا میں سراب کی طرح کہیں کہیں چمک رہا ہے۔ مگر نہیں اب تو وہ اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔ نیچے مچھلی گھر دیکھنے والوں کی کاریں کھڑی ہیں۔ سامنے باغ میں ہنڈولوں کی رنگین بتیاں جھلملا رہی ہیں۔ اور دُور خلا میں بڑا سا ڈی لٹک رہا ہے اور وہ "ہاٹ ڈاگ"، کو بہت سی چٹنی

میں لیتھرڈ کر کھاتے ہوئے پرنس میں دکھائی جانے والی کسی پکچر کی بات کر رہے ہیں۔

میرا اسٹاپ آگیا ہے۔ میں اُتر گیا ہوں اور اس اسٹاپ کے دوسرے مسافر بھی۔ ارے ان میں وہ لڑکی اور وہ عورت بھی ہے جن کو میں نے ٹاپس پیش کیے تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت وہ ٹاپس لڑکی کے کانوں میں ہیں۔ وہ کتنی پیاری لگ رہی ہے مجھے دیکھ کر وہ شرما گئی ہے مگر اس کی نگاہوں میں تشکر ہے اور کچھ ایسا تاثر جیسے میں اس کے لئے بالکل اجنبی نہیں ہوں۔ شاید وہ مجھے جانتی ہے۔ آخر وہ اسی محلے میں رہتی ہے۔ شکر ہے کہ اس کی ماں نے مجھے نہیں دیکھا یا دیکھ کر انجان بن گئی ہے۔ ارے تو کیا یہ ہمارے گھر سے اتنے نزدیک رہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ میرے پڑوسی ہیں۔ کمال ہے۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ مجھے مچھلیوں سے عشق ہے۔ مگر میں تتلیوں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ تتلی! جو پانی کو موت سمجھتی ہے۔ اور فن کاروں کی انا کی طرح ہوا میں اُڑتی رہتی ہے یہ ہم انسانوں کی ناسمجھی ہی تو ہے کہ سیپ ڈھونڈنے ہوں تو جوہری کی دکان پر جاتے ہیں۔ خدا کی تلاش ہو تو آدمیوں کی جبہ سائی کرتے ہیں۔ جبھی تو یہ ہوتا ہے کہ جنہیں کوہ پیمائی کا شوق ہو۔ وہ پہاڑ کی تہہ میں کان کنی کرتے پائے جاتے ہیں۔ ہماری منزل کچھ اور ہوتی ہے اور ہم راہ کچھ اور ہی اختیار کرتے ہیں۔ اگر مجھے مچھلیوں سے عشق ہے تو مجھے پانی کے نزدیک رہنا چاہیئے۔ ہوا میں اُڑنے کی کوشش کیوں؟

پُل

اور وہ آدھا پل خستہ خراب زنگ آلود کیلوں سیمنٹ کے بجائے ریت کے ڈھیروں پر ٹھہرا ہوا پل کھڑا تھا اس پر تازہ شفق رنگ، لہو کا رنگ ڈوبتے سورج کی روشنی میں دریا پہ اپنا عکس ڈال رہا تھا۔ اور پل پہ چلنے والے سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے ان کے نیچے دریا ہے پل ٹوٹا ہوا ہے۔ باہر دشمن کی ناکہ بندی ہے اب کیا ہوگا! اب کیا ہوگا! آدھا پل ان سے چھن گیا گیا۔ ان کے بھائی بند قتل ہو گئے یا قید ہو گئے اور پل کے نیچے زمین نہیں ہے۔ سب کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ اس دریا میں کود جائیں اور ڈوب جائیں۔

یہ پل آج سے نہیں برسوں سے شکستہ تھا اور ناقابل اعتبار ہر ایک کہہ رہا تھا اس کی جگہ فوراً دوسرا پل تیار ہونا چاہیئے۔ ورنہ ایک دن یہ سب کو لے ڈوبے گا۔ ہر ایک اپنی جگہ یہی کہہ رہا تھا۔ مگر کوئی کچھ نہیں کر رہا تھا۔ جن کے ہاتھ میں پل کی تعمیر کا کام تھا ان کے بڑے بڑے منصوبے تھے وہ کہہ رہے تھے۔ ہاں پل تعمیر ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ اپنے وقت پر ہوگا۔ اس کی تعمیر کے ابتدائی مرحلے شروع ہو گئے ہیں اور ابتدائی مرحلے واقعی شروع ہو گئے تھے۔ ایک ماہر امریکہ گیا ہوا تھا یہ دیکھنے کہ اگر پل پرانا ہو جائے تو اس کو ڈھایا کیسے جاتا ہے۔ ایک ماہر جرمنی گیا تھا یہ جاننے کہ نیا پل بنانا ہو تو دریا کے پانی کا رخ موڑا کیسے جائے۔ ایک ماہر فرانس گیا تھا۔ یہ سیکھنے کہ دریا کا رخ موڑا گیا تو مچھلیوں کا کیا کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی اور ہزاروں ماہرین مختلف کاموں کے لئے گئے ہوتے تھے۔ نیا پل بنانے کے لئے رقم درکار تھی جو ملک رقم دینے کو تیار تھے وہ پل کو رہن رکھنا چاہتے تھے اور یہ کام بغیر وہاں جائے کیسے ہو سکتا تھا اس کے علاوہ پل کا ڈیزائن، اس کا رخ اس کے اوپر اور نیچے سے گزرنے والی سڑکوں اور ریل

کی پٹڑیوں کا تعین کچھ ایسی آسان بات نہیں تھی۔ سب کے لئے ماہرانہ قابلیت درکار تھی۔ لوگ دھڑا دھڑ باہر جا رہے تھے۔

اب وہ واپس آئیں تبھی تو پل بنے۔ اُدھر ٹوٹے خستہ پل کی دروسری کو بھلانے کے لئے باہر اور بہت کچھ تھا۔ حسین مناظر۔ مہروشائیں۔ شبانہ کلب اور بھی بہت کچھ چنانچہ پل اور اس کی تعمیر کا خیال ان کے ذہن سے جلد ہی اُترجاتا۔ پھر جب روپیہ ختم ہونے لگتا تو وہ واپس آتے تاکہ اور روپیہ کما کر پھر نئے سرے سے تربیت حاصل کرنے چل دیں۔

اتنے دن میں پُل کچھ اور پرانا کچھ اور خستہ ہو جاتا۔ جب دوسرے لوگوں نے دیکھا کہ نہ نیا پل بنتا ہے نہ ماہرانہ ٹریننگ لینے والے ہی آتے ہیں تو انہوں نے بھی موقع غنیمت جانا۔ پل کے نٹ بولٹ تو ڈھیلے تھے ہی لوگوں نے نکالنے شروع کر دیئے۔ جب نٹ بولٹ نہ رہے تو پل کے دوسرے حصے نکالنے بھی مشکل نہ رہے۔ جس کے جو ہاتھ لگتا نکال کر چلتا بنا۔

جب پل بالکل ہی جھولنے لگا اور اس پر چلنا بھی دوبھر ہوا تو نگران گھبرائے۔ کم از کم ماہرین کی واپسی تک اگر پل کسی طرح سلامت رہ جائے۔ مرمت ہونی چاہیئے مگر مرمت کیسے ہو؟ اس کے لئے روپیہ درکار ہے قابلیت درکار ہے۔ آدمی درکار ہیں، مگر کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ پل کے دونوں کناروں پر کھڑے ہوئے سپاہی دستوں کو بلایا گیا۔ خبردار جو کوئی پل میں سے کچھ نکالے اسے گولی مار دو اور وہاں مرمت کا کام فوری طور پر شروع ــــ مرمت کرنے والوں کو بلا کر پل کے مختلف حصے بانٹ دیئے گئے۔ ماہرین تو باہر دادِ عیش دے رہے تھے۔ مرمت کرنے والوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ بندوقیں سر پر تھیں۔ جس کی جو سمجھ میں آیا کرنے لگا۔ کسی نے کسی پرانے پل کے ڈھانچے کا کوئی حصہ اٹھا کر الٹا سیدھا جوڑا۔ جہاں فٹ نہ ہوا۔ وہاں رسّی اور ڈوریاں باندھیں۔ کسی نے لوہے کی جگہ ٹین لگایا۔ کسی نے سیمنٹ کی جگہ مٹی سے کام چلایا۔ پھر سب کی سمجھ میں ایک بات آگئی۔ کچھ کرو نہ کرو۔ آخر میں پل پر بھڑک دار رنگ کردو۔ چنانچہ جب پل کی مرمت کی ضرورت ہوتی۔ لوگ بلائے جاتے وہ اِدھر اُدھر

کیلیں ٹھونک کر پل پہ ایک نیا زنگ کر دیتے۔ پل کا رنگ کبھی سفید، کبھی ہرا کبھی نیلا ہو جاتا اور زنگ پرانا ہوتا تو کئی کئی رنگ بیک وقت جھلکیاں مارتے جن کو چھپانے کے لئے ایک اور تہ جما دی جاتی۔

پل پر زنگ کی تہیں چڑھتی رہیں مگر اندر سے وہ اور کمزور اور کمزور ہوتا گیا۔ لوگ جانتے تھے مگر بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ پُل کے بارے میں کچھ بھی کہنا غلط تھا۔ پل پہ جو سپاہی تعینات تھے۔ ان کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جس کسی کو پل کے بارے میں کچھ کہتے سنیں اسے پکڑ کر پل کے ستونوں میں بنے ہوئے تہ خانوں میں بند کر دیں اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ لوگوں کو اپنی جان عزیز تھی وہ پل پر سے دھیرے دھیرے خاموش قدم رکھتے یوں گزرتے جیسے وہ اندھے بھی ہوں گونگے بہرے بھی ہوں اور لولے لنگڑے بھی۔

رات کو سپاہی سو جاتے تو پل کے حصے چرانے والے پھر آ موجود ہوتے۔ سپاہی تنہا رہتے رہتے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے ان چوروں سے یارانہ گانٹھ لیا۔ مرمت کرنے والے بھی ان کے دوست بن گئے۔ اس طرح وقت اچھا کٹنے لگا۔ سب بیٹھ کر مزے سے تاش کھیلتے۔ پھر پل میں سے سامان نکالتے۔ کچھ مرمت کے لئے آئے ہوئے سامان سے الگ کرتے۔ چور یہ سامان لے کر چلے جاتے اور دوسری رات اس کی رقم آپس میں بانٹ لی جاتی۔

پل کے نگران اب بہت حد تک مطمئن تھے مگر پل پر چلنے والے مطمئن نہیں تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ پل اب گرا چاہتا تھا وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ پل ان کی تحویل میں دے دیا جائے۔ لیکن نگران سُنی اَن سُنی کر رہے تھے۔

اچانک ایک دن خبر آئی کہ پل کے آدھے لوگوں نے ایک زبردست دروازہ لگا کر آدھے پل کو بالکل الگ کر لیا ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ باقی پل کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں جن لوگوں کو پل کے دوسرے حصے کا ہمدرد سمجھتے ہیں بلا تامل مار ڈالتے ہیں انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے بیرونی امداد بھی حاصل کر لی ہے اُن کے ان ساتھیوں نے سارے پل کی ناکہ بندی کر لی ہے۔

پل کے نگران نے اعلان کیا کہ پل کے دوسرے حصے میں خلفشار پھیل گیا ہے۔ سپاہی موجود ہیں اور وہ جلد ہی انتشار پسند عناصر کا قلع قمع کر دیں گے وہ پل کی ایک ایک کیل کے لئے لڑیں گے چونکہ یہاں سے ان کی کوئی مدد نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے یہاں کے لوگوں نے ان کی ہمت بندھانے کے لئے گانا شروع کر دیا "پل ایک ہے۔ پل ایک ہے۔"

ان کی آوازیں ان تک پہنچ سکتی تھیں نہ کوئی اس شور و شغب میں سن سکتا تھا نہ کسی کو اتنا ہوش تھا ہر طرف آگ تھی۔ دھواں تھا۔ خون تھا اور نعشیں ۔۔ اس حصے کے سارے سپاہی مارے جا چکے تھے یا قید کر لئے گئے تھے مگر پل کے نگران چیخ رہے تھے۔ ہم ایک ایک کیل کی حفاظت میں جان لڑا دیں گے ۔۔۔ پل ایک ہے پل ایک ہے مگر اصل میں پل دو ہو چکے تھے۔

اور جب ان نگرانوں کو معلوم ہوا کہ اب وہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ بچے بچے کو معلوم ہو گیا ہے کہ پل ایک نہیں رہا۔ پل کے دو حصے ہو چکے ہیں۔ تو انہوں نے چلا کر کہا۔ کہاں ہیں وہ جوان جو کہتے تھے ہم اس پل کا انتظام سنبھال سکتے ہیں۔ ہمیں ہی اس پل کی دیکھ بھال کا حق ہے۔ اب وہ یہ پل سنبھالیں ۔۔۔ ہم چلتے ہیں اور وہ چلے گئے۔

اور وہ آدھا پل خراب و خستہ زنگ آلود کیلوں، سیمنٹ کے بجائے ریت کے ڈھیروں پر ٹھہرا ہوا پل کھڑا تھا۔ اس پر تازہ شفق رنگ، لہو کا رنگ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اپنا عکس ڈال رہا تھا۔۔ اور پل پر چلنے والے سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

ایسے میں جوانوں کا وہ سربراہ چلایا "ساتھیو، بھائیو کام کرنے والو۔ واقعہ سخت ہے۔ مگر ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ ادھر دیکھو میں نے پل کے لئے کتنا ہی اسباب پہلے جمع کر لیا ہے جو کم ہے سب مل کر اکٹھا کریں گے۔ چرانے والوں سے اگلوا لیں گے جن کے پاس زائد مال ہے ان سے لیں گے۔ تم آؤ میرے ساتھ کام کرو۔ اس پل کے بنانے میں مدد کرو۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے مجھے معلوم ہے نیا پل بنتا ہے تو پرانے پل کا کیا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں

دریا کا رخ کیسے موڑا جاتا ہے۔ مچھلیوں کا کیا ہوتا ہے تم آؤ تو ـــ میں آج سے پل پر
چلنے والے سب آدمیوں کو آزاد کرتا ہوں وہ پل کے بارے میں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ میں اس
پل پہ چلنے کی سب کو برابر آزادی دوں گا۔ خصوصی شاہراہیں توڑ دی جائیں گی خصوصی گاڑیاں
ہٹادی جائیں گی کوئی خصوصی انتظام نہیں ہوگا۔ تم آؤ میرا ہاتھ بٹاؤ۔

مگر لوگوں نے اس کی بات نہیں سنی۔ وہ اور اس کے دو چار ساتھی پل کے نئے ٹکڑے لئے
نٹ بولٹ لگا رہے ہیں اور دوسرے جن کو وہ مدد کے لئے پکار رہا ہے خصوصی شاہراہیں توڑنے
میں مصروف ہیں۔ خصوصی گاڑیوں کو آگ لگا رہے ہیں۔ ان ڈبوں کو جلا کر بھاگ رہے ہیں۔
جو ان کی حفاظت کر رہی تھیں۔

پل پہ چلنے والے جنہیں پہلی مرتبہ زبان کھولنے کی اجازت ملی ہے دور کھڑے چلا رہے
ہیں۔ "شاباش نئے نگراں۔ واہ واہ۔ اسی طرح کام کئے جاؤ۔ بے شک ہم تمہارے ساتھ
ہیں۔ کچھ رٹ لگا رہے ہیں۔" ایک گروہ کھڑا کہہ رہا ہے "سبحان اللہ۔ جزاک اللہ ـــ"
بہت سے بے کار کھڑے چلا رہے ہیں "دیکھو میں نہ کہتا تھا میں نہ کہتا تھا" ـــ حالانکہ اتنے
دن کسی نے کچھ نہ کہا تھا۔ سب گونگے تھے ـــ اور سب بہرے تھے۔

نئے نگراں اور اس کے ساتھی گھبرا گھبرا کر سب کی طرف دیکھ رہے ہیں کیا وہ تنہا یہ پورا
پل بنائیں گے کوئی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔ وہ اکیلے یہ پل بنائیں گے اور جو حصہ الگ ہو
گیا ہے اس کے ساتھ جوڑ بن گے اور کوئی ان کا ہاتھ نہیں بٹائے گا۔

یہ لوگ کیوں نہیں آتے۔ کیا انہیں ان پہ اس قدر اعتماد ہے کہ وہ تنہا سارا کام
کر لیں گے یا وہ کام کرنے کے عادی نہیں رہے ہیں۔ ہاں وہ کام کرنے کے عادی نہیں
رہے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں۔ ان کی زبان۔ ان کا ذہن سب مفلوج ہو چکے ہیں! انہوں
نے صرف نعرے لگائے ہیں یا پھول برسائے ہیں اور اب نعروں سے محروم ہونے کے بعد
ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ وہ کیا کریں۔

وہ ملکہ ملکہ نگران اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے انہیں یقین ہی نہیں آرہا ہو کہ کبھی نیا پل بنے گا۔ نیا پل بن بھی سکتا ہے وہ حیرت اور بے یقینی سے دیکھ رہے ہیں اس امید میں کہ تھوڑا سا بن جائے تو وہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ ہاتھ ہی نہیں بٹائیں دل و جان سے جُٹ جائیں۔

مگر انہیں کسی طرح یقین تو آئے۔

منّو چچّا

منّو چچا سے کچھ دن تو ہم سب کھلونے کی طرح کھیلے مگر پھر ایک دم بیزار ہو گئے جیسے بچے
ایک کھلونے سے کچھ دن کھیلنے کے بعد اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ جس زمانے میں ہم ان
سے کھیلا کرتے تھے کسی بڑی گھڑی میں بھیّا نے انہیں منّو چچا کہہ دیا۔ ان کے قد اور حلیے کو دیکھتے
ہوئے یہ نام ان پر کچھ ایسا جچا کہ ہم سب انہیں اسی نام سے پکارنے لگے، بغیر یہ سوچے سمجھے
کہ بعد میں یہ نام ہمیں کتنا دکھ دے گا۔ منّو چچا سب سے پہلے ہمارے ہاں اس دن آئے تھے۔
جب ابو نے شیخ صاحب سے کہہ کر انہیں پھلوں کے گودام میں چوکیدار رکھوا دیا تھا۔ وہ
مٹھائی لے کر آئے تھے۔ مارے خوشی کے ان کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں اور اس میں سے
پان کھاتے ہوئے سُرخ سرخ بے ترتیب دانت جھانک رہے تھے ان کی چھوٹی چھوٹی
آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور چہرے کی ہر جھُرّی مسرت سے متحرک رہی تھی وہ حلق سے
عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ ہمیں وہ اچھا خاصا تماشا سا نظر آئے چار فٹ کا
قد خاکی پتلون، فوجی وضع کی بُوشرٹ۔ سبز رنگ کی ٹوپی جس پر دونی کا چاند تارا جگمگا رہا تھا
اسی وقت بھیّا اندر سے آئے اور ان سے اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ یہ
حضرت گونگے بہرے ہیں، مگر وہ بھیّا سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ بھیّا بولتے
بھی جاتے تھے اور اشارے بھی کرتے جاتے تھے اور وہ برابر جواب دے رہے تھے۔ ہمیں
یہ کھیل بڑا دلچسپ لگا۔ اس کے بعد تو جناب وہ دونوں وقت آنے لگے، شام کو کام پر جاتے
ہوئے اور صبح کام سے واپسی پر۔ سویرے آتے ہی وہ انگریزی اور اردو کے اخبار دبوچ لیتے،
برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر انہیں بہت دیر تک دیکھتے، ایک ایک صفحہ بالکل اسی انداز میں

اُلٹتے جیسے پڑھ رہے ہوں، کوئی انجان دیکھ لیتا تو کبھی نہ سمجھ پاتا کہ وہ صرف تصویریں دیکھ رہے ہیں اس کے بعد وہ اخبار اٹھا کر اس پر تبصرہ کرنے کو نکلتے جو بھی جہاں کہیں مل جاتا اس سے باتیں شروع ہو جاتیں تصویر دکھا دکھا کر ہر شخص کی اچھائیاں برائیاں بیان کرتے۔ بھیا سے ان کی خوب گھٹتی۔ بھیا شیو بنا رہے ہوتے تو منو چچا پہنچ جاتے اور اب باتیں شروع ہو جاتیں۔ وہ کسی اچھی سی لڑکی کی تصویر دکھا کر بھیا کو آنکھ مارتے۔ بھیا گال سے صابن صاف کرتے ہوئے کہتے "شادی کر لو اس سے منو چچا سکھی رہو گے"، بھیا اتنی بات کہتے ہوئے صرف ماتھے پر ٹیکے کا نشان بناتے اور منو چچا سمجھ کر ہنس پڑتے سارے خوشی کے پوری بتیسی جھلملانے لگی۔ اور وہ زور زور سے سینے پر ہاتھ رکھ کر ظاہر کرتے کہ وہ عنقریب شادی کرنے والے ہیں۔

اور ایک دن وہ سچ مچ ایک گٹھڑی لائے اور بڑی رازداری سے امی کو دکھانے لگے اس میں چند سستے ریشمی جوڑے تھے، بالوں کے رنگین پن، عطر کی شیشی اور سستے پاؤڈر کا ایک ڈبہ تھا۔ اس دن ان کی آنکھیں خوشی سے چھلکی پڑ رہی تھیں اور سانولے گال معہ جھریوں کے تمتما رہے تھے یہ چیزیں دیکھ کر مارے ہنسی کے ہمارے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور منو چچا یہ سمجھ کر کھلکھلا رہے تھے کہ شاید ہم بھی ان کی خوشی میں شریک ہیں۔ انہوں نے ساری چیزیں سمیٹ کر امی کو دیں اور سمجھا دیا کہ انہیں سنبھال کر رکھ دیں جب ضرورت ہو گی وہ لے جائیں گے۔ ان کے جانے کے بعد بھیا بڑبڑائے "دماغ خراب ہو گیا ہے روپیہ پھینکتا پھر رہا ہے بڈھا۔"

"کیا خبر سچ مچ شادی کر رہا ہو۔" امی بولیں۔

"کمال کر رہی ہیں آپ، کون ان سے شادی کرے گا"

"اے ذرا بہرہ گونگا ہی تو ہے اور کون عیب ہے"، امی نے ایسے بھولپن سے کہا کہ ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

سن ۵۸ء کو جس دن مارشل لاء لگا ہے وہ معمول سے بھی سویرے آ گئے۔ اس دن ان کا

جوش اور ہیجان دیکھنے کے قابل تھا۔ ہر ایک کو اخبار کی سُرخیاں دکھا دکھا کر اس طرف متوجہ کر رہے تھے اور ہاتھ سے اشارہ کر رہے تھے کہ پُرانے سیاست دانوں کا پتا کٹ گیا ہے انہوں نے ہر شخص کے لئے ایک خاص اشارہ وضع کر رکھا تھا کسی کی مونچھ، کسی کی داڑھی اور کسی کی ٹوپی وہ اشارے سے بتاتے رہے کہ یہ سب لوگ گئے اس کے بعد وہ سیدھے اکڑ کر کھڑے ہو گئے اور ایک زوردار فوجی سیلوٹ مارا، پھر بڑی زور سے ہنسے، دراصل منو چچا کو فوج بہت پسند تھی۔ اکثر تصویریں دکھا دکھا کر بھیا کو فوج میں جانے کا شوق دلایا کرتے تھے، خود بھی شاید اسی لئے فوجی لباس پہنتے تھے یہ اور بات ہے کہ اپنے قد اور منحنی جسم کی وجہ سے وہ فوجی کم اور جوکر زیادہ نظر آتے تھے ہم سب حیران تھے یا اللہ انہیں یہ ساری معلومات کیسے حاصل ہوئیں کہ آج کی صبح دوسری صبحوں سے مختلف ہے اس تبدیلی کا تعلق سیاست سے ہے بلکہ یہاں تک کہ ملک میں فوجی انقلاب آگیا ہے میں نے حیران ہو کر یہ باتیں امی سے پوچھیں تو وہ حسبِ عادت بولیں "بھئی اللہ کے بھید اللہ ہی جانے" امی جب کسی بات کا جواب دینا نہیں چاہتیں تو یہ کہہ دیا کرتی ہیں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر وہ تھوڑی سی کوشش کریں تو خدا کے بہت سے چھوٹے چھوٹے بھید ضرور جان لیں۔

ایک دن منو چچا گھر میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس لے کر داخل ہوئے امی سے گھڑی لے کر انہوں نے ساری چیزیں بڑے سلیقے سے اس میں جما دیں اور پھر رفتہ رفتہ ان چیزوں میں اضافہ ہونے لگا، کبھی ریشمی پھولوں والا کوئی دوپٹہ آگیا، کبھی چھوٹے موتیوں والا کوئی ہار امی جب ان سے یہ سوٹ کیس لے جانے کو کہتیں تو وہ بڑی حسرت سے کہتے اور کوئی جگہ نہیں ہے جہاں وہ یہ سوٹ کیس حفاظت سے رکھ سکیں اسے یہیں رہنے دیں ایک دن وہ اُسے لے جائیں گے۔ اس ایک دن کے ذکر پر ان کے گالوں پہ شفق پھول جاتی اور آنکھیں چمکنے لگتیں۔ پھر ایک دن انہوں نے امی کو پچاس روپئے رکھنے کو دیئے، امی نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانے آخر امی نے ابو سے پوچھ کر وہ روپئے رکھ لئے۔ منو چچا کی شادی

ان دنوں ہمارے لئے بڑا لطیفہ بن گئی تھی۔ اب تو ہم بھی آن اشاروں میں باتیں کرکے پوچھتے کہ لڑکی کیسی ہے اور وہ کیا کیا زیور چڑھا رہے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے کہ لڑکی بڑی خوبصورت ہے۔ ایسے وقت وہ کیلنڈر پہ بنی ایک گلابی ہنستی ہوئی چینی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے اور اپنی چندھی آنکھوں کو مضحکہ خیز حد تک چوڑی کر لیتے یعنی لڑکی ایسی ہے مگر آنکھیں اس سے بھی بڑی ہیں۔ ہم ہنستے تو ہمارے ساتھ خوش ہو ہو کر خود بھی ہنستے۔ ایک دن وہ ایک سنہری سینڈل بھی سوٹ کیس میں رکھنے کو لائے اور پھر وہ دن بھی آیا کہ جب وہ یہ سوٹ کیس اور روپیہ لینے آئے اور بھیا کو شادی میں ضرور ضرور آنے کی تاکید کی۔ ایک عرصے سے وہ بھیا کو بتا رہے تھے کہ ان کی شادی میں بھیا کو شہ بالا بننا ہوگا اور بھیا نے حامی بھر رکھی تھی۔ ہم نے منو چچا سے مٹھائی مانگی جس کے جواب میں انہوں نے سر ہلا کر سب کو مٹھائی کھلانے کا وعدہ کیا اور خوشی خوشی چلے گئے۔

دوسرے دن بھیا تو صبح ہی سے غائب ہو گئے کہ کہیں منو چچا انہیں شادی میں لے جانے کے لئے نہ آ پہنچیں مگر وہ پہلا دن تھا کہ منو چچا شام کو بھی نہیں آئے۔ دوسرے دن ہم بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارا خیال تھا وہ سفید پائجامہ، بوسکی کی قمیص اور پاکٹ سائز شیروانی پہنے آئیں گے، گلے میں ہار ہوں گے اور ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ مگر جب وہ آئے تو بالکل اسی حلیے میں تھے جیسے ہمیشہ آیا کرتے تھے، وہی خاکی کپڑے، پٹھانی چپل، ہری ٹوپی جس پہ چاند تارے کا بیج تھا اور ہاتھ میں ڈنڈا۔

"کیا ہوا منو چچا ہو گئی شادی؟" ہم سب ایک ساتھ بول اٹھے۔

منو چچا نے غصے میں بھر کر اپنی زبان میں جلنے کیا اول فول، بکنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہم ان کی ہر بات نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے فوراً بھیا کو بلوایا گیا تاکہ وہ انٹرپریٹر کے فرائض انجام دیں مگر اس دن تو بھیا سے لعنت بھی کام نہ آسکی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ شادی نہیں ہوئی۔ مارے غصے کے منو چچا کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے امی نے انہیں

شربت کا ایک گلاس پلا کر ٹھنڈا کیا اور پھر وہ اپنا ڈنڈا بجاتے چلے گئے۔

چند دن بعد میں اور باجی بازار گئیں۔ کوئی چیز ڈھونڈتی، ڈھونڈتی ہم اندر بازار میں بڑی دور نکل گئیں۔ وہاں کیا دیکھتی ہیں کہ جناب منو چچا چوک میں کھڑے چلا چلا کر دانت کی دوا بیچ رہے ہیں۔ دانت میں درد ہو، ہلتا ہو، خون آتا ہو اس دوا کی ایک چٹکی یوں کر کے رگڑ لیجئے منٹ بھر میں درد غائب لیجئے صاحبان، صرف شیشی کی قیمت آپ سے وصول کی جاتی گی، دو دو آنے...... اور لوگ آگے بڑھ بڑھ کر شیشیاں خریدنے لگے۔

مارے حیرت کے ہماری آنکھیں پھٹ گئیں۔ مجھے ایک دم جلال آگیا۔

"چلئے باجی ان سے پوچھیں زبان کترنی کی طرح چلتی ہے تو گونگا بن کر لوگوں کو دھوکا کیوں دیتے ہیں۔"

"ارے ہٹاؤ اتنے مجمع میں کہاں جاؤ گی، گھر آئیں گے تو پوچھیں گے۔" کچھ ٹھہر کر باجی بولیں "میرا خیال ہے یہ بھی ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ کی قسم ہیں، رات گونگے بن کر چوکیداری کرتے ہیں۔ دن کو عطار بن کر دوائی بیچتے ہیں۔"

"حد ہے بھئی فراڈ کی، ابو کو بتائیں گے ایسے آدمی کا تو گھر میں آنا بھی خطرناک ہے۔"

گھر میں پہنچ کر میں نے سب سے پہلے یہ بات سب کو بتائی مگر کسی نے یقین ہی نہیں کیا۔ امی اپنے ازلی بھولپن سے بولیں "تمہیں دھوکا ہوا ہوگا وہ کوئی اور شخص ہوگا۔"

ابو بولے "بھئی وہ تو پیدائشی بہرہ گونگا ہے۔"

"افوہ بھئی، بالکل وہی تھے۔ ویسا ہی قد، وہی شکل، وہی کپڑے بس سر پر ٹوپی نہیں تھی، کیوں باجی؟"

"ہاں ہاں امی وہی تھے۔" باجی نے بڑی دھیرج سے کہا۔ اس ساری گفتگو کے دوران بھیا بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے۔

"یہ تو عجیب بات ہے" امی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر حیران ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔

"میں جانتا ہوں۔ کیا بات ہے۔" بھیا بڑی پراسراریت سے مسکرائے۔

"بات یہ ہے کہ وہ ہرگز بہرے گونگے نہیں ہیں، قطعی فراڈ ہیں" میں نے جھلا کر کہا۔

"نہیں بہرے گونگے تو وہ ہیں۔"

"ارے پھر کیا بات ہے" امی بھی بے چین ہو گئیں۔

بات یہ ہے امی اور یہ مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ منو چچا کے ایک بھائی ہیں بالکل انہیں کی شکل کے ہو سکتا ہے دونوں جڑواں ہوں مگر وہ بہرے گونگے نہیں ہیں، انہیں کو دکھا کر لوگوں نے منو چچا کی شادی بھی ٹھہرا دی تھی مگر جس وقت یہ حضرت دولہا بنے ہوئے تھے مہر پر کوئی بات چیت شروع ہوئی۔ آپ سے رہا نہیں گیا۔ جھٹ سہرا الٹ کر کچھ بول پڑے اپنی زبان میں۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور بارات خیر سے واپس آ گئی۔ تو جناب جنہیں آپ دوائی بیچتے دیکھ کر آئی ہیں وہ ان کے بھائی ہیں۔" اس بات کا یقین کرنا ہی پڑا کیونکہ ذرا ہی دیر میں منو چچا ڈنڈا کھٹکھٹاتے سبز ٹوپی پر چاند تارے کا بیج چمکاتے تشریف لے آئے۔ شادی کی بات نکلی تو بھیا نے ان سے کہا "منو چچا بہت سا روپیہ جمع کر لو تو باہر جا کر کوئی ولائتی دولہن لے آؤ، یہاں کی لڑکیاں تو کسی کام کی نہیں ہوتیں" منو چچا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ رال کپڑوں پر ٹپک پڑی۔ پھر انہوں نے ہوائی جہاز کی اڑان کا نقشہ دکھایا، ماتھے پر ٹیکہ بنایا اور سینے پر ہاتھ مارا گویا ولائتی دولہن لانے پر راضی ہو گئے۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ ہماری دلچسپی منو چچا میں کم ہو گئی اور پھر تو ان کی موجودگی ہی سے وحشت ہونے لگی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ جب دیکھو تب موجود۔ گھر میں ہماری سہیلیاں آئی ہوں اور کوئی انہیں منو چچا کہہ دیتا تو وہ آنکھیں پھاڑ کر پوچھتیں "ہیں یہ تمہارے چچا ہیں؟" لو اب ہر ایک کو سمجھاتے پھرو۔ بھیا کو بھی شکایت تھی کہ جب ان کے دوست آتے ہیں تو منو چچا بڑے آرام سے کرسی پر آ بیٹھتے ہیں اور اس امید میں رہتے ہیں کہ سب سے ان کا تعارف ہو اور ہر ایک ان سے باتیں کرے۔ لاکھ ان سے بے رخی بھی برتی مگر ان کا

دومرتبہ کا آنا ہو گیا۔ تنگ آکر امی سے شکایت کی تو وہ بولیں "بے چارے کا اس دنیا میں کوئی ہے نہیں، بھائی منہ نہیں لگاتا۔ تم لوگ دو باتیں کر لیتے ہو تو چلا آتا ہے کون کچھ لینے آتا ہے۔ محبت کا بھوکا ہے دو گھڑی آن بیٹھتا ہے۔" پھر ٹھنڈا سانس بھر کر امی نے شعر پڑھا۔ ع

ان فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

امی یہ سمجھتی نہیں تھیں کہ وہ کچھ لینے آتے اور لے کر چلے جاتے تو ہمیں اعتراض نہ ہوتا یہ دو گھڑی ان کا آ بیٹھنا ہی تو ہمیں زہر لگتا تھا، رہ گئی دو باتوں والی بات تو محض دلچسپی کے لئے تھی اور اب اس تماشے سے ہمارا دل اکتا چکا تھا۔ اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جب کبھی اخبار پڑھنے کو دل چاہا تو دیکھا وہ منو چچا کے ہاتھ میں ہے، جس کرسی پر بیٹھنے کو طبیعت چاہی اس پر منو چچا براجمان ہیں اور جس وقت یہ خیال ذہن میں آیا کہ منو چچا کہیں آنہ جائیں وہ ڈنڈا کھٹکھٹاتے موجود۔ آخر ہم سب نے مسکاٹ بنا کر بھیا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ منو چچا کو یہاں آنے سے منع کر دیں۔ بھیا تو اشارے کے منتظر تھے ایک دن اکیلے میں جانے انہیں کیا سمجھایا بجھایا، ڈرایا دھمکایا کہ انہوں نے گھر میں آنا بند کر دیا مگر وہ دونوں وقت آتے، باہر سے ہی گھر کا ایک چکر لگاتے اور چپ چاپ چلے جاتے۔ ہم کبھی دیکھ بھی لیتے تو یوں بن جاتے جیسے دیکھا ہی نہیں۔ امی کبھی کبھی کہا کرتیں "جانے کیا بات ہے منو نے آنا بند کر دیا کہیں بیمار و بیمار نہ ہو۔"

"نہیں امی بالکل ہٹے کٹے ہیں میں نے بازار میں دیکھا تھا" بھیا جلدی سے کہتے۔

اور پھر واقعی منو چچا نے آنا بند کر دیا یعنی ہمارے گھر کے پھیرے لگانے بھی چھوڑ دیئے۔ اب کبھی کبھی ہمیں بھی وہ یاد آتے۔ اخبار میں کسی اچھی سی لڑکی کی تصویر دیکھ کر بھیا کو بھی منو چچا کا دھیان آتا۔ سب طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے۔ بھیا کہتے "بات یہ

ہے کہ ان کے پاس بہت سارو پیہ جمع ہو گیا ہے اور وہ ولائتی دلہن لینے چلے گئے ہیں۔ اس بات پر سب خوب ہنستے، واقعی جو کسی دن منو چچا، ایک گوری چٹی لمبی چوڑی، اسکرٹ پہنے دلہن کو لے کر گھر میں گھس آئیں تو کتنا مزا آئے۔ آخر ایک دن ان کی غیر حاضری کا راز کھلا۔ منو چچا کے بھائی نے کوئی جرم کیا تھا۔ پولیس ان کی تلاش میں تھی۔ منو چچا کہیں ادھر جا نکلے، انہیں دھر لیا گیا۔ اب ان پر خوب مار پڑ رہی تھی کہ جھوٹ موٹ کا بہرہ گونگا بن گیا ہے۔ آخر کئی لوگ جن میں بھیّا بھی شامل تھے۔ تھانے گئے اور منو چچا کو چھڑا کر لائے۔ اس کے بعد وہ پھر روز باہر کا چکر لگا کر جاتے رہے اور ہم نے اُن کے ساتھ وہی رویہ رکھا۔

ایک رات جب بھیّا سینما کا سیکنڈ شو دیکھنے کے بعد اندر آنے کے لئے صحن کی دیوار پھلانگ رہے تھے کہ کسی نے ان کی ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا۔ بھیّا نے گھسیٹنے والے کو گریبان پکڑ لیا وہ منو چچا تھے انہوں نے معذرت کی کہ وہ بھیّا کو چور سمجھے تھے۔ بھیّا نے بجائے شرمندہ ہونے کے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ گودام کی چوکیداری کرنے کے بجائے اس گھر کی جاسوسی کرتے ہیں وہ مالک سے کہہ کر ان کو نوکری سے نکلوا دیں گے میری آنکھ کھل گئی تھی میں خاموشی سے یہ باتیں سُن رہی تھی اس سے پہلے کہ ابو یا امی کو پتہ چلے بھیّا نے منو چچا کو ڈانٹ ڈپٹ کر رخصت کر دیا اور خود مزے سے دیوار پھلانگ کر چپ چاپ لیٹ گئے۔

اب بھیّا کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ قیمتی کپڑا بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر، ہم نے بھیّا کی دلہن کی بریان بنائی تھیں۔ زیور بھی بن کر آ گیا تھا۔ بھیّا بڑے خوش تھے۔ ہم ان کو چھیڑا کرتے تھے کہ وہ منو چچا کو اپنا شہ بالا بنائیں کیونکہ منو چچا اپنی شادی میں انہیں شہ بالا بنانا چاہتے تھے۔ بھیّا چڑ کر کہا کرتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنی شادی میں منو چچا کو دیکھ لیا تو نکاح بھی نہیں پڑھوائیں

گے۔ فوراً اُٹھ کر چلے آئیں گے۔ شادی کی بات ساری جگہ پھیل گئی تھی۔ محلے والیاں آ آکر بھابی کے کپڑے اور زیور دیکھتیں اور خوش ہوتیں۔ شاید اس بات کا چرچا کچھ زیادہ ہی ہو گیا اور ایک رات ہمارے ہاں چور آن دھمکے۔ تین چور تھے دو اندر آ گئے ایک چاقو لئے باہر کھڑا رہا۔ سب سے پہلے انہوں نے بری والے سوٹ کیس پر ہاتھ صاف کیا پھر ادھر اُدھر بکھری ہوئی ساری گھڑیاں، چشمے لائٹر اور نقدی لے کر باہر نکل رہے تھے کہ کسی کی آنکھ کھل گئی۔ ہاہا کار مچی، سارا گھر اور سارا محلہ جاگ اُٹھا لوگ باگ لپک کر باہر نکلے تو دیکھا کہ چھٹنکی بھر کے منو چچا ایک دیوہیکل چور سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ دھینگم مشتی میں سوٹ کیس ایک طرف لڑھک گیا تھا آدمیوں کو آتے دیکھ کر دوسرے چور نے چاقو سے منو چچا پر حملہ کر دیا۔ منو چچا سینہ تھام کر گر پڑے اور چور بھاگ نکلے۔ بہت سے آدمیوں نے گھیر گھار کر آخر چوروں کو پکڑ لیا۔ ان کو پولیس کے حوالے کیا گیا اور منو چچا کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ ہم سب بھی لشتم پشتم وہاں پہنچے اور ان کے بیڈ کے گرد دبے چلنے سے کھڑے ہو گئے۔ ہماری آنکھوں میں آنسو تھے اور لب پر ان کے ٹھیک ہو جانے کی دعائیں تھیں۔ منو چچا نے کمزوری سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو بمشکل کھول کر ہمیں دیکھا۔ انہیں شاید زندگی بھر اتنی قدر نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس وقت اتنے بہت سے آدمیوں کو اپنے لئے بے چین دیکھ کر وہ خوشی سے کِھل اُٹھے ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک آ گئی اور وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان دلانے لگے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بھیا ان کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے محبت سے دبایا، پھر یکایک ان کا رنگ زرد پڑ گیا، ماتھے پر پسینہ آیا، آنکھیں مُندیں اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ہم سب رونے لگے، وہ ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ مگر ان کے خلوص اور قربانی نے ہمیں خرید لیا تھا۔ شاید زندگی بھر وہ ایک پیار بھری نگاہ اور دو میٹھے بولوں کے پیچھے باہیں پھیلائے لپکتے رہے تھے اور ہمیشہ ان سے محروم

رہے تھے۔ یہ متاع بے بہا آج جان دے کر انہوں نے حاصل کر لی تھی اور اب اسے سینے سے لگائے وہ اتنی دُور چلے گئے تھے اس ڈر سے کہ کوئی ان سے یہ آخری خزانہ چھین نہ لے اس وقت ان کے چہرے پر بلا کا سکون تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جیسے کہہ رہے ہوں آخر تم لوگ ہار گئے اور میں جیت گیا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تم سے وہ چیز لے ہی لی جو تم دینا نہیں چاہتے تھے۔

انتخاب اور فیصلے

صبح کا وقت تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا فون پر میرا شوہر شہزاد بول رہا تھا اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"کون ؟ مراد !"

"اچھا تو ہماری آوازیں اتنی ملتی ہیں !" اُس نے بھرپور طنز سے کہا۔ میں ہنس پڑی — اور بات مذاق میں ٹالنا چاہی مگر وہ پہلے سے ہی سنجیدہ تھا اُس نے کہا :

"سنو جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ یہ ہم میں سے کسی ایک کی موت کا سوال ہے۔ مراد نے اقرار کر لیا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے — ہم دونوں اس وقت فلائنگ کٹ پہنے ہوئے ہیں اور دونوں آگے پیچھے اڑنے والے ہیں لیکن ہم میں سے صرف ایک شخص زندہ سلامت زمین پر واپس آئے گا اس کا فیصلہ تم کرو گی ۔ . . . بولو تم ہم میں سے کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہو . . . . ایک نام لو ، میں اور کچھ نہیں سنوں گا ، صرف ایک نام۔"

میں فون پر اسے سمجھانے لگی ، رو رو کر التجا کرنے لگی کہ وہ دونوں ایسی غلطی ہرگز نہ کریں۔ مگر اس پر تو جیسے جنون طاری تھا۔ اُس نے کہا "اگر تم نے ایک نام نہ لیا تو میں سمجھوں گا کہ تم چاہتی ہو میں کبھی نہ لوٹوں۔"

میں نے کہا "تم مراد کو فون دو میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اُس نے کہا "خدا حافظ ، مبارک ہو" اور فون رکھ دیا۔

شک کا دیو کتنا اندھا ہوتا ہے ڈاکٹر۔ وہ دونوں پائلٹ تھے۔ ان لوگوں کو سوچنے سمجھنے

اور فیصلہ کرنے کے لئے پل بھر ہی درکار ہوتا ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ ایسے فیصلے یوں پل بھر میں فون پہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میرا دماغ بالکل ماؤف تھا۔ پھر بھی میں نے کار نکالی اور بھاگی۔ ذرا دیر بعد اس خیال سے لوٹ آئی کہ مجھے دیر نہ ہو جائے۔ فون پر کئی الٹے سیدھے نمبر ڈائل کئے اور آخر کنٹرول ٹاور کا نمبر کسی نہ کسی طرح مل ہی گیا۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود شخص سے کہا۔

"اس وقت فلائنگ کے لئے جو جہاز بھی تیار ہوا ہے ہرگز ہرگز اڑنے کی اجازت نہ دینا۔"

"آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں ــــ؟" اس نے اطمینان سے پوچھا ــــ

"میں پائلٹ شہزاد کی بیوی ہوں، دیکھو اس وقت پائلٹ شہزاد یا مراد میں سے کوئی ہرگز ہرگز نہ اُڑے۔"

اس نے کہا ــ "ایک جہاز ابھی ابھی اڑا ہے جسے پائلٹ شہزاد چلا رہے ہیں اور آخر وقت میں نہ معلوم کیوں کیپٹن مراد بھی اسی میں سوار ہو گئے ہیں حالانکہ ان کا جہاز......"

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوتی تھی کہ فون میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سُنائی دی۔ اس نے کہا ــ "سوری میڈم، کوئی جہاز کریش ہوا ہے۔" وہ فون چھوڑ کر بھاگ گیا اور میں وہیں گر کر بے ہوش ہو گئی ــــ

اس حادثے میں ایک شخص مر گیا اور ایک خدا کی قدرت سے بچ گیا۔ جو بچا وہ اس عورت کا خاوند شہزاد نہیں بلکہ اس کا دوست مراد تھا جو شہزاد سے یہ اقرار کر چکا تھا کہ وہ اس کی بیوی کو چاہتا ہے۔ اس خاتون کو مراد سے محبت نہیں تھی مگر اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اس نے مراد کی رفاقت قبول کر لی اس لئے کہ وہ اپنی محبت کا اقرار اس کے شوہر سے کر چکا تھا۔ دوسرے اس لئے کہ جب شہزاد نے اسے مبارک باد دی اور اپنی بیٹی گڑیا کو خوش رکھنے کے لئے کہا تو مراد کا ماتھا ٹھنکا کہ وہ ضرور کوئی ایسی ویسی حرکت کا ارادہ رکھتا ہے اور

وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر شہزاد ہی کے جہاز میں سوار ہو گیا اور اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی، مگر شہزاد پر جنون طاری تھا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ جہاز ضرور کریش کرے گا تاکہ دونوں ایک ساتھ فنا ہو جائیں۔ مراد سے شادی کرنے کی تیسری وجہ خاتون نے یہ بتائی کہ وہ ہمیشہ سے ان کی بیٹی گڑیا سے بہت محبت کرتا تھا اور اتنا اچھا سوتیلا باپ اُسے کوئی اور مل ہی نہیں سکتا تھا۔

گو ان خاتون کی مراد سے شادی کی وجوہ نہایت معقول تھیں مگر دنیا کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ لوگ یہی کہتے تھے کہ شہزاد نے جان اس لئے دی کہ اس کی بیوی اس کے دوست سے محبت کرتی تھی اور ظاہر ہے کہ ان کی شادی کے بعد اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی اور یہی بات تھی جس نے ان خاتون کو ذہنی الجھن میں گرفتار کر دیا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں نفرت اور ملامت ان کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ان خاتون سے کہا۔

"آپ پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہیں، ان وہموں میں نہ پڑیں۔ آپ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ آپ کا پہلا شوہر مر چکا ہے اور اب جو شوہر ہے وہ اس بات سے یقیناً خوش ہوگا کہ آپ نے ایک نام نہ لے کر اس کی زندگی بچالی۔"

"آپ کو اس بات سے بھی تسلی ہونی چاہیئے کہ انتخاب آپ کا نہیں قدرت کا تھا۔ ورنہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ مراد کے بجائے آپ کے شوہر بچ جاتے۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی:

"میں نے جو آپ سے کہا تھا کہ لوگوں کی ملامت بھری نظریں میری برداشت سے باہر ہیں اس میں کچھ سچائی ضرور ہے مگر ساری سچائی نہیں ہے۔ اصل میں مجھے جو چیز پریشان کر رہی ہے وہ ایک مجرمانہ احساس ہے۔"

"وہ کیسا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کہ بظاہر تو میں دونوں کی جانیں بچانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اصل میں شہزاد کا

نام لینے سے اس لئے بچ رہی تھی کہ مراد میری محبت کا اقرار کر چکا تھا اور جو آپ سے محبت کرتا ہے وہ آپ کو یقیناً عزیز ہو جاتا ہے۔"

"تو اس میں بری بات کون سی ہے۔ کسی ایسے آدمی کی جان بچانے کی کوشش کرنا جو آپ کو محبوب رکھتا ہو کوئی جرم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کی بات سے مجھے بڑی تسلی ہوئی ہے ڈاکٹر" اس نے کہا۔ پھر اس نے نگاہیں جھکالیں اور دھیرے سے کہا۔

"کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ کہیں مجھے سچ مچ مراد ہی سے تو محبت نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے شہزاد کا نام میری زبان پر نہ آیا۔ انسان کتنا پیچیدہ ہے اور خود کو سمجھنا بھی کتنا مشکل ہے ۔۔۔ ہے نا ڈاکٹر۔"

یکایک مجھے خیال آیا کہ شہزاد کی ضد پر کہ وہ کوئی ایک نام لے، اس نے یہ جملہ کہا تھا "تم مراد کو فون دو میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں" اس طرح غیر شعوری طور پر اس نے مراد کا نام لے دیا تھا اور شاید اس کا شوہر اس اشارے کو بھانپ گیا تھا! میں نے اس خاتون سے صرف اتنا کہا "اگر ایسا ہو بھی تو اب آپ کو ضمیر کی اس خلش سے نجات پالینی چاہیئے۔ اب مراد ہی آپ کا شوہر ہے اور آپ کی محبت کا حق دار بھی۔"

اس کے بعد وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی تھی اور اب ایک جگ بعد عالم برزخ میں ہم پھر ملے تھے یہاں زمان اور مکان کے جھمیلے نہیں تھے نہ ہم زمین پر کھڑے ہوتے تھے۔ نہ وقت گزرنے کا احساس ہوتا تھا مگر ہمیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ اس جگہ ہمارا قیام عارضی ہے اور ہم جب چاہیں اپنے مستقل قیام پر جا سکتے ہیں۔ اس عالم میں ہوا میں تیرتے ہوئے اچانک ہم ایک دوسرے سے مل گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔

"تعجب ہے آپ نے مجھے یاد رکھا۔" میں نے کہا۔

"زمین پر ایسے لوگ جو لمحہ بھر کے لئے بھی کسی کی بات سمجھ لیں کتنے کم ملتے ہیں۔"

اُس نے کہا۔

"اور یہاں؟"

"یہاں تو اور بھی نہیں ملتے کیونکہ یہاں کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہے، کسی کی کوئی خواہش ہی نہیں ہے۔"

"تو کیا یہ جنت نہیں ہے۔ دنیا میں، ہم سمجھتے تھے کہ جنت ہی ایسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں کوئی خواہش نہ رہے۔"

"ہاں۔ لیکن جنت یہاں سے بہتر کوئی جگہ ہے جہاں سے جا کر کوئی واپس نہیں آیا۔ جس طرح یہاں سے کبھی دوبارہ دنیا میں جانے کو جی نہیں چاہتا اسی طرح جنت میں چلے جانے والے کبھی لوٹ کر یہاں نہیں آتے۔ یہاں آن کر جنت میں جانے کی خواہش باقی رہتی ہے۔"

"کیا دوزخ میں جانے والے کبھی لوٹ کر آتے ہیں ــــ؟"

"وہ بھی نہیں آتے، مگر ممکن ہے انہیں آنے کی اجازت ہی نہ ہو۔"

"آپ ابھی تک یہاں کیوں ٹھہری ہوئی ہیں، آپ کو جنت میں جانے کی خواہش نہیں ہے؟"

"خواہش تو ہے مگر میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔ دنیا میں جو فیصلہ قدرت نے کر دیا تھا۔ یہاں وہ بھی مجھے ہی کرنا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دائمی ہجر اور دائمی وصل کے فیصلے کتنے دشوار ہو سکتے ہیں۔"

"یہ بھی غنیمت ہے کہ اپنے فیصلوں سے پہلے ہم جتنے دن چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ بھی بہت غنیمت ہے۔" اس نے کہا ــ "مگر یہ تو بتلایئے کہ آپ کیوں یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"میں بھی اس لئے یہاں ہوں کہ مجھے دبدھے میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ پیدائش سے لے کر

موت تک میری زندگی غیر یقینی رہی ہے"

میری پیدائش کے وقت بھی حیات و موت کی کشمکش تھی جس میں حیات نے فتح پائی اور میری موت کے وقت بھی زندگی اور موت اس طرح نبرد آزما تھی کہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میری فطرت ہی ایسی ہے مجھے کسی فیصلے پر پہنچنا اچھا نہیں لگتا اور جیسا کہ آپ نے کہا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کوئی فیصلہ۔"

خاتون ہنس پڑی "صرف دو مرتبہ ہمیشہ ہمیشہ کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ سوچئے تو ہمیشہ ہمیشہ ہمیشہ ہمیشہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں، کم از کم فیصلے کا حق تو ہمارے پاس ہے، یہ بھی کتنی بڑی بات ہے اس حق کو ہاتھ سے دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

وادی کی ہوا

یہ بھی کوئی جگہ ہے —— آخر لوگ یہاں کیوں رہتے ہیں، میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ ٹھیک ہے یہاں پیدا ہونا لوگوں کی مجبوری ہے مگر یہاں رہے چلے جانا کون سی مجبوری ہے میں بھی یہاں پیدا ہوا تھا اس پر میرا بس نہیں تھا مگر اب یہ معلوم ہونے کے بعد کہ یہ کس قدر فضول جگہ ہے میں یہاں رہنا قطعی ضروری نہیں سمجھتا۔

اور تو سب باتیں کسی نہ کسی طرح برداشت ہو جاتی ہیں مگر یہ ہوا —— ہوا تیز اور تند جو ہر وقت چلتی رہتی ہے، ہر گھڑی اور سال کے بارہ مہینے اور کبھی کبھی تو اتنی شدت اختیار کر لیتی ہے کہ توبہ —— دریا نے پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنایا ہے، زمین پر پانی کا دریا بہتا ہے اور اوپر ہوا کا۔ سردیوں میں برف کی سلوں سے گزر کر آتی ہے کہ جگر کے پار ہوتی جاتی ہے گرمیوں میں تپتی چٹانوں کی گھمس چوس کر آتی ہے کہ رواں رواں جلاتی ہے۔ ہر لمحہ سائیں سائیں دھائیں دھائیں۔ کوئی کہاں تک برداشت کرے۔ پریشان ہو کر ساری کھڑکیاں دروازے بند کر لیتا ہوں۔ آوازیں کچھ دب جاتی ہیں مگر سائیں سائیں ہوتی ہی رہتی ہے جیسے بہت سے دیو باہر کھڑے ہانپ رہے ہوں۔ اگر انسان کے سانس لینے میں بھی یوں آوازیں آیا کرتیں تو ہر شخص پاگل ہو جاتا۔ دروازے کھڑکیاں بند کر دیں۔ مگر شیشے میں سے نظر آرہا ہے درخت جھوم رہے ہیں، جھوم رہے ہیں، اونچی پھننگیں کس بے طرح ناچ رہی ہیں جیسے کوئی پاگل گھوم رہا ہو، گھومے جا رہا ہو بے مقصد، بلا مدعا۔ بعض دفعہ دل چاہتا ہے چلّا کر ان سے کہوں۔ بس اب رک جاؤ، رک جاؤ خدا کے لئے۔

چاندنی راتوں میں کبھی کبھی یہ ہوا ذرا دھیمی پڑ جاتی ہے۔ شاید چاندنی کے احترام میں مگر

رکتی نہیں۔ رکنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔ جتنا وقت گزرتا ہے میں اس کا عادی ہونے کے بجائے اس سے متنفر ہوتا جا رہا ہوں۔ اوروں سے پوچھتا ہوں کہ وہ اس منحوس ہوا کو کس طرح برداشت کرتے ہیں تو وہ ہنس کر ٹال جاتے ہیں جیسے یہ سوال جواب کے قابل ہی نہ ہو۔ ہاں وہ آپس میں اس ہوا کی زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ انہوں نے اسے ایک ناگزیر حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ مگر میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔ ہاں کیوں نہ چھوڑ دی جائے مجھے معلوم ہے کہ میں اس بستی کے لوگوں کو یہ بات بتاؤں تو مجھے احمق سمجھیں گے ایک ہوا کی وجہ سے ــــ لیکن مجھے یہ سیدھی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ میں بلا وجہ کے کرب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ اس بستی میں نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جنہیں یہ ہوا اتنی ہی ناگوار ہو گی مگر وہ اس وادی کو چھوڑنا تو درکنار اس کمبخت ہوا کا کبھی ذکر بھی نہیں کرتے اس لئے کہ اب ہے تو ہے کیا کیا جا سکتا ہے۔ جس بات کا کچھ نہ کیا جا سکتا ہو بار بار اس کا رونا رونے سے فائدہ۔ مگر یہ حماقت ہے۔ کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ جذبات سے ہٹ کر سوچو تو اس بستی کو چھوڑنا ایسا کون سا مشکل ہے۔

میں اسے آج ہی چھوڑ دوں گا مع سارے سامان کے۔ یہ فرنیچر اپنے پڑوسی کو دے دوں گا۔ جس نے مجھے کئی دفعہ کھانے پر بلایا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب بھی بلایا کسی نہ کسی مطلب سے ــــ مگر دنیا میں یوں تو ہوتا ہی ہے اور کتابیں؟ کتابوں کا یہاں کون شائق ہے جو بھی لے گا ردی کا ڈھیر سمجھ کر، مجھ پر احسان کر کے اور دوسرا سامان؟؟؟ کیوں نہ ساری چیزیں یتیم خانے کو دے جاؤں یا نوکروں کو، وہ خود تیا پانچا کر لیں گے یا کیوں نہ یونہی چھوڑ جاؤں ــــ بڑا مزا رہے گا جب معلوم ہو گا کہ میں ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہوں تو سب اپنا اپنا حق جتانے آ جائیں گے۔ نوکروں نے اتنے عرصے خدمت کی ہے۔ پڑوسیوں کا بڑا حق ہوتا ہے۔ مسجد کے ملا جی کا تو یونہی سب کی زندگیوں پر قرض ہوتا ہے۔

اسکول میں یتیم نادار بچے پڑھتے ہیں۔ بستی میں کچھ غریب اپاہج بھی رہتے ہیں۔ خوب جو تم بیزار ہو گی۔ ہونے دو۔ میری بلا سے میں تو چلا جاؤں گا یونہی کون دینے دلانے کی علت کرتا پھرے۔ دو ایک دن تو یونہی خراب ہو جائیں گے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہر شخص پوچھے گا کیوں؟ کہاں؟ اس کیوں اور کہاں سے مجھے چڑ ہے آخر انسان کا اپنا دل بھی تو کوئی چیز ہے۔ ہوا! ہوا کا ذکر کروں گا تو لوگ ہنسیں گے کوئی یقین نہیں کرے گا۔ چہ میگوئیاں ہوں گی۔ ہوا کا بہانہ ہے کوئی اور بات ہے، کوئی اور بات!!

ٹھیک ہے انہیں چہ میگوئیاں ہی کرنے دو۔ وجہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے خواہ مخواہ ہنسنے کا موقع کیوں دو۔ اچھا ہے۔ اس بھی بستی میں کوئی تو چنگاری سلگے وہ چلا گیا۔ کیوں چلا گیا۔ شاید یہ بات ہو، شاید وہ بات ہو کتنے ہی لوگ اپنے ذہن سے گھڑ گھڑ کے آنکھوں دیکھے واقعات بیان کریں گے۔ کچھ دن یہی ہما ہمی رہے گی پولیس اس کے پیچھے تھی اس سے ڈر کر بھاگ گیا۔ کسی نے اغوا کر لیا۔ شاید کسی حادثے کا شکار ہو گیا۔ یہ باتیں کتنی وزنی ہیں اس ایک ہوا کے مقابلے میں۔ مگر یہ ہوا —— کمبخت اب بھی چل رہی ہے چلے جا رہی ہے جیسے چوبیس گھنٹے چلنے والی چکی۔

آج کے بعد کم از کم میرے لئے فضا پر سکون ہو جائے گی۔ دوسرے مرتے رہنا چاہیں مرتے رہیں مجھے کیا۔ کیسی خاموشی ہو گی، کانوں کو کیسا سکون ملے گا اس سائیں سائیں نے تو کانوں کے پردوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ذہن کی ہر رگ کانپتی رہتی ہے۔ دل میں ہر وقت کوئی چیز بھاگتی دوڑتی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی کام دلجمعی سے نہیں ہوتا ہر وقت ذہن بھٹکتا رہتا ہے۔ بس یہی دل چاہتا ہے کہ یہ ہوا بند ہو تو انسان کوئی کام کرے۔ یہ ہوا بند ہو تو ذرا سکون سے بیٹھ کر کچھ لکھ پڑھ ڈالے۔ یہ ہوا —— مگر یہ کہاں بند ہوتی ہے یہ تو سمندر کی طرح ہے۔ ایک لہر اٹھتی ہے اس کے ساحل پر پہنچنے سے پہلے اس میں دوسری لہریں آن ملتی ہیں اور وہی شائیں شائیں، سائیں سائیں اور پھر دھڑ —— انجیر کا یہ موٹا پتہ ٹوٹ کر گرا۔ سر سر سر انگور کے ہلکے چرمرے پتے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ایسے میں کوئی پرندہ ہوا کی لہروں

پر بہتا ہوا آتا ہے۔ لچکتی شاخوں پر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر پیر اکھڑ جاتے ہیں اور وہ پر سمیٹ کر اڑ جاتا ہے۔ جہاں پرندے نہیں ٹھہر سکتے وہاں مجھ جیسے کمزور آدمی کی کیا بساط ہے۔

میں آج ہی بلکہ ابھی مگر ایسی جلدی کیا ہے۔ جانا ہی ہے تو اطمینان سے سہی۔ ابھی شام کو اوورکوٹ پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے کر ٹہلنے نکلوں گا اور چلتا ہی چلا جاؤں گا۔ بس پیچھے مڑ کر نہ دیکھوں گا مجھے خوب معلوم ہے کہاں اس منحوس ہوا کا اثر ختم ہوتا ہے۔ یہ ایک خاص سمت میں چلتی ہے۔ جس سمت سے یہ چلتی ہے۔ سارے درخت جھونک کھا کر اس سے دوسری طرف کو جھک گئے ہیں۔ سارے ریت کے ٹیلے اسی طرف کو اڑتے ہیں اور دوسرے ٹیلے بن جاتے ہیں۔ ساری چٹانیں اسی طرف کو کٹتی چلی گئی ہیں اور غار سے بنا ڈالے ہیں۔ میں اس سے نکل گیا تو پھر سکون ہی سکون ہوگا۔ چین ہی چین۔ کیسی مزے دار زندگی ہو گی۔ اس ہوا کے بغیر — چاہے کیسی بھی ہو، کچھ بھی ہو، کم از کم اس ہوا سے تو چھٹکارا ملے گا۔

چلتے وقت کم از کم اپنے نوکروں کو تو خدا حافظ کہہ لوں مگر نکل چلو۔ سب کو معلوم ہے تم اس وقت چہل قدمی کے لئے جاتے ہو۔ شاہ گل، مالی کی چھوٹی سی سرخ و سپید بچی بوسیدہ قمیص پھٹی شلوار میں ننگے پاؤں روز کی طرح ہوا سے گرنے والے انجیر چن رہی ہے۔ ایک انجیر مل جاتا ہے تو کیسے لپکتی ہے جیسے دنیا کی دولت مل گئی۔ پگلی لڑکی۔ جب میں پاس سے گزرتا ہوں مجھے سلام کرتی ہے۔

" وعلیکم السلام — وہ...... پڑا ہے ایک انجیر، وہ پتے کے نیچے جڑ کے پاس ہاں "

اور یہ بوڑھا لنگڑا چوکیدار سچ مچ پاگل ہے۔ رات بھر چوکیداری کرنے کے بعد دن بھر دریا میں ڈور ڈالے بیٹھا رہتا ہے نہ کوئی آگے نہ پیچھے اس پر لنگڑا الگ، بھلا تجھے اتنی محنت کرنے کی کیا حاجت ہے۔

" کیا کروں بابو جی نیند نہیں آتی، بڈھا ہو گیا ہوں، خالی بیٹھے بیٹھے مچھلیاں ہی پکڑ

لیتا ہوں دو چار۔"

اس بستی میں سب ہی خبطی ہیں۔ یہ چلتی آرہی ہیں بوڑھی بیوہ مسز جوزف۔ کمر جھکی ہوئی۔ گھر دن الگ ہلتی ہے، پاؤں ڈالتی کہیں ہیں پڑتا کہیں ہے مگر دس میل دور جذام کے مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے جاتی ہیں۔ یہ کیا کسی کی دیکھ بھال کرتی ہوں گی۔ نہ ہاتھ قابو میں نہ پاؤں ان کے دن ہیں کہ کوئی آکر ان کی دیکھ بھال کیا کرے۔

"دیل — ہم کام نہیں کرتا پھر بھی مریض لوگ ہم کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے، ہم ان کے لئے پھول لے جاتا ہے اور کیا ہے ہمارے پاس لے جانے کو۔ ہمارا دل بھی بہلتا ہے۔ ان کے ساتھ بات کر کے ادھر پڑا پڑا کیا کرے۔"

ایک یہ پاگل بڑھیا ہے۔ اس وقت سردی میں بھٹھرتی چادر میں سکڑتی کدھر سے آرہی ہے۔ "پیر بابا کی درگاہ سے، جھاڑو لگا کر" میاں اسے مارے تو جاکر درگاہ پہ جھاڑو لگاتی ہے۔ بڑا بیٹا جمع پونجی لے کر بھاگ جائے، چھوٹے بیٹے کو مرگی کے دورے پڑیں، لڑکی تپ دق میں پڑی مر رہی ہو ہر مرض کا علاج جھاڑو۔ سردی ہو گرمی ہو برسات ہو، دن ہو رات ہو اس کے سارے دکھوں کا ایک ہی علاج ہے۔

"بڑے پیر کی درگاہ ہے۔ سب کی سنتے ہیں میری تو ہر مشکل ان ہی کے در سے آسان ہوتی ہے۔"

"ہونہہ"

آج کیسی انوکھی شفق پھولی ہے کیلے کے پتوں اور چھدری جھاڑیوں کے اوٹ سے پہاڑوں کے اوپر سرخی کی کیسی زبردست لہر نظر آرہی ہے۔ پہاڑی کے دامن کے مکانوں میں بجلی کے قمقمے ابھی سے جل گئے ہیں۔ شاید وہاں اندھیرا ہو گیا ہے۔ اندھیرا تو یہاں بھی ہوہی چلا ہے دریا کے سپید پانی پر سراہٹ پھیلنی شروع ہو گئی ہے۔ پہاڑی پر دور دور بنے ہوئے مکانوں سے دھواں اٹھ رہا ہے اور کہیں کہیں تنور سے نکلتی ہوئی آگ کے شعلے۔

اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ چاند بھی نکل آیا۔ کبھی کبھی چاند سرِ شام کیوں نکل آتا ہے۔ اس چاند کا قصّہ مجھے ساری عمر پتہ نہ چلا۔ کبھی کسی وقت نکلتا ہے کبھی کسی وقت!! کبھی ناخون کی طرح باریک ہے۔ کبھی نارنگی کی قاش، وہی شکل وہی رنگ۔ کبھی کانسی کی گول تھالی۔ کبھی تانبے کا تازہ قلعی شدہ طباق۔ کبھی بادل کی سفید سفید لہریں سر سر سر اس کے اوپر سے دوڑی چلی جارہی ہیں۔ کبھی کالے کالے بادلوں میں خود بھاگتا چھپتا گرتا پڑتا چلا جارہا ہے مگر جہاں سے چلے گا وہیں موجود۔ ہر شخص سے دور ہر شخص کے پاس۔ جس چیز کو دیکھو چاندنی میں شکل بدل لے گی۔ یہ بڑے بڑے ننگی شاخوں والے درخت کیسے لگ رہے ہیں جیسے کسی نے بہت سی دیوزاد جھاڑو تیں زمین میں گاڑ دی ہوں۔ اس چاندنی میں جھاڑو کے یہ تنکے بھی تو لو دے اٹھے ہیں۔ آسمان پر کیسے پھٹے پھٹے سفید بادل ہیں جیسے کوئی اناڑی مصور برش سے لہریئے بناتا چلا گیا ہو۔ یہ سامنے کے گھر میں پلاسٹک کی سفید کپڑے پھیلانے والی غیر رومانی ڈوری اس وقت کیسی چمک رہی ہے جیسے کہکشاں اور اس باغ میں یہ تین چکروں والا فوارہ جیسے کہانیوں کے سوتے محلوں میں جگمگاتا سونے چاندی کا فوارہ ہو۔ تین چکروں کے بڑے سے چھوٹے ہوتے ہوئے کنارے یوں لگ رہے ہیں جیسے چاندی کی سیڑھیاں گول گول گھومتی اوپر جارہی ہوں جیسے کوئی ان پر چڑھے تو ہاتھ بڑھا کر اس چاندنی کو چھولے۔ ہاں کبھی کبھی یوں ہی لگتا ہے جیسے چاندنی کوئی مرئی چیز ہو، چھوئی جاسکتی ہو، اوڑھی بیٹی جاسکتی ہو، دل میں بٹھائی جاسکتی ہو اور پوجی جاسکتی ہو۔ نامعلوم سب کو ایسا محسوس ہوتا ہے یا مجھے ہی۔ جب میں چاندنی میں چہل قدمی کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں چاندنی کو چھو ہی نہیں رہا ہوں اسے اوڑھ لپیٹ بھی رہا ہوں۔ ایسی راتوں کو جی چاہتا ہے کہ بس چاند کی طرف منہ کر کے چپ چاپ بیٹھ جاؤں اور ساری رات بیٹھا رہوں اگر اسے پوجا کہتے ہیں تو میں واقعی پوجا کرنی چاہتا ہوں مگر آج نہیں۔

آج تو مجھے جانا ہے۔ چاندنی کیسی کھیتوں میں پھیلی پڑی ہے علامہ اقبال بھی یونہی چاندنی

کو اوڑھے پیپٹے پھٹے بادلوں میں چاند کا بے آواز سفر دیکھتے رہتے ہوں گے اور گنگناتے ہوں گے ؎

بس تری چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں

چھپ کے انسانوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انسانوں سے چھپ کے کوئی کہاں جائے۔ اب یہ سامنے سے بڈھا کھانستا چلا آرہا ہے۔ اسے دمہ بھی ہے اور شاید دق بھی، پھر بھی اس وادی سے کیسا چمٹا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ یہ سردی اور یہ ہوا اس کے لئے کتنی مضر ہے ایں یہ ہوا —— اتنی دیر میں اس ہوا کو بھولا ہی رہا بھول ہی گیا کہ میں اس ہوا سے بچ کر نکلا تھا کہیں اور جانے کو۔ لیکن یہ مجھے ہی اتنی بری کیوں لگتی ہے اس بڈھے کو کیوں نہیں لگتی جب کہ اسے دق بھی ہے اور دمہ بھی اور اس چوکیدار کو جو کھلے آسمان کے نیچے مچھلی پکڑنے کی ڈور تھامے بیٹھا رہتا ہے اور اس بڑھیا کو اور شاہ گل کو اور —— جب کہ انہیں اس وادی کے حسن کا بھی احساس نہیں ہے۔ میرے لئے کم از کم یہ تو تسلی ہے کہ اس وادی میں ہوا ہے تو حسین چاندنی بھی ہے۔ ہوا ہے تو بند کمرے بھی ہیں، آتش دان بھی ہیں مگر وہ کیا چیز ہے جو انہیں اس وادی سے جانے سے روکتی ہے۔ کیا انہیں اس ہوا کا شعور نہیں ہے، احساس نہیں ہے۔ ہے مگر وہ اسے اہمیت نہیں دیتے، کیوں نہیں دیتے؟؟؟ جب کہ وہ اتنی بڑی اور اٹل حقیقت ہے نا معلوم کیوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کیوں نہ کل تک اس بات پر غور کر لوں۔ آخر اس گتھی کو سلجھانا تو چاہیئے۔ اگر یہاں سے جانا ہی ہے تو کل سہی، ایک دن میں ایسا کیا فرق پڑ جائے گا۔ یہ تو میرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہوں چپکے سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"وعلیکم السلام بڑے میاں —— ہاں آج ذرا دور تک نکل آیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔"

کہکشاں سے رہگزر تک

پتھروں کی منڈیر پہ ایک پاؤں رکھے، جنگلے کو پکڑے وہ خاموش کھڑی تھی۔
چیڑ کے درختوں میں سے ہوا کی سائیں سائیں یوں آ رہی تھی جیسے وہ منہ سے بول رہے ہوں
دور بہت دور افق کے نزدیک جھلملاتی ہوئی روشنیوں کا غبارہ اتنا ہلکا جیسے محض خیال ہو آج
بھی اسی طرح لرزاں تھا جیسے سات سال پہلے۔ ڈھلوان کے پار جالی دار برآمدے میں آج بھی
روشنی تھی۔ پچھلے دروازے سے نیّر نکلا اور اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں اس مکان کے بِکے جانے کا افسوس ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں" سیما نے کہا ـــ "مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خالہ جان یہ مکان نہیں بیچ رہیں
میرے خواب بیچ رہی ہیں۔"

"خواب!!" وہ ہنسا "ہاں ان دونوں مکانوں میں ہم نے کتنے خواب دیکھے ہیں۔ اگر
سامنے والا گھر فروخت ہونے لگے تو مجھے بھی یوں ہی لگے گا ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری
زندگی کا کچھ حصہ ان سے چمٹا رہ گیا ہے ـــ ہے نا؟"

"مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سارا وجود اسی مکان میں رہ گیا ہے۔"

"یوں نہ کہو ـــ" نیّر بڑبڑایا۔ "یہ جو جیتی جاگتی جگنوؤں کی طرح چمکتی آنکھیں لئے
کھڑی ہے پھر یہ کون ـــ" منڈیر سے پاؤں اتار کر اس نے ہاتھ سے سیما کو اپنی طرف کیا۔ "بولو
یہ کون ہے؟ ـــ"

"معلوم نہیں ـــ" وہ پھر نیچے کھڈوں میں جھانکنے لگی۔

"آؤ تھوڑی دور ٹہلنے چلیں ـــ" نیّر نے کہا۔

بسما خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔ "وہ بھی کیا دن تھے سیما۔ چاندنی راتوں میں جب تم اس جگہ کھڑی ہوتی تھیں جہاں ہم ابھی کھڑے تھے تو نیچے جالی دار برآمدے سے مجھے تمہارا سایہ واقعی خواب سا نظر آتا تھا لیکن اندھیری راتوں میں بھی مجھے یقین ہوتا تھا کہ تم ضرور وہاں کھڑی ہوگی ـــ"

"میں بلاناغہ آتی تھی ـــ خالہ جان بیماری کی وجہ سے رات کو جلد سونے لیٹ جاتی تھیں اور میں ٹہلنے کے بہانے پچھواڑے نکل آتی تھی۔ جالی کی وجہ سے مجھے تمہارا سایہ دھندلا سا نظر آتا تھا مگر تمہاری ہر حرکت نظر آتی تھی۔ تمہارا میز پر ریکارڈ چینجر رکھنا اور ریکارڈ لگانا اور پھر اوپر اس مکان کی طرف دیکھنا۔ تم کیا دیکھتے تھے؟ ـــ"

"تمہیں ـــ"

"میں تو تمہیں نظر نہیں آتی تھی اندھیرے میں ـــ"

"نظر نہیں آتی تھیں پھر بھی میں دیکھتا تھا ـــ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تم جنگلہ پکڑے سامنے کھڑی ہو ـــ"

"میرا ـــ مجھے اتنا عجیب سا لگتا تھا۔ میں تمہاری ہر حرکت دیکھ رہی ہوں اور تم مجھے یوں دیکھ رہے ہو جیسے میں واقعی نظر آ رہی ہوں ـــ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں میں نہیں کوئی خیال ہوں ـــ"

"تم خیال تھیں یا خواب، مجھے یقین تھا کہ تم گھاٹیوں اور پہاڑیوں کے پار کھڑی میرے دل کا حال سُن رہی ہو جو میں ریکارڈ کی زبان سے سنا رہا ہوں۔ پہاڑوں کے مکان مجھے اس لحاظ سے اچھے لگتے ہیں کہ بہت دور دور سے نظر آ سکتے ہیں ـــ"

"افوہ ـــ تم بھی کیسے کیسے ریکارڈ بجایا کرتے تھے ان دنوں۔ بعض دفعہ یوں لگتا تھا جیسے کوئی دل مٹھی میں پکڑ کر دبا رہا ہو ـــ اور کئی مرتبہ تو بے اختیار دل چاہا....."

"کیا چاہا؟"

"جنگلے پر سے پھلانگ جاؤں، ڈھلوان پر سے پھسلتی، پتھروں سے ٹکراتی کسی غار میں جا پڑوں ــــ"

"واہ ــــ" نیر ہنسا۔ "یہ دل نہ چاہا کہ سڑک سڑک بھاگتی ہوئی جاؤں سیڑھیاں چڑھوں اور جاکر نیر سے لپٹ جاؤں۔"

"کئی دفعہ یہ بھی دل چاہا ــــ"

"سچ مچ! ــــ پھر تم کیوں نہ آئیں ــــ؟"

"کیونکہ ہمارے اور تمہارے مکان کی درمیانی سڑک پر خاندانی دشمنی کے کانٹے بچھے ہوتے تھے ــ نظریں اور آوازیں تو ہوا کے دوش پر بھی جا سکتی ہیں مگر انسان کو تو سڑک سڑک ہی جانا پڑتا ہے ــ"

"ہاں ــــ خود میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا مگر ہمت نہ ہوتی اوپر چڑھنا نیچے اترنے سے زیادہ مشکل ہے نا! ــــ مجھے تم اتنی دور اور ناقابلِ رسائی معلوم ہوتی تھیں ــــ"

"اور مجھے اکثر یہ خوف گھیرے رہتا تھا کہ چند دن بعد تم اس کھیل سے اکتا جاؤ گے۔ میں روز رات کو باہر کھڑی رہا کروں گی۔ مگر تم نہ آؤ گے ــ بارہ بجے کوئی آئے گا اور برآمدے کی بتی بند کر کے چلا جائے گا اور میں یونہی کھڑی رہ جاؤں گی۔"

"تم اس حد تک مایوس تھیں ــــ"

"مایوسی کی بات نہیں ــ مجھے یہ سب حقیقت ہی نہیں لگتا تھا۔ ان دنوں ہر چیز خواب لگتی تھی ــــ میں سامنے افق کی روشنی کو دیکھتی رہتی تھی اور سوچتی رہتی تھی یہ کسی شہر کی روشنی ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے روشنی کے کھمبوں کی لکیر ہے یا محض میرا تخیل ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی سے اسی روشنی کے بارے میں نہیں پوچھا ــــ"

"واقعی ــــ ہم دونوں کا ایک ہو جانا ان دنوں انہونی سی بات تھی ــــ وہ تو جب ہمارے ہاں معاشی بحران آیا اور ابا کی نظریں تمہاری خالہ جان کی جائداد پر پڑیں تو دفعتاً

انہیں یاد آیا کہ مسلمان کو مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراضگی جائز نہیں — اور جب انہوں نے تمہارا رشتہ مانگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کہکشاں پر بیٹھی ہوئی کسی پری کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ تمہیں کیسا لگا تھا سیما،،

،، مجھے یوں لگا تھا جیسے افق کی روشنی کی لمبی قطار آن کر میری آنکھوں میں گھس گئی ہو۔،،

،، پھر جب میں تمہیں بیاہ کر اس اونچے بنگلے میں لے گیا جہاں سے وہ دونوں مکان نظر آتے تھے اور ہم بڑی سی چٹان کے سائے میں کھڑے ان جگہوں کو دیکھا کرتے تھے تو کیسا عجیب سا لگتا تھا —،،

،، ہاں — لیکن نیر —،، سیما کی آنکھوں کے جگنو ٹمٹمائے — ،، جب رات ہوتی، کھانا کھانے کے بعد میرا دل بے تاب ہو جاتا کہ میں باہر جا کر اندھیرے میں کھڑی ہو جاؤں اور تم برآمدے میں بیٹھے ریکارڈ بجاؤ اور میری طرف دیکھتے رہو — حالانکہ اس وقت تم میرے نزدیک کھڑے بلکہ میرا ہاتھ تھامے میری طرف دیکھ رہے ہوتے تھے —،،

،، گویا تم مجھے پا کر بھی مجھ سے دور رہنا چاہتی تھیں — سیما! — میں تمہیں قصور وار نہیں ٹھہراتا، تمہاری پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی۔ تمہاری خالہ جو مردوں سے نفرت کرتی تھیں تمہیں مردوں سے نفرت کرنا ہی سکھا سکتی تھیں۔ تم ان کی مرضی کے خلاف اس شجر ممنوعہ کی طرف لپکیں تو ضرور لیکن انجانے میں بٹھائے ہوئے اندھے خیالات کو دل سے نہ نکال سکیں تم مجھے وہ روشنی ہی سمجھتی رہیں جو راہ دکھائے اور سکون و طمانیت کا احساس دلائے مگر تمہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اس مقدس رشتے کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں۔ شادی کے بعد تم میرے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو کسی بے دردی سے جھٹکتی رہیں — سیما! — تمہیں نہیں معلوم مجھے ان دنوں کیا محسوس ہوتا تھا اُف —،، نیر نے جھرجھری لی —،، خدا کا شکر ہے کہ وہ دن چلے گئے حسرت کے کرب ناک لمحے — منزل پر پہنچنے کے بعد کی ناکامی کتنی بڑی ہوتی ہے سیما — !!!،،

"ہونہہ ——" بیما یوں بولی جیسے نیچے کی کھڈ سے بولی ہو۔

"مجھے آج تک اسی شاداں کے قصے کا افسوس ہے۔ نیر نے کہا —— پھر کچھ رُک کر وہ بولا۔

"لیکن وہ بھی اچھا ہی ہوا نا بیما۔ اسی نے ہماری زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔"

"شاداں؟ ——" بیما نے سوالیہ لہجے میں دہرایا اور پھر نہ جانے کہاں کھو گئی۔

"ہاں —— وہی شادی کے چار سال بعد جب سردیوں کی ایک دوپہر کو ملٹے کھاتے کھاتے دفعتاً تم نے کہا تھا —— پھر تم دوسری شادی کر لو —— میں نے کہا تھا کرا دو ہی کہا تھا نا ——"

"ہونہہ ——"

پھر تم نے کہا تھا —— "مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ وہ تمہارے دل کی رانی بن جائے۔ تم ہنس دی تھیں مگر ٹوٹی ہوئی سی ہنسی —— اور میں نے کہا تھا یہ کبھی نہیں ہوگا بیما۔ پھر، ہم دونوں خاموش ہو گئے تھے ——"

"دفعتاً شاداں اُدھر سے گزر رہی تھی ——" بیما نے بات اچک لی۔ "جس کو جاتے آتے تم کچھ عجیب نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اس کے چُست کپڑوں اور مٹکتے جسم سے مجھے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی۔ اس وقت میری زبان سے نکلا تھا —— "نہیں تم شادی مت کرو، یوں تم مجھ سے یقیناً دور ہو جاؤ گے —— ویسے ہی اگر ......"

"اچھا —— تم شاداں سے بات کر کے دیکھو ——" تم نے کہا تھا۔

"کیا یہ بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا ——" بس ہنس دی تھی۔

"اس وقت کچھ لوگ آ گئے تھے اور ہماری بے تکی باتیں ایسے ہی ختم ہو گئی تھیں جیسے ملٹے کے ٹکڑے میز پر بکھرے رہ گئے تھے جیسے اور سینکڑوں بے تکی باتیں ٹھلتے ہیں، کھانا کھاتے میں ادھوری رہ جاتی تھیں —— لیکن ایک رات اندھیرے میں تم نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی تھی "تم نے شاداں سے بات کی بیما؟ ——" اور مجھے یوں لگا تھا جیسے

مجھے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ میں نے تمہارے چہرے کو غور سے دیکھا تھا، بیڈ روم کی ہلکی روشنی میں تمہارا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پاکر، تم نے شرمسار ہوکر کہا تھا تم نے خود ہی تو کہا تھا سیما ــــــ"

"تو کیا تم نے اسے سنجیدگی سے لیا تھا؟ میں چیخ پڑی تھی اور تڑپ کر تمہارے بازوؤں سے نکل گئی تھی ــــــ میرے سر پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ تم اس بات کو ٹھیک سمجھتے تھے ــــــ شاید تم ان دنوں بلانا غہ یہ انتظار کرتے رہے تھے کہ میں شاداں کو لئے تمہارے شبستاں میں داخل ہوں گی ــــــ اور جب ایسا نہیں ہوا تھا تو مجبوراً تمہیں پوچھنا پڑا ــــــ اُف!! تمہیں اندازہ نہیں ہوگا مگر یہ حقیقت میرے لئے زہر سے بھی بڑھ کر تھی ــــــ"

"ہاں ــــــ" نیرؔ کی آواز دکھ سے رُندھی ہوئی تھی۔ "تمہارے بلک بلک کر رونے سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تمہیں کتنا صدمہ ہوا ہے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا ــــــ مجھے بعد میں پچھتاوا بھی آیا مگر میں کچھ نہ کہہ سکا ــــــ میں اپنی نگاہوں میں خود ہی گر کر رہ گیا تھا ــــــ لیکن سیما جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا نا؟ ــــــ"

"کیوں؟ ــــــ"

"جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارا شوہر، وہ روشنی سورج جسے تم آسمان کا باسی سمجھتی ہیں اتنا گر سکتا ہے تو تمہیں یقین ہو گیا کہ اسے سہارا دینا ہی پڑے گا ورنہ وہ کسی اندھے کنوئیں میں منہ کے بل جا گرے گا اور اس کے بعد میں نے تمہارے رویے میں واضح فرق دیکھا۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں ایک الہڑ، ان پڑھ جنگلی سی لڑکی نے تمہارے خیالات و جذبات کو کتنی جلد بدل ڈالا ــــــ تمہاری خالہ کے بتلائے ہوئے اندھے خیالات چھٹ گئے اور تم ایک نئی لڑکی بن گئیں۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا ــــــ پھر بھی آج میں تم سے اسی بات کی معافی مانگتا ہوں۔"

"معافی! ــــــ کس سے؟ ــــــ" وہ یوں بولی جیسے چیڑ کے درخت کی سب سے اونچی

پر بیٹھی کچھ کہہ رہی ہو۔ اس کی آواز اور نیرؔ کے کانوں کے بیچ میں پورے درخت کی سائیں سائیں ہو۔ کئی گزہ کے اندھیرے کا سایہ ہو۔

" اپنی اسی بے جا حرکت کی معافی جس پہ مجھے شرمندہ ہونا چاہیئے تھا اور ہوں —— مگر ساتھ ہی خوش بھی ہوں کہ اس واقعہ نے انجانے میں تمہارے خیالات کو سدھار دیا۔"

" ہونہہ —— اس نے میرے خیالات کو نہیں بدلا —— مجھے بدل دیا، میری ہستی کو، میرے وجود کو —— میرے جسم کو —— "

" کیا مطلب ؟ " نیرؔ رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

" اس نے میرے خیالات کو بدل دیا۔ اس الھڑ، ان پڑھ جنگلی لڑکی نے۔ .... نہیں نیرؔ ایسا نہیں ہوا —— بلکہ ...... " جیسے وہ خواب میں بڑبڑا رہی تھی۔

" بلکہ اس واقعہ کے بعد جب بھی تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا وہ میں نہیں تھی —— وہ سیما نہیں تھی وہ شاداں تھی۔ الھڑ، ان پڑھ جنگلی لڑکی —— جس کو تم نے خوابوں میں کھوئی ہوئی، کہکشاں پر سے اتاری ہوئی، آنکھوں میں جگنو لئے پھرنے والی لڑکی پر ترجیح دی تھی —— جس کے لئے نامعلوم کتنی مدت تک تم نے اپنے شبستان کا دروازہ کھلا رکھا اور پھر کبھی بند بھی کیا یا نہیں —— تو نیرؔ یہ شاداں تھی جو بعد میں تمہارے شبستاں میں جگمگاتی رہی، جس نے تمہارے پھیلے ہوئے ہاتھ کو کبھی نہیں جھٹکا —— کیا تم نے کبھی فرق محسوس نہیں کیا ؟ —— میرا مطلب ہے تمہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں میں نہیں بلکہ کوئی الھڑ —— ان پڑھ —— یہ تم آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہے ہو۔ میں تو اکثر یہ بھی سوچتی ہوں کہ اپنے بچوں کو اپنا سمجھوں یا ..... "

نیرؔ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے اس نے چٹان میں سے نکلے ہوئے درخت کی ایک شاخ کو تھام لیا جس کی ساری جڑیں پتھریلی زمین سے یوں نکل پڑی تھیں جیسے سڑک کے بیچے کچلے جانے والے کسی جانور کی آنتیں۔ اس کی ٹھوکر سے چیڑ کا سوکھا ہوا خوشہ لڑھکتا لڑھکتا

نیچے چلا گیا پتھروں سے ٹکرا کر اس کے گرنے کی آواز بہت دیر تک آتی رہی نیرؔ کو یوں محسوس ہوا جیسے بیما واقعی کسی مدہوش کن نغمے کی تاب نہ لا کر جنگلہ پھلانگنی، ڈھلان پہ سے پھسلتی۔ پتھروں سے ٹکراتی کسی غار میں جا گری ہے۔ کیا وہ اسے ڈھونڈنے جائے ـــــ مگر شاید اب وہ کہیں بھی نہیں ہے ـــــ اتنے عرصے میں تو اس کی ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی۔

نیک پروین

بات بڑی آسانی سے اُلجھتی چلی گئی۔

یہ قصہ ہے فرانسیس پروین کا جو میرے ہاں جمعدارنی تھی۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے ٹامس کو ٹھوٹس کہا کرتی تھی۔ ماں بیٹے خاصے بدشکل تھے اور غلیظ بھی۔ ماں کے چہرے پر کچھ جھرّیاں وقت نے، کچھ دھوپ، میل کچیل اور غلاظت نے ڈال دی تھیں۔ بیٹا فطری کاہل، کام چور نظر آتا تھا مگر ماں کا یقیناً راج دلارا تھا کہ وہ جب بھی ٹھوٹس کا ذکر کرتی اس کے چہرے پہ کلیاں سی چٹکتی نظر آنے لگتی تھیں۔

پروین کا شوہر عرصہ دراز ہوا مر چکا تھا اور پروین اپنے دیور کی بائیسکل کے پیچھے بیٹھ کر کام کرنے آتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر اپنے کام پر چلا جاتا تھا اور واپسی پر سے لے لیتا تھا۔ کبھی وہ جلدی چلا آتا۔ تب وہ دونوں پچھلے باغ میں لگے ایک امرود کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر سگرٹ پیتے، کیڑے بھرے لیکن زرد زرد امرود کھاتے جنہیں گلہریوں اور چڑیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں کھاتا تھا اور پھر پروین جاتے جاتے یہ ضرور کہتی "بیگم صاحب میں جا رہی آں۔" یعنی روٹی، باسی سالن یا کوئی اور چیز دینا ہے تو دیدو۔ کبھی کبھی وہ لاڈلا ٹھوٹس بھی آن دھمکتا اور ماں امرودوں اور بچے کھچے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے یوں اس کی تواضع کرتی جیسے وہ آج ہی کہیں دور سے مہمان آیا ہو۔

میری اور اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ جب کبھی وہ ایڈوانس لینے کے موڈ میں ہوتی تو اِدھر اُدھر کی بات شروع کر دیتی اور تان آخر میں اپنے مطلب پر توڑتی تھی۔ کبھی یہ پوچھتی کہ تم کیا پڑھتی رہتی ہو، کبھی اپنی بیماری آزادی سے بات شروع کرتی اور

کبھی کسی نئی خبر یا شہر میں ہونے والے کسی حادثے سے۔ مگر ایک دن وہ بغیر کسی تمہید کے بولی: "بیگم صاحب یہ جو میرا دیور ہے نا، تم نے دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے۔"

"کیسا ہے؟"

"اچھا خاصا ہے۔"

"میں اس سے شادی کر لوں؟"

میں متعجب ہوئی۔ دیور جوان گبھرو تھا۔ پروین اس کی ماں کے برابر لگتی تھی۔ حیرت شاید میری آنکھوں سے عیاں تھی۔ میرے جواب دینے سے پہلے وہ بولی "وہ ہی جی میرے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ آج سے نہیں کئی برسوں سے۔ میں نے اسے ڈانٹا ڈپٹا بھی، سمجھایا بھی مگر وہ نہیں مانتا۔"

"اچھا"، اتنی دیر میں ایک لفظ بمشکل میری زبان سے نکلا۔

"ہاں جی —— میں نے اسے بڑی اچھی اچھی لڑکیاں دکھائیں مگر اس کی تو بس ایک ہی رٹ ہے کہ تو ہی مجھ سے شادی کر۔"

"پھر تم کیا کہتی ہو؟"

"میں یہی کہتی ہوں کہ میں بوڑھی ساڑھی، میرا تیرا میل نہیں ہے۔ میں تو اپنے ٹھومس کے لئے جیتی ہوں۔ پر بیگم صاب وہ بھی ٹھومس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ ایسا باپ بن کر دکھاؤں گا کہ کوئی نہ جانے گا کہ سگا باپ نہیں ہے۔"

"تمہاری برادری کے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں کہ اپنے دیور کی شادی کہیں اور کر یا خود کر لے، کیوں اسے بوڑھا کر رہی ہے۔ پر جی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں نے کل پھر ایک لڑکی اسے دکھائی ہے۔ بہت خوبصورت ہے، دیکھو شاید مان جائے۔"

"پھر اب مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟" میں نے کہا۔

"ایسے ہی میں نے سوچا تم سے پوچھ کر دیکھوں۔ سارا محلہ کہتا ہے۔ بیگم صاب بڑی اکل والی اور گریبوں کی ہمدرد ہے۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور اس واقعہ کو بھول بھال گئی۔ کئی ماہ گزر گئے تو ایک دن وہ پھر سر پہ آن نازل ہوئی۔ "بیگم صاب ایک بات کہوں؟"

"کہو"

"جی، وہ میرے پاس کچھ روپے ہیں وہ تم اپنے پاس رکھ لو۔"

"کیوں؟ خیریت؟"

"میں شادی کر رہی ہوں نا جی۔"

"اچھا! کس سے؟"

"اسی سے جی، دیور سے" کہہ کر وہ کچھ لجاسی گئی۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ پھر ہمت باندھ کر وہ بولی "آپ کو جی پتہ ہے میرے پاس جو کچھ ہے۔ میں نے پیسہ پیسہ جوڑا ہے۔ کوئی اچھا جوڑا یا جوتا ملتا ہے تو اسے اونے پونے بیچ دیتی ہوں۔ یہ میرے ٹھومس کا حق ہے۔ مگر بشیرے کو پتہ چل گیا تو وہ مانگے گا ضرور، حالانکہ اس کے بھائی کا ایک پیسہ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ وہ تو سب اڑا دیتا تھا۔ سگرٹوں میں اور چرس میں۔ پھر بتاؤ بیگم صاب جو تم روپیہ رکھنے کی حامی بھرو تو میں شادی کے لئے ہاں کر لوں۔"

میں نے کچھ دیر سوچا۔ روپیہ رکھنے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آئی۔ آخر پیرو دین کو مجھ پر بھروسا ہے تبھی پیسہ رکھ رہی ہے۔ باقی رہا بشیرے کو دینا نہ دینا تو وہ جانے اور بشیرا جانے۔ میں نے پیسہ رکھنے کی حامی بھر لی اور پیرو دین نے بشیرے سے شادی کر لی۔

اب بھی وہ اسی بشیرے کی سائیکل پر بیٹھ کر کام کرنے آتی۔ فرصت کے اوقات میں دونوں امرود کے سائے میں بیٹھ کر سگرٹ پیتے باتیں کرتے اور کیڑے بھرے لذیذ

امرود کھاتے۔

ایک دن پروین نے مجھ سے کہا کہ اگر کبھی وہ بطور قرض کچھ روپئے بشیر سے کے سامنے مانگے تو اس کے رکھے ہوئے پیسوں میں سے دے دیا کروں۔ مگر بشیر سے یہ بھی ظاہر کروں کہ قرض دے رہی ہوں۔ میں نے اس کے لئے بھی حامی بھرلی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اب میں پروین کے رازوں کی اور اُس کے پیسوں کی امین تھی۔

کرسمس اور اپنی بہن کی شادی کے موقع پر پروین لاہور جانے لگی تو اس نے مجھ سے تین سو روپئے قرض مانگے۔ رقم زیادہ تھی۔ میں نے تھوڑی سی حیل و حجت کی کہ یکمشت اتنی رقم نکالنا میرے لئے مشکل ہے۔ بشیر اساتھ تھا۔ پروین نے میری خوشامد کی کہ بیگم صاحب موقع ہی ایسا ہے۔ کرایہ بھاڑا ہے، لینا دینا ہے کپڑے بنانے ہیں۔ آپ نہیں دیں گی تو کون دے گا۔ واپس آکر بشیر اور میں دو ہی مہینوں میں آپ کا سارا قرض اتار دیں گے۔ پروین نے یقیناً مجھ سے بہتر ایکٹنگ کی اور میں نے اس کی جمع پونجی میں سے تین سو روپئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ اپنی جگہ ایک عورت بھی رکھوا گئی اور کہہ گئی کہ بشیر اپنجاب سے جلد واپس آجائے گا اور اُس کی واپسی تک وہ ہمارے گھر کا کام کرے گی۔

میری نئی جمعدارنی زیادہ باتونی تھی۔ وہ مجھے بتاتی کہ پروین کا سابقہ دیوداور حالیہ شوہر خاصا شرابی جواری تھا مگر بھاوج سے نکاح پڑھوانے کے بعد نہایت شریف بن گیا ہے۔ "خدا جانے اس کالی، مریل، بوڑھی میں ایسے کیا گن ہیں کہ پہلا شوہر بھی اس کے نام کا کلمہ پڑھتا تھا اور یہ بھی اس کی مٹھی میں ہے۔"

"اس کی زبان میٹھی ہے۔"

"نہیں جی یہ بات نہیں ہے کبھی غصے میں آجاتی ہے تو اتنا بکتی جھکتی ہے کہ آپ دیکھا کریں۔ مگر ویسے اس کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے جو یہ مردوں کو رام کر لیتی ہے۔"

"ہوگا۔" میں مختصراً کہتی اور ان وہمی عورتوں کے سامنے کیا کہا جاتا۔

کوئی ایک مہینے بعد بشیرا واپس آیا تو خاصا اُجڑا اور پریشان نظر آ رہا تھا "بیگم صاب پروین سخت بیمار ہے۔ ڈاکٹرنے بڑا آپریشن بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے میں نے بیگم صاحبہ کے پاس جو روپئے رکھوائے ہیں وہ لے کر فوراً آ۔ میں نے کہا بھی کہ منی آرڈر سے منگوا لیتے ہیں۔ پر وہ نہ مانی کہ نہیں یوں بیگم صاب نہ بھیجے گی۔ تو خود جا اور لے کر آ۔ بیگم صاب جلدی سے پیسے دے دو۔ آج ہی واپس جانا ہے۔ اگر آپریشن میں دیر ہوئی تو اس کی جان کا خطرہ ہے۔"

"کیا ہوا اسے؟" میں نے پوچھا۔

"جی وہ بچہ ——— پیٹ میں مر گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتی ہے آپریشن سے نکالنا پڑے گا اور خون وغیرہ بھی دینا ہوگا۔" اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

افوہ، اس عمر میں بچہ! مجھے ان لوگوں کی عقل پر ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ پروین کے لئے تو بطوس ہی سب کچھ تھا۔ ظاہر ہے کہ بشیرے کو شوق چرایا ہوگا ——— بہرحال اس سے میں کیا کہتی۔ میں نے پیسے نکال کر دے دیئے اور وہ اسی وقت چلا گیا۔

کئی ماہ گذر گئے۔ میرے ہاں نئی جمعدارنی کام کرتی رہی۔ کبھی میں اس سے پوچھتی کہ پروین اور بشیرا کب آئیں گے تو وہ گول مول جواب دے دیتی مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ میرا کام چھوڑنا نہیں چاہتی، ہوسکتا ہے پروین اور بشیرا آ بھی گئے ہوں اور انھوں نے کوئی نیا ٹھکانا سنبھال لیا ہو کیونکہ ان کے ہاں یہ بھی ایک عام سی بات ہے۔

پھر ایک دن اچانک پروین آ گئی۔ وہ کمزور اور پریشان سی لگ رہی تھی۔ میں نے خیریت پوچھی تو رونے لگی۔ بولی "بیگم صاب، میں لاہور میں تھی اور بشیرا دوبئی بھاگ گیا۔ لاہور میں جی مجھ سے منت کر کے پیسے مانگتا تھا۔ دوبئی جانے کے لئے کبھی غصے میں مارتا تھا اور کہتا تھا ہونہ ہو تیرے پاس پیسہ ہے، ساری دنیا جانتی ہے۔ ایک دن میں نے غصے میں کہہ دیا کہ ہاں ہے مگر بطوس کے لئے ہے تو جان سے بھی مار دے تو میں نہیں دے سکتی۔ اس پر وہ ناراض ہو کر لاہور سے آ گیا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ ابھی کراچی سے کوئی رشتے دار آیا تو پتہ چلا کہ وہ تو دوبئی چلا گیا۔

ہوجی بیگم صاب خواہ مخواہ میری بے عزتی ہوتی۔ دنیا مجھ پر ہنستی ہے کہتی ہے تیرا دولہا کہاں ہے۔ میں کہتی ہوں دفعہ کرو لالچی کو۔ اچھا ہوا چلا گیا، منہ کالا کیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ٹھوس کا باپ بن کر اُس کا گلا کاٹنا چاہتا ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اس نے مجھ سے روپئے کے لالچ میں شادی کی تھی۔ میں نے جو پائی پائی کر کے آپ کے پاس رقم جمع کرائی تھی اس لئے تو نہیں کہ اس بے ایمان کو دے دوں —— "

وہ بولے جا رہی تھی اور میں گم چپ سا —— اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ جسم کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ چہرے کی جھریوں میں پسینہ بہہ رہا تھا۔

" بیگم صاب میں اتنی بیمار پڑی، تب میں نے آپ سے پیسے نہ منگوائے۔ خدا بھلا کرے مشنری والوں کا، انہوں نے مفت میرا علاج کیا۔"

اب میں اس سے کیا کہتی کہ بشیرا تو پیسے لے بھی گیا۔ یقیناً یہ وقت ایسی بات کہنے کا نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ بات پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھی۔ پروین اس قدر کمزور تھی کہ اس نے میرے ہاں کا کام دوبارہ شروع نہ کیا مگر اپنے رکھوائے ہوئے پیسوں میں سے اب بھی وقتاً فوقتاً پیسے لینے آتی رہتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ مناسب وقت دیکھ کر اسے حقیقت حال سے آگاہ کر دوں گی۔ میرے پاس سے دو چار سو روپئے لینے کے بعد شاید یہ صدمہ اس کے لئے قابلِ برداشت ہو جائے۔

ایک دن پروین آئی اور آتے ہی اپنے باقی ماندہ پیسے مانگے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ میں نے ٹالنے کے لئے کہا کہ آج میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر کسی دن دے دوں گی۔ میں چاہتی تھی۔ تنہائی میں اسے ساری بات، بتا کر جتنی مدد ہو سکے کر دوں، مگر وہ ایک دم اینٹھ گئی اور اس شخص کے سامنے بدتمیزی سے کہنے لگی " بیگم صاب میں اپنے پیسے مانگ رہی ہوں کوئی خیرات نہیں مانگ رہی جو تم نخرے دکھا رہی ہو۔"

یہ سنتے ہی مجھے طیش آگیا اور میں نے وہ بات پتھر کی طرح اس کے سر پہ دے ماری

"کیسے پیسے؟ تمہارے پیسے تو کب کے بشیرا لے بھی گیا۔ یہ جتنے پیسے اب تک دیئے ہیں سب اپنے پاس سے دے رہی ہوں" غصے میں دھڑ سے دروازہ بند کر کے میں نے چٹخنی لگادی——
اور اپنے کاموں میں مصروف ہوگئی۔

ذرا دیر بعد سڑک کی طرف سے چیخ پکار کی آواز سُنی تو میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پروین چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ محلے کے سارے چوکیدار، خانساماں اور ڈرائیور اس کے گرد جمع تھے۔ کئی بیگمات بھی باہر نکل آئی تھیں۔ میں سمجھی بے چاری کے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا۔ لپک کر باہر نکلی تو وہ کہہ رہی تھی، "میرے پانچ ہزار کھاگئی یہ بیگم —— جھوٹ بولتی ہے کہ بشیرا لے گیا۔ ایک پائی ہضم نہیں ہوگی اسے۔ غریب کا پیسہ آسانی سے ہضم نہیں ہوتا۔ خون تھوکے گی——"

جی چاہا چوٹی پکڑ کر ایک لگاؤں مگر اپنی رہی سہی عزت بچا کر لوٹ آئی اور دروازہ بند کر لیا۔ خدا معلوم وہ کب تک بکتی جھکتی رہی۔ میں اپنی صفائی میں کہتی بھی کیا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ بشیرا پروین کے پیسے لے گیا ہے اور نہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پروین نے میرے پاس فقط ڈیڑھ ہزار روپئے رکھوائے تھے۔

ہڈی

چچی بے چاری کیا کرتیں بیٹے کی خوشی کا خیال تھا کہ وہ خود جیسا بھی تھا۔ بچپن سے بس خوبصورت چیزوں پر جھٹ سے عاشق ہو جاتا تھا۔ اب چاہے وہ زمین پر رینگنے والا کوئی کیڑا ہو یا آسمان پر اڑنے والی قازوں کی ڈاریں۔ رنگ برنگی چیزوں پر اس کا بس نہ چلتا تھا کہ انہیں نگل لے۔ قوس قزح نکلتی تو لگتا جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ بچپن سے ہی حسین صورتوں کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا کہ اپنے پرائے ہنس ہنس کر دہرے ہو جاتے۔ اسے خبر تک نہ ہوتی ذرا بڑا ہوا تو محلے کی ساری نک سک سے درست عورتیں کوڑی پھیرے کر واتیں لیکن کوئی کالی کلوٹی بینگن لوٹی اس کی بھلمنساہٹ سمجھ کر کوئی کام بتاتی تو ایسے بدل کر بھاگتا جیسے بے سدھا گھوڑا۔

جوان ہوا تو چچی کو شادی کی فکر ہوئی۔ اس وقت سب پیار میں چمن میاں کہتے تھے۔ چمن میاں کی مانگ صرف یہ تھی کہ بیوی خوبصورت ہو۔ باقی کی خانہ پُری چچی نے کی اور لڑکی کی تلاش میں جُٹ گئیں۔ انہوں نے پاکستان کے بائیس امیر گھرانے تو خیر چھوڑ دیتے اس کے بعد سے ہر بڑی کو بھی کٹھالہ، محل دو محلہ جھانکنا شروع کر دیا۔ بہت جلد انہیں پتہ چل گیا کہ لڑکی ٹُل کر نہیں بکتی۔ پھر بھی بارٹر سسٹم تو ہے۔ اب انہوں نے زینہ اترنا شروع کیا۔ ڈیفنس سوسائٹی اور کے ڈی اے اسکیم نمبروں سے اُتر کر پی ای سی ایچ ایس تک آئیں پھر مخمل کے صوفے اور بخارا کے قالین چھوڑے ریگسین کے صوفوں اور ملتان کی دریوں تک پہنچیں۔ مگر بات نہ بنی۔ بارٹر ٹھیک نہ بیٹھتا۔ کبھی ادھر پلڑا جھک جاتا کبھی اُدھر۔ ہوتے ہوتے چچی لالو کھیت جا پہنچیں۔ لڑکی حسین تھی اس میں شک نہیں، بی اے پاس بھی تھی مگر غربت بہت تھی لالو کھیت کا نام بھی تھا جو کراچی کے سلمز کا سمبل ہے وہاں جا کر بھولا نا اپنی سفید پوشی پر داغ لگانا تھا۔

مگر مجبوری ــــ چچی کا دل تو نہ ٹھکتا تھا۔ مگر دماغ ٹھک گیا۔ سوچا غریب گھر کی بیٹی ہے۔ دب کر رہے گی۔ لڑکے کو خوبصورت بیوی مل جائے گی سب خوش تو خدا خوش ــــ

چچی کی کمزوری بھانپ کر لڑکی کے باپ نے اعلان کر دیا کہ لڑکی تین کپڑوں میں رخصت ہو گی اور وہ بھی گھر کے کپڑوں میں جو شادی کے وقت وہ اتفاق سے پہنے ہو گی۔ چچی دُھن کی پکی تھیں ایک مرتبہ جو سما گئی سما گئی۔ اُلجھنوں کو دُور کرنا انہیں آتا تھا ہر چند کہ گھر میں دھن نہیں برس رہا تھا۔ میاں اور بیٹے کی کمائی گھر میں سفید پوشی کا بھرم ہی بن کر رہ جاتی تھی۔ مگر آن کی خاطر انسان کیا کچھ نہیں جھیلتا۔ قرض ادھار لے کر چند ہزار کا جہیز سمدھیلنے بھجوا دیا۔ دونوں طرف کا کھانا بھی کیا اور اچھی بریاں چڑھائیں۔

چند دن جیسا کہ دستور ہے خوب واہ واہ ہوتی اب فکر کا حال مردہ جانے اور میاں بیوی کے تخلیئے کا حال میاں بیوی۔ لوگوں نے تو یہ دیکھا کہ ذرا ہی دن بعد جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ کوئی کہتا لڑکی کو صورت کا مان تھا سوچ کر آئی تھی۔ میاں پاؤں دھو کر پئے گا۔ مگر چمن میاں کو پہلے ہی بھابیوں نے سمجھا دیا تھا کہ میاں صورت تو چار دن کی چاندنی ہے اگر اب دبتے میں آ گئے تو پھر اندھیری راتوں میں بھی نہ ابھر سکو گے۔ سوچ لو ہمارا کام سمجھانا تھا۔ کچھ کہتے تھے کہ چچی بیاہ تو لائیں۔ مگر جہیز کی پھانس ان کے دل سے نہ نکلی۔ لڑکی بجائے احسان مندی کے بوجھ تلے دبنے کے میکے کی چیزوں پر یوں حق جتاتی جیسے ایکوں ایک اس کے باپ کی کمائی کی ہوں۔ کچھ کا تجربہ تھا کہ یہ سب جٹھانی کی کارستانی ہے۔ فساد کی جڑ وہ تھیں کہ بظاہر تو مسکین بلی بنی رہتیں مگر دیورانی کے آتے ہی ساس سسر اور دیور کی خدمت میں وہ تیزی دکھائی کہ اپنے پرائے سب کہہ اُٹھے کہ نئی صورت کو لے کر کوئی چاٹے۔ بات یہ تھی کہ کم بخت آئینہ انہیں اپنی کم صورتی اور دیورانی کے حسن کا احساس کچھ بڑھا چڑھا کر دلانے لگا تھا اور تب سے شعوری یا غیر شعوری کوشش یہ تھی کہ دامے، درمے، سخنے قدمے کسی طرح دیورانی کو نیچا دکھائیں آتے جاتے دیور کو بھی کچھ سنا دیتیں۔ الھڑ دلہن کو ہوش ہی نہیں تھا کہ

ان کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے۔ وہ اپنی صورت اور دلہن پے کا مان لئے میاں سے بہت سی فرمائشیں کرتیں اور جمن میاں ٹال جاتے۔ آخر یہ فرمائش صرف میکے جانے تک محدود رہ گئی۔ جس کا جواب بھی رکھائی سے ملتا۔ "اماں سے پوچھ لو ـــــ" غرضیکہ خاندان والوں کو بھی اندازہ ہوا کہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ بات بڑھ جاتی ہے۔ گلشن بی میکے جاکر بیٹھ جاتی ہیں تو سسرال سے کوئی لینے بھی نہیں جاتا۔

اب چچی نے بھی ساری بات کھول دی تھی کہ کس طرح جہیز تک انھوں نے بہو کے گھر پہنچا دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ بھئی "اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں" ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بات کی تہہ کو پا گئی ہیں۔ وہی سو باتوں کی ایک بات کہ انھوں نے "ہڈی" نہ دیکھی تھی۔ اور صورت پہ ریجھ کہ ایسی جگہ کی لڑکی اٹھا لائیں جہاں میاں بیویوں کا لڑنا روز کا معمول۔ ساس کی خدمت وہ کیا جانیں کہ کس چڑیا کا نام ہے۔ ایثار قربانی کے معنی وہ کیا جانیں جہاں نہ چھوٹوں کو بڑوں کا پاس نہ بڑوں کو چھوٹوں کا لحاظ ـــــ آپا دھاپی کا ماحول۔ بس وہ تو یہی فلمی خواب دیکھتی آئی تھیں کہ روز بن سنور کر شوہر کے ساتھ سیر یں کریں گی۔ باغوں میں گاتی پھریں گی۔ فلمیں دیکھیں گی اور ہیروئن کے جیسے کپڑوں اور زیوروں کی فرمائش کریں گی۔ جسے میاں آمنا صدقنا کہتے ہوئے پوری کرتے جائیں گے۔ چچی مانتی تھیں کہ غلطی ان سے ہوئی تھی۔ مگر بات تو انھوں نے بیٹے کے ہاتھوں ہی کھائی تھی۔ جسے خوبصورت چیزیں ازل سے اپنی طرف کھینچتی تھیں۔

چچی کی بات میں بھی کچھ سچائی ضرور تھی کہ گلشن بی ٹیکٹ (TACT) نامی کسی چیز سے واقف نہ تھیں۔ وہ ایسی جگہ سے آتی تھیں جہاں لوگ زن و شوہر اور ساس بہو کی تو تو میں میں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ گلشن بی نے بھی فیل مچانا اپنا حق سمجھا۔ وہ لڑ کر میکے جا بیٹھیں۔ یہاں سے کوئی لینے نہ جاتا اس طرح دوری بڑھی کوئی دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ وہ ایک لڑکی کی ماں بھی بن گئیں۔ گلشن بی خود کسی بہانے آجاتیں یا کوئی تقریب کھینچ لاتی مگر ان

کے دل میں پھانسی سی رہتی۔ ایک خار یہ بھی تھا کہ زچہ خانہ میں جو کھلائی پلائی ہوتی ہے، اور جس طرح لڑکیوں کو ہاتھوں میں رکھا جاتا ہے انہیں نہ رکھا گیا۔ چچی کو یہ ملال کہ بلا سے بیٹی کو کچھ نہ دیا تھا تو کیا نواسی کے لئے ایک سوسی کی فراک کا بھی یارا نہ تھا۔

دل کی رنجشیں بڑھتی گئیں۔ دوا کسی طرف سے نہ ہوتی۔ آخر کار اس چاند سی صورت کو ایسا گھن لگا کہ چمن میاں دیکھنے کے روادار نہ رہے اور گلشن بی اپنی بیٹی کو لے میکے جا بیٹھیں۔ باپ تھے زبردست۔ انہوں نے مہر کے ساتھ جہیز، زیور، کپڑے یہاں تک کہ داماد کے گھر تک کا دعویٰ ٹھوک دیا۔ خیر مہر اور بیٹی کے ماہانہ خرچ پر جان چھوٹی اور چمن میاں پھر لنڈورے کے لنڈورے۔

بہت دن ہاتھ لیبا رہا۔ خاندان میں سُبکی۔ بیوی سے علیحدگی، بچی سے دائمی جدائی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایسے زبردست نانا کے ہوتے اب بیٹی کی صورت دیکھنے کو ترس جائیں گے۔ چچی نے تو یہی علاج سوچا کہ جھٹ پٹ دوسری شادی کر دی جائے۔ مگر چمن میاں نے سختی سے انکار کر دیا۔ جب ان کی طرف سے ہر طرح کی آزادی اور رواداری کے باوجود بیوی ساتھ نہ دے سکی تو اب کیا کھا کہ دوبارہ تجربہ کریں۔ جمع پونجی کچھ شادی میں نکل گئی تھی۔ باقی مہر کی نذر ہو گئی۔ بیٹی سے علیحدگی کا داغ جدا۔ اس سودے میں کیا ہاتھ آیا جو دوبارہ ہاتھ ڈالیں۔ ماں نے بظاہر تو چمن میاں کی بات مان لی۔ مگر چپکے چپکے کوشش میں لگی رہیں۔ اس کوشش میں بھی چار پانچ سال نکل گئے۔

دل میں انہوں نے ٹھان لی تھی کہ اب کے ایسی بہو لاؤں گی کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے، ہڈی بوٹی سے ایسی درست کہ خاندان والے بھی مان جائیں۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ اب کیا پورے شہر میں ایک لڑکی بھی ان کی مرضی کی نہ ملے گی۔ جب کہ اب چمن میاں کی تنخواہ بھی زیادہ ہو گئی تھی اور گھر بھی پہلے سے بہتر مل گیا تھا۔

اب تک شادی کے ادارے جگہ جگہ کھل گئے تھے۔ لڑکی دکھانے والیوں کی بھی کمی نہ تھی۔

"چچی نے پہلی شرط خاندان کی رکھی اور دوسری صورت کی۔ ایک عفیفہ صغریٰ بی بی نے آن کر چچی سے کہا کہ لو بی تمہارا کام بن گیا۔ ایسا گھرانہ مل گیا جو ہو بہو تمہاری مرضی کے مطابق ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ لڑکی کا باپ ابوظہبی میں شیخوں کے ہاں اعلیٰ عہدے پر ہے لڑکی ایم اے پاس، خوبصورت گوری چٹی۔ ہمہ صفت موصوف۔ جہیز کی طرف سے بے فکر رہو کہ لڑکی اکلوتی ہے اور انہوں نے ابھی سے گھر بھر لیا ہے یہ بیان سن کر خاندان والے ششدر کہ ایسی لڑکی کے لئے چمن میاں سے بہتر کوئی بر نہیں جڑتا۔ مگر چچی کسی وہم میں مبتلا نہیں تھیں" معاملہ بس طے ہی سمجھو کہ ماں باپ تو ابوظہبی میں ہیں اور انہوں نے سارا اختیار رمانی کو دے دیا ہے۔ رمانی سو فیصد صغریٰ بی بی کے کہنے میں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم جس رشتے کے لئے زور دو گی میں وہیں کر دوں گی۔" بس ایک بات کا خیال تھا کہ طلاق کی بات فی الحال نہیں بتائی گئی تھی۔ صغریٰ بی بی نے کہا تھا کہ جب وہ لڑکے کو پسند کر لیں گے اور معاملہ بیٹھنے لگے گا، تب وہ خود سلیقے سے ساری بات لڑکی والوں کو بتا دیں گی۔ عجیب اتفاق ہوا کہ رات کو ہی چچی نے چمن میاں کو خواب میں دولہا بنتے دیکھا اور صبح کو صغریٰ بی بی یہ خوشخبری لائی۔ ان کا دل کہہ اٹھا کہ اب بات بن گئی۔ عبادتیں اور ریاضتیں کام آئیں۔ چچی نے بیٹھے بیٹھے دس روزے اور مان لئے اور تیار ہو صغریٰ بی بی کے ساتھ لڑکی دیکھنے چلی گئیں۔

باہر سے گھر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ دو منزلہ گھر سنگِ مرمر اور سنگِ سبز میں کھڑا جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ گھر کی تعریف میں کچھ کہنے ہی کو تھیں کہ صغریٰ بی بی نے کہا۔ "لڑکی کے ماموں کا گھر ہے مگر فکر نہ کرو۔ یہ بھی لگا ہوا جو گھر بن رہا ہے جس میں منوں کے حساب سے سنگِ مرمر لگ رہا ہے۔ یہ لڑکی کے باپ کا ہے۔"

چچی نے اطمینان کا سانس لیا اور اندر داخل ہو گئیں۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا تر بتر سبزے پر سے ہوتا ہوا روح تک کو سیراب کر گیا۔ راستے کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ سرخ بیر بہوٹی جیسی کار کی للچائی نظروں سے ناپتی اندر داخل ہوئیں تو ڈرائنگ روم جیسے اودے پور کا

محل۔ یہ شاندار صوفے اور یہ جھلمل کرتے فانوس اور وہ قدِ آدم گلدان کہ ایک منٹ کو تو مارے رعب کے قدم اٹھانا دشوار ہو گیا یا شاید قالین ہی اتنا گداز تھا کہ اس میں پاؤں دھنس کر رہ گئے۔

آخر بیٹھیں۔ لڑکی کی ممانی آئیں۔ وہ باتیں کرتی رہیں۔ وہ پندرہ سال سے باہر تھیں۔ افریقہ اور وسط ایشیا اور جانے کہاں کہاں رہ کر آئی تھیں۔ اتنے ملکوں کی کہانیوں میں جیسے وقت پر لگا کر اڑ گیا۔ نوکر ٹرالی چائے کی لے کر آیا تو چچی نے چونک کر دیکھا۔ جیسے کم از کم بیس آدمیوں کی دعوت ہو۔ کھاتے کھاتے اچانک چچی کو خیال آیا کہ اصل کام تو رہا ہی جاتا ہے

"ارے لڑکی کو تو بلواؤ" چچی نے صغریٰ بی بی سے چپکے سے کہا۔ اتنی ہی دیر میں چار پانچ سال کی ایک گڑیا سی لڑکی آن کر دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ اتنی پیاری بچی کہ اس پر سے نظر نہ ہٹتی تھی۔ چچی بہنوں کی صورت دیکھ کر لڑکی کی شکل کا اندازہ کرنے میں ماہر تھیں۔ فوراً حساب لگایا کہ اگر بچی سے آدھی بھی ہوئی تب بھی بری نہ ہوگی۔

"اس کی بڑی بہن ہے؟" انہوں نے صغریٰ بی بی سے پوچھا۔ صغریٰ بی بی گردن ہلاتی لڑکی کو بلانے چلی گئیں تو چچی نے بچی کو بلا کر گود میں بٹھا لیا۔ کیسی پیاری گڑیا سی تھی۔ لوٹ ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔ ممانی تھیں کہ خاطر پہ خاطر کیے جا رہی تھیں۔ "بہت دیر ہو گئی، لڑکی کو بلوائیے" چچی نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ "لو وہ آ رہی ہے" ممانی نے کہا۔ عین اسی وقت لڑکی داخل ہوئی۔ چچی کو یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا کوندا سا لپکا اور انہیں خاکستر کر گیا۔

ممانی حیران رہ گئیں کہ ہوا کیا۔ پہلے تو کسی خاتون کو دیکھ کر لڑکی یوں بدک کر نہ بھاگی تھی۔ اب انہیں کون بتاتا کہ جن خاتون پہ بجلی گری وہ کبھی اس لڑکی کی ساس رہی تھیں اور سابقہ بہو ساس کو دیکھ کر اور بدک کر بھاگی تھی۔ قصور کسی کا بھی نہیں تھا۔ چچی بڈی کی تلاش میں تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اتنے سالوں میں شرافت، لالوکھیت سے ڈیفنس میں منتقل ہو گئی ہے اور ممانی بے چاری کیا کرتیں وہ کراچی کے

رواجوں سے واقف نہ تھیں۔

صغریٰ بی بی بار بار یہ کہے جاتی تھیں کہ ابھی سے لڑکی کی شادی کی بات نہ بتانا جب معاملہ بیٹھنے لگے گا تب میں طریقے سے ساری بات لڑکے والوں کو سمجھا دوں گی۔